ماهنامہ
حکایت
لاہور
اگست 2015ء
کیا دس لاکھ شہیدوں کا
خون رائیگاں جائے گا؟
آزادی نمبر
1947
تا
2015
قیمت 90/- روپے

پاکستان 800 روپے

1 — 7000 روپے

سعودی عرب، کویت، اُردن، ایران، سری لنکا، ابوظہبی، بحرین، دوبئی، مسقط، قطر، شارجہ، بھارت، سوڈان، یوگنڈا، کینیا، نائیجیریا اور دیگر افریقی ممالک، مشرقی اور مغربی جرمنی، ڈنمارک، انگلینڈ، ناروے، سویڈن، فرانس، ملائشیا، سوئٹزرلنڈ، سنگاپور، ہانگ کانگ، آسٹریا، برونائی

2 — 7000 روپے

آسٹریلیا، کینیڈا، فجی، نیوزی لینڈ، بہاماز، وینزویلا، یونان، امریکہ، نورو، برازیل، چلی، کولمبیا، کیوبا، ارجنٹائن، جمیکا، میکسیکو، گرینڈا

- غیر ممالک سے رقوم بھجوانے کے لیے "وقاص شاہد" کے نام کا ڈرافٹ بھجوائیں۔
- پاکستان کے علاوہ دوسرے ممالک وی پی نہیں جاتی، رقم پہلے بھجوانا ضروری ہے۔
- کتابوں پر ڈاک خرچ خریدار حضرات کے ذمہ ہوگا۔
- خط و کتابت اور بدل اشتراک روانہ کرتے وقت خریداری حوالہ نمبر لکھنا ضروری ہے۔

نوٹ تبدیلی پتہ کی اطلاع مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیجیے۔

26- پٹیالہ گراؤنڈ، لنک میکلوڈ روڈ، لاہور- فون: 042-37356541

نورِ مُبین

(اے محمد) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہلِ استحقاق یعنی) ماں باپ کو اور قریب کے رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو (سب کو دو) اور جو بھلائی تم کرو گے خدا اُس کو جانتا ہے (۲۱۵)

سورۃ البقرہ

ماہنامہ حکایت لاہور

جلد 44 | اگست 2015 | شمارہ 12

بانی
عنایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ
شاہد بن عنایت اللہ

مدیر اعلیٰ صباحت شاہد
مدیر عارف محمود
منتظم سعد شاہد

فنانس منیجر
وقاص شاہد چوہدری

شعبہ قانون
میاں محمد ابراہیم طاہر

مجلس مشاورت
جہاں آرا بیگم، عظمت فاروق
میم الف، ڈاکٹر شبیر حسین
ڈاکٹر غلام علی، ڈاکٹر شمیم اے شیخ
ڈاکٹر رانا محمد اقبال

سرکولیشن منیجر
فضل رزاق
عرفان جاوید

شعبہ اشتہارات
خرم اقبال
محمد اشفاق مومن

کمپوزنگ
مجید زبیر
پرائم کمپیوٹرز — لاہور

عارف محمود	0323-4329344
وقاص شاہد	0321-4616461
فضل رزاق	0343-4300564
عرفان جاوید	0322-4847677

قیمت -/90 روپے

ہیڈ آفس 26- پٹیالہ گراؤنڈ لنگ میکلوڈ روڈ لاہور 042-37356541

مضامین اور خطوط ای میل کیجئے
monthlyhikayat44@gmail.com
primecomputer.biz@gmail.com

اس شمارے میں

اس شمارے میں

یومِ پاکستان — قائداعظمؒ کے افکار کی روشنی میں

24 نومبر 1945ء کو پشاور میں ایک کانفرنس سے خطاب فرماتے ہوئے حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ نے بانگ دہل کہا تھا:

''ہمارا کوئی دوست نہیں۔ نہ انگریز ہمارا دوست ہیں نہ ہندو۔ ہمارے ذہن صاف ہیں، ہمیں دونوں سے لڑنا ہے۔ یہ دونوں بنیا ہونے کے ناطے ہمارے خلاف اگر متحد ہو جائیں، ہم پھر بھی خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ ہم ان دونوں کی متحدہ طاقت سے مقابلہ کریں گے اور ان شاء اللہ آخر میں فتح ہماری ہوگی''۔

حضرت قائداعظمؒ کے عزمِ صمیم نے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں کر دی اور برصغیر کے مسلمان اپنے عظیم قائد کی انتھک جد و جہد، بے لوث قیادت اور لازوال قربانیوں کے بعد دونوں کی متحدہ طاقت کو شکست دے کر آزاد وطن پاکستان حاصل کرنے میں فتح یاب ہو گئے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ 1947ء میں ہمیں وہ پاکستان نہیں ملا جس کا خواب حضرت علامہ اقبالؒ نے دیکھا اور جس کے لئے حضرت قائداعظمؒ جد و جہد کرتے رہے تھے لیکن جو کچھ بھی ملا دشمنوں کی ریشہ دوانیوں، سازشوں اور فریب کاریوں کے باوجود ماہ رمضان المبارک کی ستائیسویں کی شب کو اللہ رب العزت کی رحمت خاص سے ملا۔ اس لئے ابتدا میں مسلمانانِ برصغیر اسے ''مملکت خداداد پاکستان'' کہتے پکارتے اور لکھتے تھے۔

پاکستان کا قیام اسلامی تاریخ کا ایک ایسا معجزہ تھا جس کی مثال عالمی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

آزادی کے چوتھے روز عید الفطر کے موقع پر اپنے ایک نشری پیغام میں حضرت قائداعظمؒ نے قوم کے نام ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے خوشی اور مسرت کا یہ دن ہماری قومی آزاد ریاست کی تخلیق کے فوراً بعد آیا ہے۔ اس لئے یہ دن ہمارے لئے خصوصی اہمیت اور خوشی کا باعث ہے۔ خدا ہمیں اتنی ہمت و قوت دے کہ ہم پاکستان کو دنیا کی اقوام کے درمیان واقعی ایک عظیم قوم بنا سکیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم نے پاکستان حاصل کر لیا ہے۔ تاہم یہ محض ایک مقصد کا آغاز ہے۔ اب ہم پر بہت

بھاری ذمہ داریاں پڑنے والی ہیں، انہیں پورا کرنے کے لئے ہمیں پختہ عزم واستقلال، حوصلے اور محنت سے کام لینا ہوگا"۔

ایک اور موقع پر حضرت قائداعظمؒ نے قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

"پاکستان غریبوں کی قربانیوں سے بنا ہے، یہ غریبوں کا ملک ہے اور اس پر غریبوں کو ہی حکومت کا حق ہے۔ پاکستان میں ہر شخص کا معیارِ زندگی اتنا بلند کیا جائے گا کہ غریب اور امیر میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ پاکستان اسلامی نظامِ اقتصاد کے سنہری اصولوں کے مطابق ہوگا جس نے غلاموں کو تخت وتاج کا مالک بنا دیا تھا۔ پاکستان میں غریب اور امیر دونوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں گے"۔

قیامِ پاکستان کے بعد کی 68 سالہ تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو کسی بھی دور میں اور کسی بھی مقام پر ہمیں یہ محسوس نہیں ہوگا کہ غریب عوام ہی پاکستان کے اصل حاکم ہیں اور ملک میں وہ مساوات قائم ہو چکی ہے جس کا خواب قائدؒ نے دیکھا اور قوم کو دکھایا تھا۔ قائدؒ کی آنکھ بند ہونے کے فوراً بعد ہی ملک پر جاگیرداروں اور استحصالی طبقوں نے قبضہ کرلیا اور آج تک قوم کی نحیف ونزار گردن پر سوار چلے آ رہے ہیں۔ اب تو شاید کوئی خونی انقلاب ہی ان سے نجات کا ذریعہ ثابت ہوگا۔

ایک موقع پر قائداعظمؒ نے فرمایا تھا۔

"وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد بن جاتے ہیں؟ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے؟ وہ کون سا لنگر ہے جس سے امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر اللہ کی کتاب قرآن حکیم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ ایک اللہ، ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ایک کتاب اور ایک امت"۔

یہ ایک انتہائی افسوسناک امر ہے کہ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد ہم اتحاد اور تنظیم کا راستہ چھوڑ کر فرقوں، ذاتوں، برادریوں اور مختلف طبقوں میں بٹ کر انتشار اور بدنظمی کی راہ پر چل پڑے اور سیاستدانوں، افسر شاہی، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور دیگر استحصالی طبقوں نے اکثریت کو اپنا غلام بنا لیا جس کا نتیجہ یہ ہے آج پورا ملک دہشت گردی، بدامنی، خلفشار اور افراتفری کا شکار ہے۔ لاقانونیت عروج پر ہے اور حکومت کی رٹ کہیں نظر نہیں آتی۔

آج پھر ہمیں قائداعظمؒ کے بتائے ہوئے سنہری اصولوں، اتحاد، تنظیم اور ایمان پر مضبوطی سے عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں راہِ مستقیم پر چلنے کی توفیق اور ہمت عطا فرمائے۔ (آمین!)

میاں محمد ابراہیم طاہر

خصوصی مضمون

ننگ دیں ننگ وطن!

☆ افضال مظہر انجم
afzalmazhar@gmail.com

69 سال ملک کی تباہی... قوم کی بربادی. ملک کے لٹنے کی کہانی کہاں سے شروع کی جائے، عوام کی بربادی کی داستان بیان کرنے کے لئے دفاتر کے دفاتر درکار ہیں۔ 69 سال تھوڑا یا بہت نہیں پون صدی کا عرصہ کسی قوم کو ذرے سے آفتاب بنا دیتا ہے۔ زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک لے جانے کے لئے کافی مدت ہے۔ ایسا ہوا بھی ہے جن قوموں نے عمل کر کے دکھایا ہے ان کے پیش نظر اپنا ملک، اپنی قوم اولین ترجیح تھی۔ حقیقی معنوں میں اوج ثریا تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ دنیا کی عظیم فوجی اور اقتصادی طاقت چین کی مثال دی جائے جس کو ہم سے ایک سال بعد آزادی نصیب ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم میں تباہ و برباد ہونے والے جاپان کی مثال دی جائے یا کوریا کی۔

میں چند روز پہلے ایک بزرگ اور محترم ہستی سعید بدر صاحب کے پاس بیٹھا تھا اور یہی گفتگو جاری تھی کہ 1947ء سے پہلے لیکن اسی کی دہائی [illegible] بہت پیدا ہوئیں [illegible] عظیم شخصیات ملک [illegible] پیدا [illegible] اس سلسلے میں [illegible] ہو چکی ہے؟ [illegible]

سے قریب رہنے اور گفتگو کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ فرما رہے تھے کہ قائداعظم جیسی شخصیات کا کردار دیکھ کر اور آج کے زمانے کے سیاستدان دیکھ کر یہی لگتا ہے کہ وہ لوگ اللہ کے ولی تھے۔ سعید بدر صاحب پاکستان کی سیاست کے صاف ستھرے کردار ائیر مارشل اصغر خان جیسے کمانڈر ان چیف آف پاکستان ایئر فورس کے قریب بھی رہے ہیں ان سے متعلق بھی اکثر گفتگو کرتے رہتے تھے کہ وہ شخصیت جس نے پاکستان کی ائیر فورس کو بھی مضبوط بنایا اور 46 سال یعنی 1969ء تا حال آپ کے سیاستدانوں میں ایک صاف ستھرے اور ایماندار سیاستدان ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ وہ فرما رہے تھے کہ آج کل کی نسل کو ملک بنانے والی اور مضبوط کرنے والی شخصیات کے پرخلوص اور بے لوث کردار کے بارے میں بتایا جاتا ہے تو وہ حیرت سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ لوگ اس ملک کے باشندے تھے اسی معاشرے سے ہی ان کا تعلق تھا۔ کیونکہ کرپشن اور لوٹ مار میں لتھڑے اس منافق بدکردار اور جھوٹے معاشرے میں آج اس طرح کی شخصیات ڈھونڈنے سے نہیں مل پاتیں۔

[illegible]

جوڑنے بے نیاز توڑنے سے زیادہ مضبوط
اٹلس
پاکستان میں سب سے پہلے بنانے والے
اٹلس وائیگل برانڈ
کچن سینک
واش بیسن
لیبارٹری باؤل
سٹینلیس سٹیل
مین ہول کور
ATLAS

رہتے آپس کا خون بہانے میں اور مسلمانوں کی طاقت کے ضیاع کے عمل میں مصروف کار ہیں۔

یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے

عمر 69 سال، آبادی 19 کروڑ نفوس، بے روزگاروں کی تعداد پڑھے لکھے 40 لاکھ، ان پڑھ 2 کروڑ، [illegible] کراچی تا پشاور ایک سڑک نہیں بن سکی۔ بھوکے ننگے 7 کروڑ 60 لاکھ (40 فیصد افراد غربت سے نچلی سطح پر زندگی گزارنے پر مجبور) طب و صحت: 15 کروڑ افراد علاج معالجہ سے معذور، تعلیم 5 کروڑ تعلیم سے بے بہرہ، تعمیر و ترقی 69 سال میں درجنوں حکومتیں صاف پانی کا مسئلہ حل نہیں کر سکیں۔ سیلاب ہر سال آ کر تباہی مچاتا ہے۔ مسائل حل ہونے ایک بھی نہیں بلکہ ان میں 5000 فیصد تک کا اضافہ ہوا۔ بجلی بند، پٹرول مہنگا، پینے کو گندا پانی، گیس غائب، اشیائے ضروریہ مہنگی، انصاف غریب کی پہنچ سے دور، قرضے ملکی و غیر ملکی 16630 ارب روپے کے قرضے۔

قومی خزانہ لوٹنے کے ریکارڈ قائم

انگریز نے دو سو سال اس خطہ پر حکومت کی لیکن وہ بھی یہاں سے کمائی گئی دولت کا کچھ فیصد حصہ برطانیہ بھجوایا کرتا تھا باقی کی رقم سے برصغیر ہندوستان میں عوام کے لئے تعمیر و ترقی کے پراجیکٹ مکمل کئے گئے۔ ریلوے لائنیں بچھائی گئیں، نہریں، پل، بیراج اور سڑکوں کی تعمیر کی جاتی رہی۔ میڈیکل کالج، انجینئرنگ ادارے اور سائنسی تعلیم کے ادارے قائم کئے گئے۔ یہ ایک فاتح قوم کا کردار ہے جس نے مفتوح ملک سے بھی سو فیصد حصہ خود کھانے یا استعمال کرنے کی بجائے یہاں کے عوام کی خوشی کے لئے استعمال کیا لیکن پاکستان تو ہمارا اپنا ملک تھا جسے ایک کروڑ دس لاکھ شہیدوں کی قربانی کے بعد

جمہوریت

بادشاہت میں قوم کا واسطہ صرف ایک احمق سے پڑتا ہے لیکن جمہوریت میں احمقوں کی پوری ٹیم سے پڑتا ہے۔ (ابن انشاء - ''[illegible]'')

انتخاب: جواد حیدر۔ تلہ گنگ

حاصل کیا گیا تھا۔ اس ملک کی آبیاری کرنا اسے فتنوں سے محفوظ رکھنا اور کسی قسم کے نقصان سے بچانا ہمارا قومی اور اخلاقی فرض تھا۔ یہ ہم لوگوں کا اپنا حصہ تھا جس میں کروڑوں کی تعداد میں افراد نے حصہ دار ہونا تھا۔ بے غیرتی اور بے حسی کی انتہا دیکھئے۔ [illegible] اپنے ہی وطن کو اس کے باسیوں نے لوٹ کھسوٹ کر دیا اور اس لوٹ مار میں بھوکے ننگے نہیں پہلے سے ہی کھاتے پیتے لوگ شامل تھے۔ بڑے بڑے جاگیردار ہوں یا سردار، سیاسی جماعتوں کے لیڈر ہوں یا دیگر کل پرزے، جرنیل ہوں یا سرکاری افسر، جج ہوں یا صنعت کار، مذہبی لیڈر ہوں یا کاروباری افراد سبھی نے اس ملک کو اس طرح سے جھنجھوڑا، تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا کہ بھیڑیے اپنے شکار کا بھی نہ کرتے ہوں گے اور عرصہ دراز خصوصاً چھیالیس سال سے یہ کام جاری و ساری ہے۔ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔

چمن اجاڑ کے رکھ دیا گیا

قائداعظم محمد علی جناح اور ان کی ٹیم نے دس لاکھ شہداء کے ہمراہ اس ملک کو بنانے کے لئے جو قربانیاں دی تھیں بعد میں آنے والے حکمرانوں کے زیر سایہ اس ملک کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے، اس کی جڑیں کمزور کرنے اس کی معیشت کو تباہ کرنے کے لئے وہ گھناؤنا فعل انجام دیا گیا جو اس ملک کا دشمن اسرائیل، بھارت تک انجام نہیں دے سکا ہوگا۔ جمہوری حکومتوں

اور فوجی ڈکٹیٹروں کے روپ میں ملک کے بدخواہ مسلط ہوئے، چونکہ ملک پر قابض ہو کر خزانہ خالی کرتے رہے اور خزانے کو بھرنے کے لئے آئی ایم ایف سے ہر سال اربوں ڈالر کے قرضے لینے پڑتے رہے، یہ قرضے ہڑپ کئے جاتے رہے اور یوں قرضوں کا بوجھ بڑھتا چلا گیا کہ ہم غیر ملکی طاقتوں کے شکنجے میں جکڑتے چلے گئے۔ جس کے ذمہ جو کام تھا وہ اسے بخوبی ادا کرنے کی بجائے اس کے برعکس عمل کی طرف چل نکلا۔ سیاست دانوں کے ذمہ ملک کی تعمیر و ترقی اور عوام کی خوشحالی کا فریضہ تھا وہ اسے انجام دینے کی بجائے ملک اور عوام کا بیڑہ غرق کرنے پر تل گئے۔ ججوں کے ذمہ انصاف کی فراہمی اور قانون کی بالادستی کا فریضہ تھا لیکن اثر و رسوخ والوں کو ملکی خزانے لوٹنے اور دیگر جرائم پر سزا دینے کی بجائے صرف نظر کرنے کی وجہ سے ناانصافی کا عمل فروغ پا گیا۔ تاجروں اور صنعت کاروں نے ملکی معیشت مضبوط بنانے کی بجائے اپنی تجوریاں بھرنے اور عوام کا خون نچوڑنے پر ساری توجہ مرکوز کی۔ مذہبی لیڈر قوم کی [illegible] کی بجائے اپنے [illegible] قوت نگلنے میں مگن ہو گئے اور اپنے اصل فرائض [illegible] کی وجہ سے معاشرہ مزید خرابیوں کا شکار ہوتا چلا گیا۔ جرنیلوں نے اپنے فرائض سے [illegible] نتیجہ تو [illegible] سامنے [illegible] ہے۔

گوروں کی غلامی بہتر یا کالوں کی؟

انگریز کی غلامی میں [illegible] رشوت ناپید تھی۔ [illegible]

ملک قائم ہوا تو یہ ساری برائیاں اور خرابیاں آہستہ آہستہ معاشرے میں سرایت کرتی چلی گئیں۔ جنرل ایوب خان گو فوجی ڈکٹیٹر تھا لیکن اس کے دور یعنی 60 کی دہائی تک پاکستان ایشین ٹائیگر بن چکا تھا۔ اس وقت جاپان اور چین معاشی طور پر اس سطح تک نہیں پہنچے تھے۔ بعد میں امریکہ سرکار نے آئی ایم ایف کے شکنجے میں جکڑ کر اور جمہوریت کے شوشے چھوڑ کر سیاست دانوں کے ذریعے اس ملک کو ایشین ٹائیگر سے ایشین بیگر (فقیر) بنا کے رکھ دیا۔ ہر جمہوری حکومت کے علاوہ فوجی حکومتوں کے کرتا دھرتا بھی ملکی خزانے کو لوٹ کر ملکی معیشت کو بدحال اور عوام کو بے حال کرنے میں مصروف عمل رہے ہیں اور ہیں۔

عوام ہی تختۂ مشق

ملک میں سیاسی پارٹیاں میدان عمل میں ہوں، مذہبی پارٹیاں عوام کو استعمال کرتی رہی ہوں یا حکومت وقت کوئی بھی پالیسیاں چلاتی رہی ہو ان سب کا تختۂ مشق ہمیشہ اس ملک کے کروڑوں عوام ہی بنتے رہے۔

سیاسی جماعتیں یا ان کے لیڈر اقتدار کی خاطر یا پریشر گروپ بنانے کے لئے یا صوبائی یا ملکی سطح پر اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ عوام کو ہی استعمال کرتی رہیں۔ صوبائی منافرت کی سیاست ہو یا قوم پرستی کی سیاست ہو یا ایک دوسرے کی ضد میں ہونے والی سیاست، مخالفین کو دبانے یا زیر کرنے کے لئے سیاسی جماعتیں مسلح ونگ سے کام لیتی رہیں اور آپس کی محاذ آرائی کی بھینٹ ہمیشہ عوام ہی چڑھتے رہے۔ [illegible] پاکستان [illegible] کراچی، سندھ، بلوچستان [illegible] نفرت انگیز سیاست [illegible] جا رہے ہیں۔

[illegible]

رہے۔ اپنے مذموم عزائم کی خاطر فرقہ پرستوں نے معصوم لوگوں کو ہی استعمال کیا۔

اسی طرح سے عوام کثیر حکومتوں کے دور میں ہر قسم کا بوجھ، ٹیکس، مہنگائی، خوراک کی کمی، ادویات کا ناپید ہونا سبھی عوام کو ہی برداشت کرنا پڑا۔ ٹیکس کلچر کو فروغ نہ دینے اور دولت مند سے ٹیکس نہ وصول کرنے کی وجہ سے آئے روز پٹرول، بجلی، گیس کے نرخ بڑھا کر ہر شے کے نرخوں میں اضافہ کا سارا بوجھ عوام کو ہی برداشت کرنا پڑا۔ سیلاب آئے، زلزلہ کی آفت ہو یا گرمی کی حدت عوام ہی لقمہ اجل بنتے رہے۔ غریب کی جھونپڑی ہی دریا برد ہوتی رہی۔

عوام دو وقت کی روٹی کو ترسنے لگے

اس ملک کو اس قدر اور ایسے ایسے گھناؤنے طریقے سے لوٹا گیا جس کو بیان کرتے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ لوٹنے والے اس بااثر طبقے نے جو عاقبت نا اندیشی میں تبدیل ہو چکا ہے، کھربوں روپے کے اثاثوں کا مالک ہے اور چند ہزار تنخواہ لینے والوں نے کروڑوں روپے کے اثاثے کس طرح سے بنائے۔ سیاست میں وارد ہونے والے نت نئے چہروں نے سیاست کو کاروبار بنا کر کس طرح سے اپنی جھولیاں بھریں اور ٹیکس چور کاروباری طبقہ نے ٹیکس چوری کر کے کس کس طریقے سے کروڑوں کے اثاثے بنا لئے۔ سیاست دانوں، جرنیلوں، سرکاری افسروں، ججوں اور کاروباری طبقہ نے نہ صرف اس ملک میں اربوں کے اثاثے بنا لئے اپنی اولادوں کو کروڑوں کے کاروبار شروع کرا دیئے اور جی بھر کے لوٹ مار کی گئی۔ دولت بیرون ملک ٹرانسفر کر دی اور ان کو کوئی پوچھنے والا نہیں۔

دوسری طرف ملک کے 80 فیصد عوام کا ناطقہ اس طرح سے بند کیا گیا کہ ان کے لئے دو وقت کی روٹی پوری کرنا مشکل ہو گیا۔ بچوں کی تعلیم، علاج معالجہ کے لئے ان کے پاس پھوٹی کوڑی نہ رہی۔ یہی سارے غنچے یا مافیاز نے اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کو راستے سے ہٹانے کے بعد ملک کی کثیر آبادی یعنی 80 فیصد عوام کو اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ ان کے مقابل آ کر انہیں غلط کام سے روک سکیں اور اپنے حقوق اور وسائل ان سے طلب کر سکیں۔ گویا 69 سال بعد ملک کی حالت ایسی بنا دی گئی کہ عوام اور صنعت کے لئے تو بجلی، گیس موجود نہیں ان کے چولہے جلانے کے وسائل موجود نہیں اور ان کے بچے خوراک کی کمی کی وجہ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئے اور ملک کو لوٹنے والا طبقہ توانا و تونگر ہوتا جا رہا ہے۔

''حکایت'' کے قارئین اندرون ملک کے علاوہ دنیا کے ہر ملک میں موجود ہیں خصوصاً وہ بزرگ جو ابتداء سے ہی اس کے قاری رہے ہیں جب ''حکایت'' ایک تحریک، ایک ولولہ، تعصبات سے پاک ملک و قوم کی ترقی کے لئے ایک فکری تحریک کے طور پر کام کر رہا ہے۔ دیار غیر میں ایسے ہی آباد لاکھوں پاکستانیوں میں پچاس سال سے برطانیہ (گلاسگو) میں آباد محمد صدیق صاحب کی شخصیت بھی ہے جو راقم سے اور ایڈیٹر ''حکایت'' عارف محمود صاحب سے وقتاً فوقتاً تبادلہ خیالات کرتے رہتے ہیں اور اپنے وطن کے متعلق فکرمند ہوتے ہیں۔ محمد صدیق صاحب اور انہی جیسے غیر ممالک میں آباد پاکستانیوں کے اطمینان کا باعث صرف یہی بات ہے کہ خطرات اور مشکلات اور شدید ترکاوٹیں پیش آنے کے باوجود یہ خطہ جو 10 لاکھ شہداء کے خون کی قربانی کے بعد 27 رمضان المبارک کو وجود میں آیا تا ابد دنیا کے نقشے پر چمکتا رہے گا اور اس کو نقصان پہنچانے والے، لوٹنے والے سیاہ چہروں کا نام تاریخ کے صفحات پر ننگ ملت، ننگ وطن کی حیثیت سے سیاہ حروف میں ہی لکھا جائے گا!

○✱○

خیال اپنا اپنا

پاکستان کی کوئی مستند، غیر جانبدارانہ اور جامع تاریخ لکھے تو ہمیں اپنی کارگزاری کا پتہ چلے اور ہم کوتاہیوں کا ازالہ کر کے تکمیل پاکستان کے لیے غور و فکر اور تگ و دو کریں۔

یومِ پاکستان کے تقاضے

(نوٹ: ادارے کا مضمون نگار کے نقطۂ نظر سے متفق ہونا ضروری نہیں)

☆ سید ریاض الحسن سکواڈرن لیڈر (ر)

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
(علامہ اقبال)

ہم پاکستان کی پلاٹینم جوبلی منانے کے قریب ہیں لیکن اس ملک کو حقیقی معنوں میں پاکستان بنانے سے روز بروز دور ہو رہے ہیں۔ ابھی تک ہم نظریہ پاکستان، تحریک پاکستان، تشکیل پاکستان، تعمیر پاکستان، تاریخ پاکستان اور تکمیل پاکستان سے متعلق واضح تصور اور غیر مبہم خیالات نہیں رکھتے۔ جہاں تک نظریہ پاکستان کا تعلق ہے ابھی تک کچھ لوگ یہ اعلانیہ کہتے ہیں کہ حصول پاکستان کے سلسلہ میں اسلام کا نام محض عوام کو گرمانے کے لئے استعمال کیا گیا ورنہ بانیان پاکستان اس مقصد کے لئے مخلص نہ تھے، ورنہ ملک کا وزیر قانون ایک ہندو اور وزیر خارجہ ایک مرزائی نہ بنایا جاتا جس کی وجہ سے ملک کو کافی عرصہ تک مسلم دنیا میں ناقابل اعتبار گردانا گیا۔ قرارداد مقاصد پاس کی گئی لیکن اس کے مطابق عرصہ دراز تک آئین نہ بنایا گیا۔ حالانکہ چوہدری محمد علی جیسے شخص موجود تھے اور وہ پاکستان کی خواہش کے مطابق آئین بنا سکتے تھے لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شد

بعد میں ملک کے لئے چار آئین بنائے گئے لیکن قرارداد مقاصد کو آئین کا باقاعدہ حصہ نہیں بنایا گیا محض دیباچے کے طور پر شامل کیا گیا۔ یہ سعادت ایک فوجی حکمران کو نصیب ہوئی کہ انہوں نے قرارداد مقاصد کو آئین کا حصہ بنا دیا۔ اس پر کئی دانشور ابھی تک شاکی ہیں کہ یہ قرارداد ان کے سروں پر تلوار کی طرح لٹک رہی ہے اور کسی وقت ان کی آزادی افکار کا قلع قمع کر سکتی ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر قرارداد کو بعض نام نہاد ترقی پسند اور روشن خیال ختم کرنے کے تمنائی رہے ہیں لیکن جو لوگ مرنجاں مرنج ذہن کے مالک ہیں وہ خاموشی میں ہی عافیت سمجھتے ہیں کیونکہ مغربی جمہوری نظام میں اسلامی نظام حکومت کے نفاذ کا کوئی امکان نہیں۔

بدلے یہ معاملہ چند دن میں بطریق احسن طے ہوسکتا تھا۔ ملک کی یہ دگرگوں حالت اس لئے ہوئی کہ سازشی ٹولے کو صرف اپنے مفادات عزیز تھے۔ یہ لوگ ابھی تک ان مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ اقتدار کے مزے بھی لوٹ رہے ہیں اور بے انتہا دولت بھی سمیٹ رہے ہیں اس فرنگی نظام جمہوریت میں ایسے لٹیروں اور وڈیروں سے نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

تحریک پاکستان کے دوران سیاسی لیڈروں نے طلبہ کو احتجاجی تحریکوں کا ہراول دستہ قرار دیا اور ان کو برملا کہا گیا کہ تعلیم کو چھوڑ دو اور تحریک میں سرگرم حصہ لو۔ طلبہ کے نظم و نسق کو اس حد تک تباہ کیا گیا کہ ابھی تک اس مادر پدر آزادی کا ازالہ نہیں کیا جاسکا۔ اس لاقانونیت کی ابتدا علی گڑھ سے ہوئی اور پورے ملک کے پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں پھیل گئی۔ اسی کی متابعت میں اب ہر سیاسی جماعت نے طلبہ ونگ رکھے ہوئے ہیں اور ہر سیاسی تحریک میں غریب والدین کے نوجوان طلبہ کو قربانی کا بکرا بناتے ہیں کیونکہ امراء اور حکمرانوں کے بچے تو ملک کے اعلیٰ اداروں یا غیر ممالک میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں سیاست اور مار دھاڑ کا عمل دخل نہیں ہوتا۔ ان نام نہاد جمہوری لیڈروں سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ جب برطانوی پارلیمنٹ نے برصغیر کی آزادی اور تقسیم کا بل پاس کر لیا تھا تو پھر بڑے شہروں میں طالبات کے جلوس نکالنے اور سول سیکرٹریٹ پر آزادی کے دن سے قبل مسلم لیگ کا جھنڈا لہرانے اور پولیس سے ٹکرانے کی کیا ضرورت تھی اور اس طرح نوجوان طالبات کو ذلیل کرنے اور کئی کو معذور کرنے سے کیا حاصل ہوا۔ یہ سیاسی لیڈروں کی انتہائی مکروہ اور مکارانہ چال تھی کہ لوگوں کی توجہ ان کی نااہلی اور لوٹ مار کی طرف مبذول نہ ہو۔ تحریک پاکستان کو لہو رنگ بنانے میں نالائق لیڈروں کی چالبازی اور خودغرضی کا بہت زیادہ دخل تھا۔

تشکیل پاکستان کے سلسلہ میں جس لاپرواہی اور بے حسی کا مظاہرہ کیا گیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جب ایک دفعہ یہ اصول طے پا گیا تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کا حصہ ہوں گے تو پھر پنجاب اور بنگال کو کیوں تقسیم کیا گیا؟ صوبہ سرحد اور سلہٹ میں ریفرنڈم کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ آزادی سے پہلے پورے پنجاب، پورے بنگال، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی مگر مسلمانوں کے زیر تسلط علاقوں کو بھی متنازعہ بنا دیا گیا اس طرح قتل و غارت اور لوٹ مار کے دروازے کھول دیے اور بے شمار لوگوں نے قربانیاں دیں اور لیڈروں نے خوب ہاتھ رنگے۔

سرحدوں کے تعین کے لئے مسلم لیگ نے ایک قادیانی کو نامزد کیا جس کی ہمدردیاں اپنے مرکز قادیاں کے ساتھ تھیں جسے بھارت کا حصہ بنانا اس کے لئے زیادہ مفید تھا۔ اس طرح بھارت کو کشمیر تک راستہ مل گیا اور وہ اس کے زیادہ حصہ پر قابض ہو گیا۔ کشمیر کا مسئلہ ایسا حساس تنازعہ بن گیا جس کے لئے کئی جنگیں ہو چکی ہیں اور مذاکرات تسلسل سے جاری ہیں لیکن یہ مسئلہ مستقبل قریب میں حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ یہ سب شاخسانہ قادیانی، ہندو اور انگریز کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ اگر سردار عبدالرب نشتر اور چوہدری محمد علی جیسے مخلص اور قابل راہنماؤں کی خدمات حاصل کی جاتیں تو پاک و ہند کے مسائل بہتر انداز میں ہو جاتے۔

ایسی کون سی مجبوری تھی کہ ایسا پاکستان تشکیل کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا گیا جس کا دھڑ خلیج بنگال میں تھا۔ ایک ٹانگ کراچی سے طورخم تک دراز تھی گھٹنا بلوچستان کی طرف اور دوسری ٹانگ تھی ہی نہیں۔ ان سارے معاملات میں قائداعظمؒ بے بس تھے کیونکہ وہ ایسی بیماری میں مبتلا تھے کہ اُن کے لئے ایسے الجھے ہوئے مسائل حل کرنا مشکل تھا۔ وہ زیادہ تر دہلی، بمبئی اور کراچی تک محدود رہے۔ وہ پنجاب اور بنگال کے جذباتی مسائل سے لاتعلق رہے۔ وہ برصغیر کی زبانوں سے واقف نہیں تھے لہٰذا عوامی مسائل کو حل کرنا ان کے لئے مشکل تھا۔ وہ تو دہلی میں بیٹھ کر قانونی معاملات طے کرتے رہے۔ جاگیرداروں اور نوکر شاہی نے اپنی سہولتوں کو مقدم جانا اسی وجہ سے یہ لوگ آج تک حکومت اور عیش کر رہے ہیں۔

اگر مسلم لیگ برصغیر کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہر دلعزیز راہنماؤں کو اپنے ساتھ رکھتی تو پاکستان اس حالت میں تشکیل نہ پاتا بلکہ پورا پنجاب اور بنگال اس کا حصہ ہوتا۔ شیر شاہ سوری والی جرنیلی شاہراہ جو پشاور سے کلکتہ تک دراز تھی اس کے اردگرد کا علاقہ پاکستان میں شامل ہوتا اس کی حدود دہلی تک پھیلی ہوتیں تو مختلف قسم کے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے اور اس وقت برصغیر میں پھیلے ہوئے ستر کروڑ مسلمان ایک عظیم الشان پاکستان کا حصہ ہوتے اور چند ہی سالوں میں یہ ایک ترقی یافتہ ملک ہوتا۔

عام طور پر یہ مشہور کیا گیا ہے کہ انگریزوں کے دور میں مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پسماندہ تھے لیکن یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ اس دور میں علامہ مشرقیؒ جیسے نابغۂ روزگار شخص تھے جنہوں نے جدید و قدیم علوم میں ورلڈ ریکارڈ قائم کئے۔ علامہ اقبالؒ بھی جدید و قدیم علوم کے ماہر تھے۔ علاوہ ازیں مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا شوکت علیؒ، نواب بہادر یار جنگ، مولانا ظفر علی خاں جیسے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بلند پایہ مقرر موجود تھے جن کے مقابلہ میں غیر مسلم بہت کم درجہ کے حامل تھے۔ مولانا آزاد امام الہند کے لقب سے مشہور تھے۔ مولانا مدنی استاد العلماء کہلاتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری امیر شریعت کہلاتے تھے۔ علامہ سید انور شاہ کاشمیری جید قسم کے عالم تھے۔ اس طرح کے بے شمار علماء جو دیوبند، بریلی، ندوہ اور کئی دوسرے اداروں کے فارغ التحصیل اہل علم، ادیب اور فاضل تھے جو پورے برصغیر میں بہت مشہور اور ہر دلعزیز تھے۔ ان میں سے اکثر مسلم لیگ سے بھرپور تعاون کر رہے تھے لیکن

مسلم لیگ پر قابض جاگیردار، سرمایہ دار اور نوکر شاہی کے اراکین کے لئے یہ ناقابل برداشت تھے کیونکہ ان کی وجہ سے اس قبضہ گروپ کا مستقبل تاریک ہو جاتا جن کے پیروکار آج بھی مسلم لیگ اور پاکستان کے مالک بنے ہوئے ہیں اور اسلام کا نام لے کر ملک میں لوٹ مچا رہے ہیں۔ ان خودغرض اور اقتدار کے بھوکے افراد نے جمعیت علماء کے راہنماؤں پر طرح طرح کے الزامات لگا کر ان کو مسلم لیگ سے بدظن کر دیا اور کانگرس نے ان سے تعاون کر کے ان کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ انگریز، ہندو اور مسلمان سرمایہ داروں کا یہی مشن تھا کہ مسلمان تقسیم ہو جائیں اور ان کی سیاسی غلامی سے نکل کر ذہنی غلامی کے اسیر رہیں۔ ان کی چال کامیاب رہی اور مسلمان گوروں کی غلامی سے نکل کر کالے انگریزوں کے غلام بن گئے جس سے نجات کافی مشکل معلوم ہوتی ہے۔ جمعیت پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس کے راہنماؤں نے مسلم لیگ سے پبلسٹی کے لئے پچاس ہزار روپیہ طلب کیا تھا جو مسلم لیگ اپنی کسمپرسی اور غریب جاگیرداروں کی وجہ سے ادا نہ کر سکی اور علماء کانگرس کی طرف چلے گئے حالانکہ اتنی رقم تو قائداعظمؒ اپنی جیب سے ادا کر سکتے تھے اور علماء تو لاکھوں روپے چند دنوں میں عوام سے اکٹھے کر سکتے تھے انہیں کیا ضرورت تھی کہ مسکین جاگیرداروں کو پریشان کرتے۔

بہرحال اس قسم کے حالات تھے جن میں پاکستان معرض وجود میں آیا اور اپنے ساتھ بے شمار مسائل بھی لایا۔ سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کا تھا جن کے لئے کسی نے کوئی منصوبہ بندی نہ کی۔ قتل وغارت اور لوٹ مار کو روکنے کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا جس کی بناء پر بے شمار لوگ عرصہ دراز تک بے سروسامانی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوئے اور شاطر سیاستدانوں نے ان کا خوب استحصال کیا اور لوٹ مار کے ریکارڈ قائم کئے۔

تعمیر وترقی پاکستان کے سلسلہ میں ذمہ داروں نے انتہائی غفلت اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔ پہلے تو یہ اعلان کیا گیا کہ پاکستان ایک سیکولر ملک ہوگا جس میں مسلم اور غیر مسلم سیاسی طور پر برابر ہوں گے۔ حالانکہ ایک اسلامی مملکت میں صرف مسلمان ہی اہم اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو سکتے ہیں۔ یہاں ابتداء ہی سے ایک ہندو کو وزیر قانون اور ایک قادیانی کو وزیر خارجہ بنا کر اسلامی نظام حکومت کے دعوؤں پر پانی پھیر دیا گیا۔ قائداعظمؒ کو سربراہ مملکت اور صدر پارلیمنٹ بنا کر جدید جمہوری نظام کا بھی مذاق اڑایا گیا۔ قائد رحمتہ اللہ موذی مرض میں مبتلا تھے۔ ان کے آرام اور علاج کا مناسب بندوبست کرنے کی بجائے ان پر دوہری ذمہ داری ڈال دی گئی۔ وہ آرام وسکون کی خاطر زیارت تشریف لے گئے تو ان کے بیڈ پر بیسیوں فائلز کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ حالانکہ فائلوں کا کام وزیراعظم کو کرنا چاہئے تھا۔

محترم قائد کی وفات کے بعد وزیراعظم جناب قائد ملت نے تمام اختیارات خود سنبھال لئے حتیٰ کہ مسلم لیگ کی صدارت پر بھی فائز ہو گئے۔ حالانکہ قائداعظمؒ نے ایسے اقدام کو سخت ناپسند کیا تھا لیکن قائد ملت نے قائداعظمؒ کے اصولوں کو نظرانداز کرتے ہوئے نہ صرف کلی اختیارات سنبھال لئے بلکہ ان کے ساتھیوں کو اقتدار سے علیحدہ کرنے کے لئے سازشیں بھی شروع کر دیں۔ ملک کے مسائل کو حل کرنے اور اسے تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن کرنے کی بجائے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کی خاطر دھونس، دھاندلی اور جھرلو جیسے حربے استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ جلد ہی خود بھی سازش کا شکار ہوئے اور شہید ملت قرار پائے۔ ان کے بعد تو ملکی تعمیر وترقی خواب وخیال ہو گئی۔ ملک کو تو وہ خود ہی امریکہ کے پاس گروی رکھ گئے تھے۔ ان کے جانشینوں نے تو ملک وملت کو بالکل ہی امریکہ کا غلام بنا دیا۔ اب پاکستان میں حکومتیں بنانا گرانا امریکہ نے نوکر شاہی کے ذریعے اپنے ذمہ لے لیا۔ سیاستدانوں نے بڑی حکومت کی فرمانبرداری

اورایک دوسرے کی کردارکشی کی ذمہ داری سنبھال لی۔ ملک میں جلسے جلوس اور گھیراؤ جلاؤ کا دورہ دورہ شروع ہوگیا۔ گیارہ سال میں سات وزرائے اعظم مسلط کیے گئے کئی سیاستدان ہیرو سے زیرو اور کئی زیرو سے ہیرو ہوگئے لیکن ایک امریکی گماشتہ وزارت خارجہ پہ قائم رہا۔ پاکستان اندرون اور بیرون ملک بہت بدنام ہوا لیکن اس امریکی ایجنٹ نے امریکہ کا پلہ اور ملک کی جان نہیں چھوڑی تا آنکہ قدرت کو اس مملکت پر رحم آ گیا ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ سیاستدانوں کو مختلف بدعنوانیوں کی بناء پر نااہل اقرار دیا گیا۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں پہلے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعدازاں صدر مملکت کے عہدے پر براجمان ہوگئے۔ ملک میں امن وامان قائم ہوا۔ ہر شعبے میں بہت زیادہ ترقی ہوئی۔ مہنگائی اور بے روزگاری پر قابو پالیا گیا۔ ملازمین کی تنخواہوں میں معتدبہ اضافہ کیا گیا۔ چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کا قلع قمع کیا گیا۔ قادیانی وزیر خارجہ سے نجات ملی لیکن امریکہ کا اثرورسوخ کم نہ ہوسکا۔ محمد علی بوگرا نے بطور وزیر خارجہ چین سے تعلقات استوار کیے، مشرق وسطٰی کے ممالک سے روابط بہتر ہوئے جو سابقہ وزیر خارجہ کی وجہ سے انتہائی مخدوش ہو گئے تھے لیکن امریکہ کو پاکستان کی ترقی اور خارجہ تعلقات میں انقلابی تبدیلی پسند نہ آئی۔

صدر مملکت نے ''فرینڈز ناٹ ماسٹرز'' نامی کتاب لکھ کر امریکہ کو برافروختہ کر دیا۔ پاکستان کے نااہل اور کرپٹ سیاستدان بھی سات سال بعد بحال ہو چکے تھے۔ امریکی ایجنسیوں اور پاکستانی سیاستدانوں نے مل کر ملک میں وہ اُدھم مچایا کہ ایک عشرہ پر محیط ترقی غتر بود ہوگئی۔ ملک میں وہ افراتفری پیدا کی گئی کہ صدر مملکت نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور ایک عیاش قسم کے جرنیل آغا محمد یحیٰی خاں کو اقتدار سونپ کر خود گوشہ نشین ہوگیا۔ نئے جرنیل حاکم نے سب سیاستدانوں کو کھلی چھٹی دے دی۔ ملک میں پہلے جنرل انتخابات کرائے گئے جو بہت ہی خونی اور تباہ کن ثابت ہوئے۔ کامیاب سیاستدانوں نے امریکہ کی ایماء پر باہمی تعاون کی بجائے محاذ آرائی شروع کر دی۔ ملک میں خانہ جنگی شروع ہوگئی اور انڈیا نے مداخلت کر کے مشرقی پاکستان کو علیحدہ کر دیا جس نے بنگلہ دیش کی صورت اختیار کی۔ افواج پاکستان کو ذلت آمیز شکست ہوئی اور ایک لاکھ کے قریب پاکستانی جنگی قیدی بنا دیے گئے۔ قائد عوام جیسی پُراسرار شخصیت مغربی پاکستان کو نیا پاکستان قرار دے کر اس کے شہنشاہ بن بیٹھے۔ اس دن سے لے کر آج تک پاکستان کو امن، خوشحالی اور ترقی نصیب نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس تقریباً نصف صدی کے دوران نو جنرل الیکشن ہو چکے ہیں اور مارشل لاء بھی لگ چکا ہے۔ ملکی حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں، بہتری کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان ہر میدان میں دنیا سے پیچھے رہ گئی ہے۔ ملک میں امن وسکون ہو تو مستند ماہرین پیدا ہوں جو حکمرانوں کی چاپلوسی کی بجائے کوئی کارنامہ سرانجام دیں۔ ملکی تاریخ کا بے لاگ جائزہ لیں، حکمرانوں اور عوام کے کرتوتوں کا غیر جانبداری سے جائزہ لیں اور ملک وملت کی بے لوث خدمت کے لیے کوئی لائحہ عمل اور راہنما اصول طے کریں لیکن ہر طرف خود غرضی، لالچ اور لاپرواہی کا کہ کوئی مرد میدان نظر نہیں آتا جس کی پیٹھ پہ ہاتھ رکھو وہی ڈنک مارتا ہے

اس گلستان کی بربادی کو ایک ہی الو کافی تھا
ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا؟

پاکستان کی کوئی مستند، غیر جانبدارانہ اور جامع تاریخ لکھے تو ہمیں اپنی کارگزاری کا پتہ چلے اور ہم کوتاہیوں کا ازالہ کر کے تکمیل پاکستان کے لیے غور وفکر اور تگ ودو کریں۔ اب تو حالت یہ ہے کہ

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

پاکستان کہانی

محترم ابدال بیلا کی کتاب "پاکستان کہانی" ہماری تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جو ہمیں ایک ورثے کے طور پر اپنی اگلی نسلوں تک پہنچانا ہے تاکہ انہیں معلوم ہو کہ قوم سے کفار نے پاکستان کی کیا اور کیسی قیمت وصول کی تھی۔ یہ افسانہ نہیں بلکہ حقیقت کی ایک جھلک ہے۔

چوک پراگ داس

تُو نے اپنی مادر زاد برہنہ بہنوں کی چیخیں نہیں سنیں..... امرتسر یہاں سے اتنی دُور تو نہیں!

☆ ڈاکٹر ابدال بیلا

بھاگنے دوڑنے اور چلانے کی عجیب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ شور سن کے میں بھی ہوسٹل کے اپنے کمرے سے نکل آیا۔ ہوسٹل شہر سے باہر تھا۔ آگے پکی سڑک تھی، پیچھے تین طرف کھیت تھے۔ کھیتوں کی طرف ہوسٹل کے پچھواڑے میں ملحقہ دیوار کے ساتھ مالی کا کچا گھر تھا۔ دھواں اسی گھر سے اٹھ رہا تھا اور لوگ بھی اُدھر جا رہے تھے، میں بھی چلا گیا۔ ایک پگڈنڈی سے کھیتوں کے بیچ سے اُدھر جاتی تھی، اسی پر سب چلے جا

رہے تھے۔

مالی کے گھر کی بیرونی دیوار کے اوپر ٹھوڑیاں رکھے لوگوں کا ہجوم اندر تکے جا رہا تھا، کچھ لوگ دروازے میں کھڑے تھے، میں راستہ بناتا ہوا اندر چلا گیا، مالی کی رہائش کے دو کمروں سے ہٹ کے کھلے کچے صحن میں پرالی کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اسی ڈھیر میں آگ بھڑک رہی تھی، اکا دکا آدمی بے دلی سے لمبی لمبی سوٹیاں لئے پرالی کے اچھلتے شعلوں پر مار رہے تھے۔ شعلے اور سر اٹھا رہے تھے۔

ایک آدمی چار قدم ہٹ کے ہینڈ پمپ کے نیچے بالٹی رکھے نلکا گیڑ رہا تھا۔ بالٹی بھر جاتی تو وہ قدم قدم چلتا، آگ سے دو قدم دور کھڑا ہو کے پانی اچھال دیتا۔ کچھ پانی آگ پر گرتا، باقی راہ میں گارا کر دیتا۔

اتنے میں آگ سے پرے، گھر کے دروازے کے پاس ہلچل سی مچی، ایک شور اٹھا، بڑے صاحب آ گئے، بڑے صاحب...... دروازے اور راہ میں بغلوں میں ہاتھ دیئے کھڑے لوگ راہ دینے اور بڑے صاحب کو دیکھنے اور سلام کرنے کے لئے راستے سے ہٹ کے کھڑے ہو گئے اور ایک دم سے پرنسپل صاحب اندر آ گئے۔

لوگ انہیں ہاتھ اٹھا اٹھا کے سلام کرنے لگے۔

وہ ایک دم سے بولے۔ مالی کدھر ہے؟

سب نے مالی کے گھر کے کمروں کی طرف دیکھا، ادھر دونوں کمروں پر تالہ پڑا تھا۔

''کوئی نقصان تو نہیں ہوا؟'' پرنسپل صاحب نے پوچھا۔

''نہ جی، اللہ نے بچا لیا''۔ کوئی ایک بولا۔

کئی اوروں نے ہاں جی، ہاں جی کہا۔

پرنسپل صاحب چلتے چلتے آگ کے قریب گئے اور غور سے پرالی کے ایک طرف آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے مٹی سے لپے ایک کچے ڈربے کی طرف اشارہ کر کے بولے، یہ کیا ہے؟

ایک لمحے کے لئے سب خاموشی سے ادھر تکنے لگے، خاموشی میں آگ کے شعلوں کی آواز کے علاوہ پھڑ پھڑ پھڑانے کی ایک عجیب آواز آئی۔

اس میں مرغیاں تو نہیں؟ پرنسپل صاحب چیخ کے بولے۔

ہاں جی، ہاں!

اوہو کہتے ہوئے پرنسپل صاحب خود ہی آگ پر لپک پڑے، کھولو، کھولو، ڈربے کا دروازہ کھولو، ہٹاؤ سامنے سے آگ، اوپر سے بھی...... جلدی کرو!

ڈربے کے آگے لوہے کی سلاخیں اور جالی تھی۔ ٹین کے چھوٹے سے بنے دروازے پر تالہ لگا تھا۔ یہ توڑ دو، جالی توڑو!

دروازہ بھی،

سب توڑ دو،

نکالو مرغیوں کو۔

توبہ توبہ!

کچھ لوگوں نے بھاگ کے سامنے سے آگ سے بھری پرالی ہٹائی تو جالی کے اندر پھڑ پھڑاتی، دیواروں کو ٹکریں مارتی، اچھلتی تڑپتی مرغیاں نظر آ گئیں۔

استغفار...... توبہ توبہ!

یہ تو چوک پر آگ داس بنا دیا تم نے......

نکالو مرغیوں کو!

پرنسپل صاحب نے چلاتے ہوئے خود ایک طرف پڑی کدال لے کر لپک پڑے اور بے شمار ہاتھ بھی ادھر لپکے۔ پلک جھپکنے میں ڈربے کی جالی ٹوٹ گئی اور جھلسی ہوئی جلی جلی سی، کپکپاتی پر پھیلائے، چونچیں کھولے ہوئے مرغیاں باہر آ گئیں۔ پرنسپل صاحب تڑپ کے جھکے، بازو پھیلائے اور ایک دو مرغیاں اٹھا کے گود میں لے لیں۔ انہیں سینے سے بھینچ لیا جیسے وہ مرغیاں نہیں

انسان کے بچے ہوں، ان کے اپنے بچے ہوں۔

پانی لاؤ،

انہیں آگ سے دور لے جاؤ۔

خود بھی وہ گود میں پکڑی مرغیوں کو اٹھائے اٹھائے بھاگتے آگ سے دور چلے گئے۔

مرغیوں پر پانی ڈالا!

پلایا۔

یہ ہوا کیسے؟

یہ تو چوک پر آگ داس ہو گیا۔

پتہ نہیں کسی اور نے پرنسپل صاحب کی بات نوٹ کی یا نہیں،

مجھے بڑا اچنبھا ہوا،

یہ چوک پر آگ داس کیا ہوا؟

یہ کون سا چوک ہے؟

کدھر کا ہے!

میں نے ایک دن پرنسپل صاحب سے پوچھ لیا۔

عام کالجوں میں پرنسپل سے ملنا دشوار ہوتا ہوگا، ہمارے کالج میں یہ مشکل نہیں تھا۔ ہمارے کالج کی ایک ہی تو کلاس تھی...... ہماری کلاس!

کالج بنے چند مہینے ہوئے تھے۔

ہماری پہلی کلاس تھی۔

میڈیکل کالج کی پوائنیئر کلاس!

کالج کی اپنی بلڈنگ تو کئی سال بعد ایک نئی جگہ بڑی شان سے بنی تھی۔ اس وقت وہ عارضی لی ہوئی کھیتوں میں بنی ایک عمارت تھی، بلڈنگ کے کچھ کمرے کالج انتظامیہ کے دفتر تھے، ایک بڑا سا شیڈ نما کمرہ، ہمارا ڈائی سیکشن ہال تھا۔ باقی بلڈنگ کے برآمدے اور کمرے ہمارا ہوسٹل تھا۔

ہوسٹل میں شور اٹھتا تو پرنسپل صاحب دفتر سے اٹھ کے سوٹی گھماتے ادھر آ جاتے۔ دفتر میں وہ سٹاف کو ڈانٹتے تو ہوسٹل سے لڑکے نکل کے ان کے دفتر کی درزوں سے جھانکنے لگتے۔ مجھے تو ان کے دفتر میں تاک جھانک کی باقاعدہ اجازت ملی ہوئی تھی۔

وہ یوں ہوا کہ ایک دن وہ حسب عادت قمیص اتارے، ایک بنیان اور سفید آل پہنے ہوئے، پسینے میں شرابور کلاس میں اور ہیڈ ویو پر پروجیکٹر چلا کے بیٹھے ہمیں دماغ کی پیچیدہ اناٹمی پڑھا رہے تھے۔ اناٹمی تو انسان کی ہر جگہ سے پیچیدہ ہے۔ اس دن دماغ کی باری تھی۔ پتہ نہیں کتنے گھنٹے بیت گئے۔

ان کے لیکچر کے صرف شروع ہونے کا وقت ہوتا تھا ختم ہونے کا نہیں۔

گرمیوں کا موسم تھا۔

کلاس میں چند گنتی کے پنکھے تھے اور سٹوڈنٹ پورے۔

سب پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ پرنسپل صاحب کو پڑھانے کا جنون تھا۔ پڑھا ہوا انہوں نے اتنا تھا کہ شروع وہ بات ٹخنوں سے کرتے اور بات ہوتی ہوتی دماغ تک پہنچ جاتی۔

برین اناٹمی ان کے لئے فیورٹ فیری ٹیل تھی۔

چار چار، پانچ پانچ گھنٹے مسلسل ان کا لیکچر جاری رہتا۔ ان کی گفتگو کے اندر زمانے بھر کی باتیں آ جاتیں، ایٹم سے لے کر اٹامک انرجی تک کی باتیں۔ بات بات میں ان کی ویژن اور وزڈم بھری ہوتی۔ اس دن بھی ساڑھے تین گھنٹے گزر چکے تھے اور ابھی پروجیکٹر پر دکھانے والی ان کی اپنے ہاتھ سے بنی ٹرانسپیرنسیوں سے ایک فائل فولڈر بھرا پڑا تھا۔

پڑھاتے پڑھاتے بولے، میں نے پینتالیس سال اناٹمی پڑھتے پڑھاتے، خود ڈائی سیکشن کر کر کے انسانی جسم کی ایسی ایسی انوکھی پرتیں ڈھونڈی ہیں جو کسی کتاب میں نہیں۔ ان کی اپنے ہاتھ سے ڈائیا گرامز بنائی ہیں۔

اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، بہتر سال سے اوپر ہوں۔ یہ اثاثہ میں کسی کتاب میں منتقل کرنا چاہتا ہوں کہ جب میں نہ رہوں میرا سیکھا علم پھر بھی سکھاتا رہے۔ راہ دکھاتا رہے۔

تم میں سے کوئی اچھا آرٹسٹ ہے جو اچھی تصویریں بنا لیتا ہو؟

پوری کلاس نے ایک دم سے نعرہ لگا دیا۔ بیلا، بیلا!

پرنسپل صاحب نے سر اٹھا کے کلاس کی طرف دیکھا۔

اور بولے

اِف بیلا اِز ویلا

ہی شُڈ کَم ٹو می اکیلا

کلاس قہقہے لگانے لگی۔

وہ یوں ہی ہنسا ہنسا کے پانچ پانچ گھنٹے بٹھائے رکھتے تھے۔

اگلے دن میں ان کے دفتر پہنچ گیا۔

انہوں نے اپنے تین چار بڑے فائل فولڈر مجھے تھمائے اور جیب سے نکال کے پچیس روپے میری ہتھیلی پر رکھے۔ بولے، بازار سے اپنی پسند کی پنسلیں اور مارکر لے آؤ۔ کاغذ تمہیں ہیڈ کلرک دے دے گا۔ بس کام شروع کر دو۔

کام شروع ہو گیا۔

میں تصویریں، ڈایا گرام بنا بنا کے ان کے دفتر آتا جاتا رہتا۔ اکثر وہ سٹاف کے ساتھ باتوں میں الجھے ہوتے۔ میں چپکے سے آ کر ایک کونے میں دبک کے کھڑا ہو جاتا۔ وہ مجھے دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کا حکم دے دیتے۔ میں سمٹ کے بیٹھ جاتا، ان کی سٹاف سے کالج امور پر باتیں جاری رہتیں۔

دفتر میں اکیلے ہوتے تو بھی اسی قسم کی صورت حال ہوتی۔ فرق صرف اتنا کہ بجائے سٹاف کے لوگوں سے باتیں کرنے کے وہ میز پر جھکے ہوئے کھلے کاغذوں کے پلندوں پر کچھ لکھتے رہتے، کچھ لکھا کاٹتے، درست کرتے رہتے، کبھی لکیریں مار مار کے نئے کالج کیمپس کا ڈیزائن بنانے میں محو ہوتے، کبھی بن کے آئے کسی ڈیزائن کی مین میخ نکالنے میں مصروف ہوتے۔ میں چپکے سے دروازہ کھول کے اندر آ جاتا۔ ان کی مصروفیت دیکھ کے صرف ہاتھ اٹھا کے سلام کرتا، منہ سے کچھ نہ بولتا، پانچ دس منٹ بعد انہیں میری آمد کا احساس ہوتا تو پھر اسی طرح ہاتھ کے اشارے سے مجھے بیٹھنے کا حکم دے دیتے مگر میز سے نظریں نہ اٹھاتے۔ بیٹھے اسی طرح اندھا دھند کام کرتے رہتے۔

دفتر میں تو وہ اوور آل بھی اتار دیتے تھے۔ بس ایک بنیان...... کبھی کبھی جون جولائی کی تپتی دوپہروں میں بنیان بھی اتر جاتی۔

ان کے سر، ماتھے، کمر اور سینے سے پسینہ ٹپکتا رہتا۔ بس ایک سفید تولیہ ان کے میز اور کرسی کے بیچ کہیں پڑا ہوتا تھا۔ لکھتے پڑھتے وہ وہی تولیہ اٹھا اٹھا کے اپنی گردن، چہرہ، سر اور کمر پونچھتے رہتے۔ سارا سٹاف حیران تھا کہ پرنسپل صاحب نے اپنے دفتر میں ائرکنڈیشنر کیوں نہیں لگوایا۔

پیسوں کی کمی نہیں تھی، کلاس میں ہمیں پڑھانے کے لئے انہوں نے اپنے وقت کی جدید ترین ٹریننگ ایڈز اکٹھی کی ہوئی تھیں۔

اوور ہیڈ، سلائیڈ، موشن پکچر، پتہ نہیں کتنی طرح کے پروجیکٹرز تھے، کمپیوٹر میکنا بائٹ،

پتہ نہیں کیا کیا اکٹھا کیا ہوا تھا۔

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب کسی بھی میڈیکل کالج میں اس قسم کی خرافات ابھی نہیں پہنچی تھیں، سب مزے سے ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں میں اے سی لگا کے بیٹھتے تھے۔

ہمارے لئے علم کا طوفان تھا اور گرمی کا موسم!
نہ کالج کی بلڈنگ تھی کوئی پرابر نہ ہوسٹل کوئی سُر کا تھا مگر پرنسپل صاحب کی ترجیحات الگ تھیں۔
ہوسٹل میں بلاناغہ چکر لگاتے۔
ہاں بھئی، کھانا ملا؟
ٹھیک تھا؟
پڑھائی کی؟......کوئی ایسی چیز تو نہیں جس کی سمجھ نہ آتی ہو؟
اب پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے کے لیکچر سننے کے بعد کسی سٹوڈنٹ میں اتنا حوصلہ تھوڑی رہ جاتا ہے کہ وہ مزید ہوسٹل میں بھنے بیٹھ جائے۔
سب پرنسپل صاحب سے پریشان تھے۔ سٹاف کا عملہ اور وجوہات سے دکھی تھا۔ آخر وہ لوگ بھی گھر بچوں والے تھے۔ ادھر کالج ایڈمنسٹریشن کے دفتر صبح کھلتے تو شام پانچ بجے تک نان سٹاپ کھلے رہتے۔

ایک بڑا پلندہ فائلوں کا جاتے ہوئے پرنسپل صاحب باندھ کے ساتھ گھر لے جاتے۔ کلرکوں کو رات گھر سے ان سے ڈکٹیشن لینے جانا پڑتا، صبح آتے ہی یہ ڈی ایف اے دیکھنے بیٹھ جاتے۔
کلرک ہم سٹوڈنٹس کو بھڑکاتے۔
تم لوگ کچھ کرو...... کوئی یونین بناؤ...... الیکشن کراؤ...... اپنے لیڈر سامنے لاؤ...... اس طرح اندھادھند کام کرنے کے لئے تو زندگی نہیں بنی۔
مگر مجال ہے، جتنی دیر پرنسپل صاحب رہے، کالج میں یونین نہیں بنی، الیکشن نہیں ہوئے اس لئے نہ کوئی جھگڑا ہوا نہ فساد ہوا۔ مجبوراً سب کو پڑھنا پڑتا۔
میری مجبوری اور تھی۔
مجھے تو انہوں نے اپنی کتاب کے لئے باندھا ہوا تھا۔ پچیس روپے دے کر مجھے بھی اپنے ساتھ گڈے کے آگے جوت لیا تھا۔

میں ان کے دفتر میں ان کی باتیں سنتا رہتا۔ انہیں کام کرتے دیکھتا رہتا۔

کبھی کبھار وہ کسی بہت بڑے گھپلے کی نشاندہی کرتے ہوئے کسی ظلم کی بات کرتے ہوئے اسے چوک پراگ داس سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ کوئی بہت انہونی، نیڑھی چیز ہو جاتی تو کہتے، تم لوگوں نے پھر مجھے چوک میں لا کے کھڑا کر دیا...... چوک پراگ داس میں...... مجھے تو خیر کیا اس چوک کی سمجھ آنی تھی، جن سے وہ باتیں کرتے وہ بھی چوک پراگ داس کی حقیقت سے ناواقف تھے۔

بس دکھاوے کی فرماں برداری دکھانے کے لئے ہر کوئی چوک پراگ داس کا نام سن کے یوں سر ہلا دیتا جیسے وہ بھی اسی چوک کا رہنے والا ہو، کہی بات کی حقیقت جانتا ہو۔

مگر اُس دن ڈربے میں بند مرغیوں کے چاروں طرف آگ دیکھ کے انہوں نے چوک پراگ داس، چوک پراگ داس کے اتنے نعرے لگائے کہ میں نے فیصلہ کر لیا، ان سے اس چوک کی حقیقت پوچھ کے رہنا ہے۔

یہ چوک ہے کہاں؟ وہاں ہوا کیا تھا؟

آخر یہ چوک پرنسپل صاحب کے حافظے میں یوں کھب کے کیوں رہ گیا ہے؟

ایک دن ان کے دفتر میں موقع مل گیا۔ وہ میری کسی ڈایا گرام کی ڈرائنگ دیکھ کے خوش ہوئے، میں ان کی کرسی کے پیچھے کھڑا ان کے کندھے دبا رہا تھا۔ وہ میز پر میری نئی تصویریں دیکھ رہے تھے۔

مالی کے گھر آگ لگنے کے واقعہ کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے میں نے بات چوک پراگ داس تک لانے کے لئے پہلے، مالی کی بات چھیڑی۔

بولے، اس گدھے کو میں معاف نہیں کروں گا، اس نے مرغیوں کے ڈربے پر تالا کیوں لگایا تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا اندر مرغیاں ہیں۔

مرغیوں کی ہی وجہ سے تو لگایا تھا۔ میں پتہ نہیں کیوں بول پڑا۔

انہوں نے پہیوں پر گھومتی اپنی کرسی گھمائی، میری طرف پلٹ کے اپنی عینک کے اوپر سے میری آنکھوں سے گھور کے بولے۔

انہوں نے بھی گھروں میں بند لوگوں کو مرغیوں کی طرح بند کر دیا تھا۔ پھر آگ لگا دی تھی۔

کہاں؟ میں نے پوچھا۔

انہوں نے ایک جھٹکے سے اپنا چشمہ کھینچ کے ہاتھ سے اتارا اور چونک کے بولے، تُو چوک پراگ داس کو نہیں جانتا؟

اس بار ان کی خشمگیں نظروں کو دیکھ کے میں دل ہی دل میں مسکرایا، چلو، خود ہی بات اس چوک تک آ گئی۔

سر، یہ چوک ہے کدھر؟

تجھے اتنا بھی پتہ نہیں؟ انہوں نے میز سے اپنے دونوں ہاتھ ہٹا لئے اور کندھے اپنے دونوں میرے دباتے ہاتھوں کے نیچے سے اس طرح اِدھر اُدھر ہلائے جیسے کہہ رہے ہوں، ہٹ جا، تجھے میرے کندھے دبانے کا کوئی حق نہیں، اتنا بے علم!

میں نے پہلے ہی اس چوک پر کافی سوچ رکھا تھا۔ بس اتنی سمجھ آتی تھی کہ نام سے اندازہ ہوتا ہے یہ پڑوسی ملک کا کوئی چوک ہے۔ اس وقت اسی خیال سے بول پڑا، سر، میں تو یہاں پیدا ہوا ہوں، جن جن شہروں میں رہا ہوں، وہاں اس نام کا کوئی چوک نہیں سنا۔

انہوں نے شپٹا کے اپنا چشمہ اتار کر میز کے چکنے شفاف شیشے پر ٹھک سے رکھا اور اونچی آواز میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہنے لگے،

تُو جس مرضی شہر میں رہا ہو، جہاں مرضی پیدا ہوا ہو،

اس ملک میں آنے والے تمام راستے، ساری سڑکیں، سبھی راہیں اس چوک سے ہو کر آتی ہیں...... تو چوک پراگ داس کو نہیں جانتا!

انہوں نے پھر کرسی گھما کے میرا چہرہ دیکھا، اسی چوک کی تو سب نشانیاں ہیں یہاں، وہ پھر بولے۔ پھر ایک دم سے میز پر جھک کے سامنے پڑے کاغذوں کے پلندے سے ایک کورا کاغذ نکال کے سامنے سیدھا کیا، میز کے کونے پر پڑے اپنے چشمے کو اٹھا کے پسینے سے بھرے اپنے چہرے پر پھنسایا اور کاغذ پر فری ہینڈ سے تیزی کے ساتھ قلم سے دو کراس قریب قریب بنا کے درمیان میں قلم کی نب ٹھونک کے بولے۔

یہ ہے، چوک پراگ داس،

دیکھ ادھر!

میں ان کے دائیں کندھے کے اوپر سے گردن لمبی کر کے ان کے سامنے بچھے کاغذ پر چار سڑکوں کے بیچ ان کے قلم کی نب سے بنے ایک نقطے کو دیکھنے لگا۔

انہوں نے پھر انہی لکیروں کے ایک طرف ایک دائرہ بنایا، بولے، یہ تھا چوک نشانیاں۔

پھر قلم گھما کے اس کے سامنے چوک سے پار قلم کو دائرہ میں گھماتے ہوئے بولے، ادھر تھی اونچی مسجد۔

اونچی مسجد؟

میں ان کے دائیں کان کے قریب سے بولا۔

انہوں نے جھنجھلا کے سر بائیں طرف کیا اور بولے۔ ہاں، اسی مسجد کا مولوی بے وقوف تھا ہمارے مالی کی طرح۔ ساری اسی کی بے وقوفی تھی۔ اس کی بے وقوفی میں معاف نہیں کر سکتا۔

اس نے کیا کیا تھا سر؟ اس بار میں نے ان کے کان سے ذرا سا ہٹ کے بات کی۔

اس نے مالی کی طرح سارے محلے کے لوگوں کو مسجد میں بند کر کے، دروازے کی چابی پرالی کے ڈھیر والوں کو دے دی تھی۔

انہوں نے آگ لگا دی۔

ڈیڑھ سو لوگ تھے اندر۔

پتہ نہیں کتنی عورتیں، لڑکیاں، بچے، بوڑھے، مرد، سب ان مرغیوں کی طرح پھڑپھڑاتے ٹکریں مارتے مر گئے۔

پانچ بوریاں ان کی ہڈیوں کی میرے پاس پولیس اٹھا کے ہسپتال لائی تھی۔ پچپن جلی لاشوں کی شناخت نہیں ہو سکی تھی۔

تو اس چوک کو نہیں جانتا اور یہاں میرے پیچھے کھڑا ہے۔

انہوں نے پھر عینک اتار دی۔

ماتھے سے پسینہ پونچھا اور میری طرف کرسی گھما کے کہنے لگے۔

سارے محلے والوں نے مولوی یوسف سے کہا، مولوی صاحب، ادھر خطرہ ہے۔ ہندوؤں سکھوں نے ادھر حملے کا پلان بنا لیا ہے۔ آپ سب کو یہاں سے جانے دیں۔

لوگ لاریاں لے کر آ گئے۔

بہت سے لوگ گھروں سے نکل نکل کے لاریوں میں بیٹھ گئے، گھر در، سب بھرے اسی طرح چھوڑ دیئے۔ ان کی جانیں بچ گئیں۔ یہ یوسف اڑ گیا۔ کہنے لگا، ہم تو کانگرس کے حمایتی ہیں۔ ہمیں انہوں نے کیا کہنا ہے۔

لے دیکھ، اللہ کا نظام، سارے مر گئے، جل گئے، اس کے اپنے گھر کے سارے جی چڑ مڑ ہو کے اس کے سامنے دم توڑ گئے۔ یہ بچ گیا۔ جسم جلا، زخم آئے مگر جان بچ گئی۔ یہاں آنے تک برسوں سینے پر ہاتھ مار مار کے روتا تھا، ہائے، میں نے کیوں کانگرس کی حمایت کی تھی، نہ ان کا حمایتی ہوتا نہ ان پر بھروسہ کرتا۔

بھروسہ تو اُن دنوں اُن پر کسی کو نہیں تھا۔ بس یہ کچھ

لوگ تھے، کچھ احراری کچھ یونینسٹ اور کچھ مولوی۔ ان سے اللہ نے وژن چھین لیا تھا...... اب تک چھینا ہوا ہے۔

یہی لوگ اڑ گئے۔

پتہ نہیں کیوں اڑ جاتے ہیں یہ لوگ بات بات پر۔

پرنسپل صاحب تولیے سے اپنا سر رگڑتے ہوئے بولے، لوگوں نے بہتیری منتیں کیں، ان سے کہا سرکار، ساتھ کا محلہ دیکھو۔ کٹڑہ جیمل سنگھ میں مسلمانوں کا ایک گھر بھی سالم نہیں بچا۔ سارے انہوں نے جلا دیئے۔

کچھ تو مولوی یوسف کو لے کر شہابے فالودے کی دکان سے ملحق گھر دکھانے بھی لے گئے، یہ دیکھ کر مولوی، سارا گھر جلا ہوا تھا، گھر کے اندر جلی لاشوں کی بدبو بھری تھی اور چوبارے کی دیوار سے ایک زنجیر سے نیچے سڑک پر ایک جلی ہوئی بکری کا بدن لٹک رہا تھا۔ وہ بے چاری بے زبان بکری اندر کہیں بندھی ہوگی، آگ لگی تو ادھر ادھر جان بچانے کو تڑپتی بھاگی ہوگی۔ اسی تڑپ میں جلے بدن کے ساتھ بکری نے کہیں دیوار کے اوپر سے چھلانگ لگائی۔ زنجیر چھوٹی تھی، سڑک پر گرنے سے پہلے، سڑک کے اوپر ہی جھولتی ہوئی جل کے مرگئی۔

مولوی یوسف نے جلی بکری زنجیر سے بندھی دیکھ لی، پھر بھی نیچے اس چوبارے کی دیوار پر کانگرس کے کسی اشتہار پر مہاتما گاندھی کی تصویر پر انگلی رکھ کے بولا، یہ دیکھیں یہ اہنسا کی بات کرتے ہیں،

عدم تشدد کا درس دیتے ہیں۔

یہی تو سوچنے کی بات ہے، یوسف جی!

بہتیرے اس وقت سوچنے والے تھے!

دور دور سے لوگ آ آ کر وہ نقشہ دیکھ کے گئے۔

یہ دیکھ،

انہوں نے میز پر پڑے ایک اخبار پر ہاتھ مارا،

یہ اخبار والا بھی ادھر گیا تھا۔

وہ بے چارہ تو پھوٹ کے رو پڑا تھا۔ ایک اوپر جلا ہوا مسلمان کا گھر ایک لٹکتی ہوئی بے زبان بندھی بکری کا جسم اور نیچے گندی نالیوں میں بکھرا ہوا جلا گھر کا سامان، انہی کوڑے کرکٹ کی طرح بکھری بکھری ہوئی چیزوں سے بڑے نظامی کو قرآن پاک گرا پڑا نظر آیا تھا۔ حمید نظامی اسے اٹھا کے وہیں گلی میں لیٹ گئے، روتے روتے منہ سجا لیا، پتہ نہیں کیسے لوگ انہیں سمجھا بجھا کے لاہور واپس لے آئے۔

ان کی تو وہاں سے ہٹنے کی کوئی حالت نہ تھی۔

لوگوں نے بھی بہت سمجھایا مولوی یوسف کو مگر وہ اڑ گیا۔

لاریاں چلی گئیں۔

رات کو اس کے اہنسا والے یار آ گئے۔ پہلے چالاکی سے بولے، مولوی جی، ہمیں ہمارے ساتھی ڈانٹ رہے ہیں کہ تم لوگ چوک پراگ داس والوں کو بچا رہے ہو، کہتے ہیں وہ کہ ادھر مسلمانوں نے اپنے ساتھ اسلحہ چھپایا ہوا ہے...... ہے یہ کوئی یقین کرنے والی بات، مگر ہماری وہ سنتے نہیں، یہ آدمی دوان کے ہیں، آپ انہیں ہمارے ساتھ چل کر سارے گھر، مسجد کے کونے کھدرے دکھا دیں، ان کا منہ بند کریں۔

لے مولوی اس چکر میں آ گیا۔

اپنا مولوی اس چکر میں آ گیا۔

اپنے لوگوں کو تو وہ پہلے اندر بند کر چکا تھا۔

اب یہ دشمنوں کو چابیاں دینے والی بات تھی۔

دے دی چابیاں، تلاشی دلا دی۔

انہوں نے تسلی سے اندر کا سارا نقشہ دیکھ لیا،

کدھر کدھر کھڑکی ہے،

کدھر کدھر دروازہ ہے،

کہاں کتنے مرد ہیں،

کدھر کدھر عورتیں چھپی ہیں۔

بس وہ گئے۔

رات گہری ہوئی تو وہ جو تلاشی لینے آئے تھے وہ حملہ آوروں کا ہراول دستہ تھے۔

ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تیل اور پٹرول کے کنستر تھے۔

ایک ہجوم آ گیا۔

اونچی مسجد کا گھیراؤ ال لیا۔

ہجوم میں بندوقیں بھی تھیں۔ سب پوری تیاری سے آئے تھے۔ نیزے، بلم، کلہاڑیاں، چھریاں، لاٹھیاں سب ان کے پاس تھیں۔

انہوں نے ایک ایک کر کے پہلے سارے باہر نکلنے کے راستے بند کئے، پھر چاروں طرف تیل چھڑک دیا، مسجد کے اندر پٹرول کی بھری بوتلیں پھینکیں اور پھر ہر جگہ ماچس دکھادی۔

سب جل گیا۔

بیس بیس گھر دوران بے گناہ لوگوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔

ٹو نے نہیں سنیں وہ چیخیں؟

وہ پھر مجھے عینک کے اوپر سے گھورنے لگے۔

سر، میں تو پاکستان بننے کے آٹھ دس سال بعد پیدا ہوا ہوں، مجھے تو......

تو آٹھ دس سال بعد کی بات کرتا ہے، ایسی چیخیں تو آٹھ دس صدیاں تک ہواؤں میں موجود رہتی ہیں۔ ٹو نے اور تیری نسل کے لوگوں نے کان بند کئے ہوئے ہیں۔

میں شرمندہ ہو کے سر کھجانے لگا۔

وہ پھر میری طرف جھکے، بولے، ادھر دیکھ۔ انہوں نے پھر میز پر پڑے کاغذ پر کھینچی ہوئی لکیروں کے چوک کے اردگرد دائرے لگائے اور کہنے لگے، ادھر ادھر سے، ان سارے گھروں میں موجود جوان، بوڑھے، بچوں کو انہوں نے ایک ایک کر کے مار دیا اور ان سارے گھروں کی.... انہوں نے پھر ایک اور دائرہ لگایا...... سب گھروں سے بچی ہوئی عورتوں کو وہ پکڑ کے لے گئے۔

قریب ہی، ادھر دیکھ، انہوں نے کاغذ پر ایک بڑا سا بیضوی نشان بنایا۔

ادھر،

زیادہ فاصلہ نہیں تھا،

یہاں تھا جلیانوالہ باغ

اور یہ تھی ان کی سرائے گوردام داس۔

یہ، یہ دیکھ!

انہوں نے کاغذ پر قلم کی نب قلم اٹھا اٹھا کے رکھی اور پھر اسی کاغذ کو ہاتھ سے تہہ مڑ کر کے اور مٹھی میں لے کر اس طرح سینے سے بھینچ لیا جیسے اس دن ہوسٹل کے پچھواڑے میں مالی کے گھر جلی ہوئی تڑپتی چھوٹے ہوئے پروں والی کچی مرغیوں کو انہوں نے اٹھا کے سینے سے لگا لیا تھا۔ پھر اسی کاغذ کے بل پھر سے کھولتے ہوئے، قلم کی نب کے نشان پر انگلی رکھ کے بولے، یہاں لے گئے، وہ ان سب عورتوں کو!

اس سرائے گوردام داس میں، اور اسی رات صبح ہونے سے پہلے انہوں نے ان تمام عورتوں کے سارے کپڑے اتار کے مادر زاد برہنہ کر کے جلی ہوئی ٹوٹے پروں والی مرغیوں کا غول بنا کے ان کا جلوس نکالا تھا۔

ٹو نے اس جلوس میں شامل اپنی بہنوں کی بھی چیخیں نہیں سنیں۔

ان کی آوازیں بھی تمہیں نہیں سنائی دیں۔

پرنسپل پروفیسر طوسی صاحب نے زور زور سے اپنے سر پر تو لیہ رگڑا اور مجھے عجیب سے دکھ کی انتہائی شدت کے ساتھ اپنی عینک کے اوپر سے جھانک کے دیکھتے ہوئے بولے،

یہ آوازیں تو تیرے کانوں میں پہنچنی چاہئیں۔

امرتسر یہاں سے اتنی دور تو نہیں!

طنز و مزاح

محبت

جس ہستی سے میں نے محبت کی ہے وہ اس قابل ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے اگر میں اس کے اوصاف حمیدہ گنوانا چاہوں تو اعشاری نظام جواب دے جائے۔

☆ خادم حسین مجاہد

ہمارے ایک مہربان اکثر ہمارے داخلی معاملات میں ٹانگ اڑاتے رہتے تھے۔ طریقہ واردات کچھ یوں تھا کہ خارجی مسائل پر بات کرتے کرتے اچانک داخلی مسائل میں داخل ہو جاتے اور جب باہر نکلتے تو ہمارے کچھ راز ان کے ہاتھ میں ہوتے جو وہ تمام حلقۂ احباب میں فوری طور پر نشر کر دیتے۔ ہم بڑے دنوں سے انہیں سبق سکھانے کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ ایک دن ہماری مراد بر آئی وہ تشریف لائے اور معصوم بچوں کی طرح پوچھنے لگے۔ ''یار! یہ تو بتاؤ کہ محبت کیا ہے؟''

ہمارا ماتھا فوراً ٹھنکا کہ اس نامعقول دور میں جب کہ بچہ بچہ اس موضوع پر ماسٹر ہے یہ پوچھ رہے ہیں کہ محبت کیا ہے۔ موضوع میرا من پسند بھی تھا اور اگلی پچھلی کسر نکالنے کا موقع لہٰذا ہم فوراً شروع ہو گئے۔

''خلیل جبران کے مطابق محبّ اور محبوب کے ہم آہنگ محسوسات کو محبت کہتے ہیں یہ دل میں موجود ایک روشنی ہے۔ وہ پھول ہے جو ارضِ بہار کا محتاج نہیں۔ برٹنڈ رسل کے بقول محبت انسان کے اندر ایک شریف جذبے کا نام ہے جسے اگر نکال دیا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ ہیلوئے فنس کا کہنا ہے کہ شیریں ترین لطف اور تلخ ترین غم کا نام محبت ہے۔ ہاجرہ مسرور نے لکھا ہے کہ محبت مکڑی کا جالا ہے جو جسم سے ایک بار لپٹ جائے تو چھڑانے کے باوجود تھوڑا بہت چپکا رہ جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر کی رائے میں محبت دنیا کا قدیم ترین خطرناک اور لاعلاج مرض ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ واحد مرض ہے جو مریض کو بے حد پسند ہوتا ہے اور وہ اس کا علاج کرانا بھی پسند نہیں کرتا''۔

ہم سانس لینے کے لئے رُکے تو نوٹ کیا کہ دوست ہمہ تن گوش نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے لہٰذا ہم نے سر ہلاتے ہوئے دوبارہ سٹارٹ لیا۔ ''رومانوی افسانہ

نگاروں کے خیال میں محبت شربت ہے، ریشم ہے، خیابان، ہے، ابال ہے، لوری ہے، تھپکی ہے، کھلی آنکھوں کی نیند ہے، نشہ ہنگامہ اور طنطنہ ہے۔ یہ بڑی شریر، بڑی نازک اور بڑی حاسد ہوتی ہے تنہائی مانگتی ہے، درد آنسو اور رسوائیاں دیا کرتی ہے۔ ایک ہوزری والے نے کیا خوب تعریف کی ہے کہ محبت بغیر آستین کی ایسی بنیان ہے جس میں سر اکثر بازوؤں والی جگہ جا گھستا اور یہ بھی سن لو میری جان کہ محبت وہ چیز ہے جس کے سامنے سارے علوم نصیحتیں، مذہب اور فلسفہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ ایک لافانی جذبہ ہے"۔

ہم نے دوست کی طرف دیکھا وہ یوں سر ہلا رہے تھے جیسے دل پر لکھ رہے ہوں۔ ہم نے سلسلۂ کلام پھر جوڑا۔

کیپٹن اشفاق حسین کہتے ہیں کہ محبت گرامر کی کسی کتاب کا نام نہیں ہے، یہ ردیف قافیے کی قیود سے آزاد بحرِ بے کراں ہے۔ اس کی لذتوں سے فیض یاب ہونے والے زبان اور لہجوں کے پابند نہیں ہوتے۔ زندگی کے پُرشور سمندر میں ناچتی لہریں ایک دوسرے سے ٹکرا کر منفی اور مثبت کی جہت پوری کر دیتی ہیں آنکھیں آنکھوں کو پیغام دیتی ہیں اور دل کے راستے سفر کرتی یہ موجیں جسم کے انگ انگ میں پھیل جاتی ہیں تب انبساط کی ایسی جل ترنگ من میں بج اٹھتی ہے کہ روح اس کی گنگناہٹ سے وجد میں آ کر رقص کناں ہو جاتی ہے بشریت کا ادراک تبھی ہوتا ہے"۔

"میں سمجھ گیا"۔ آخر میرے کرم فرما کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ "لیکن یہ تو بتاؤ کہ محبت آخر ہوتی کیسے ہے؟ کیا اسے جڑ سے ختم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں؟"

"محبت ایک غیر اختیاری جذبہ ہے اور یہ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ اور کسی سے بھی ہو سکتی ہے لیکن کچھ جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں محبت کے پودے کا پھوٹنا کافی

مشکل ہوتا ہے جیسے سخت پتھریلی زمین جس پر بے حسی کی زہریلی دوا چھڑکی جا چکی ہے''۔ ہم نے کچھ دیر توقف کر کے سوال کے دوسرے حصے پر غور کیا اور پھر گویا ہوئے۔

''محبت کے پودے کو تم جڑ سے اکھیڑنا چاہو تو یہ تقریباً ناممکن ہے البتہ مصروفیات کے کھرپے یا دوری کی درانتی سے اس حد تک اور اتنی صفائی سے ضرور کاٹا جا سکتا ہے کہ سرسری طور پر دیکھنے سے کچھ نظر نہ آئے لیکن تنہائی کی خوردبین سے دیکھنے پر اس کی جڑیں ضرور نظر آئیں گی اور جوں ہی قربت کی نمی میسر آئی یہ پھوٹ پڑیں گی بشرطیکہ بے حسی کی زہریلی دوا اپنا کام نہ کر چکی ہو''۔

''عام طور پر کیسی محبتیں دیکھنے کو ملتی ہیں؟'' دوست نے غیر محسوس طریقے سے بات کو موڑنے کی کوشش کی۔

''کیپٹن اشفاق حسین نے محبت کی کئی اقسام پر بحث کی ہے وہ کہتے ہیں محبتیں جیسی بھی ہوں رنگ لاتی ہیں۔ کچھ محبتیں تو وہ ہوتی ہیں جن کا اظہار بھی نہیں ہو پاتا آدمی اندر ہی اندر دھیمی آگ پر رکھے دودھ کی طرح اونٹتا رہتا ہے اور وہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنی خودی کا لعاب اپنے گرد لپیٹتا رہتا ہے کسی سے کچھ کہتا نہ سنتا ہے۔ لپکتے شعلوں کی طرح کہ ان میں مبتلا ہونے والے خود بھی جلتے ہیں اور قریب رہنے والے بھی تپش محسوس کرتے ہیں اور کچھ اظہار کی ضرورت ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ کچھ محبتوں میں ندی کی لہروں کی سی روانی ہوتی ہے اور کچھ میں میدانی دریاؤں کی سی طغیانی، کچھ ٹوٹنے والے تاروں کی طرح ہوتی ہیں آناً فاناً چمک کر فنا ہو جانے والی محبتیں اور کچھ قطبی ستاروں کی سی پائیدار مستقل راہ دکھانے والی محبتیں۔ کچھ محبتیں آبشاروں کی طرح ہوتی ہیں کہ جب نچھاور ہوتی ہیں تو شور مچاتی دندناتی ہوئی اور کچھ پربتوں کے دامن سے پھوٹنے والے جھرنوں کی طرح ٹھنڈی میٹھی شفاف محبتیں''۔ ہم نے جنٹل مین الحمدللہ کے دو جملے انہیں سنا دیئے۔

کیا آپ نے بھی کبھی کسی سے محبت کی ہے؟'' انہوں نے ایک دم عادت کے مطابق ہماری پرائیویسی (Privacy) میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔

''ہاں'' ہم نے دوست کی بات کی تہہ تک پہنچتے ہوئے کہا۔ ''اور جس ہستی سے میں نے محبت کی ہے وہ اس قابل ہے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے قدموں میں ڈھیر کر دی جائے اگر میں اس کے اوصاف حمیدہ گنوانا چاہوں تو اعشاری نظام جواب دے جائے''۔

''کیا واقعی؟'' دوست نے مصنوعی حیرت سے کہا اور پھر مزید پیش قدمی کی کوشش کی۔ ''اچھا تو آپ ان سے کتنی محبت کرتے ہیں؟''

''ابھی تک کوئی ایسا سکیل نہیں بنا جس پر ہماری محبت کی پیمائش کی جا سکے۔ ریاضی تو تم پڑھتے ہی ہو یوں سمجھ لو کہ زیرو سے انفنٹی (Infinity) تک''۔ ہم نے جواب دیا۔

''بھئی، وہ کون سی خوش نصیب ہستی ہے جسے آپ اتنی محبت کرتے ہیں کہ اس کی پیمائش کمپیوٹر بھی نہیں کر سکتا''۔ دوست نے مکھن کی تہہ لگاتے ہوئے بالآخر ہم سے وہ سوال پوچھ ہی لیا کہ جس کی خاطر انہوں نے یہ سارا کھٹ راگ پھیلایا تھا اور اتنی دیر سے ہمارے پُر مغز خیالات سے مستفید ہو رہے تھے۔

''میری محبوب ہستی...... ماں ہے''۔ ہم نے رک رک کر جملہ پورا کیا، بالفاظ دیگر ان کے خیالات اور تصورات پر بجلی گرائی۔

اس کے بعد ان کی کیا حالت ہوئی اور انہوں نے دل ہی دل میں ہمیں کتنی گالیاں دیں، یہ تو نہیں معلوم لیکن پھر کبھی انہوں نے ہمارے داخلی تو کیا خارجی معاملات میں بھی مداخلت نہیں کی۔

میں آج تک اپنے کاندھے پر قائداعظم کے ہاتھ کالمس محسوس کرتا ہوں اسے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور ایک عظیم اعزاز سمجھتا ہوں۔

میں نے پاکستان بنتے دیکھا

جناح کے بچو نگڑے اور پاکستان کے شتونگڑے

کچھ یادیں کچھ باتیں

☆ میاں محمد ابراہیم طاہر

قیام پاکستان کے وقت میری عمر تقریباً دس سال تھی۔ میں کپورتھلہ کے جلوخانہ سکول میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا۔ میرا چھوٹا بھائی محمد اسماعیل اور ایک ماموں زاد کزن بھی میرے ہم جماعت تھے۔ ہم نے آٹھ دس لڑکوں پر مشتمل ایک ''بچہ مسلم لیگ'' بنا رکھی تھی، میں اس گروپ کا سرغنہ تھا۔ ہم نے محلے کے ایک مسلمان درزی کی مدد سے پاکستان کا جھنڈا بنوالیا۔ سکول سے چھٹی کے بعد سب لڑکے اکٹھے ہو کر پاکستان کے حق میں جلوس نکالتے۔ ''لے کر رہیں گے پاکستان'' اور ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے نعرے لگاتے۔ ہمارے گروپ نے پاکستان کیپ رچم کی ہم رنگ قمیصیں اور سفید نیکریں بھی سلوائی تھیں۔ ہمارا گروپ اپنے اس ''پاکستانی لباس'' کی وجہ سے پورے سکول میں نمایاں اور منفرد تھا۔ ہمارا ریاضی کا ایک ہندو ٹیچر کرم چند تو باقاعدہ ہمیں ''جناح کے بچونگڑے اور پاکستان کے شتونگڑے'' کے القابات سے نوازتا رہتا۔

آزادی سے ایک سال پہلے مجھے اپنے سکول کے ایک مسلمان استاد کی زبانی معلوم ہوا کہ بابا جناحؒ (ان دنوں قائداعظم کو زیادہ تر مسلمان بابا جناحؒ کے نام سے یاد کیا کرتے تھے) جالندھر تشریف لا رہے ہیں گھر آ کر میں نے اپنے والد صاحب سے ضد کرنا شروع کر دی کہ میں بابا جناحؒ کو دیکھنے کے لئے جالندھر جانا چاہتا ہوں۔ والدہ مرحومہ نے میرے شوق جناحؒ کے دیدار کو دیکھ کر والد محترم کو آمادہ کر لیا کہ وہ مجھے بابا جناحؒ کی ایک جھلک دکھانے کے لئے جالندھر لے جائیں۔

حضرت قائداعظمؒ کی جالندھر آمد سے ایک روز پہلے والد صاحب اور میں جالندھر پہنچ گئے اور رات اپنی پھوپھی جو جالندھر کے محلہ عالی میں بیاہی ہوئی تھیں، کے گھر گزاری صبح ٹرین کی آمد سے پہلے ہم جالندھر ریلوے سٹیشن پر پہنچ گئے۔ میں نے سبز قمیص اور سفید نیکر پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں سبز ہلالی پرچم تھام رکھا تھا۔ جوں جوں

ٹرین کی آمد کا وقت قریب آتا گیا سٹیشن پر مسلمانوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا اور قائداعظم زندہ باد پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔ اتنے میں ٹرین سٹیشن پر آ کر رکی والد صاحب نے مجھے اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ حسن اتفاق دیکھیں قائداعظم کا ڈبہ عین ہمارے سامنے آ کر رکا جونہی قائداعظم ڈبے کے دروازے پر تشریف لائے استقبالی ہجوم نے نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ حضرت قائداعظم نے ایک مشفقانہ مسکراہٹ سے ہاتھ بلند کر کے ہجوم کے نعروں کا جواب دیا پھر چند لمحوں بعد ہجوم کو خاموشی اختیار کرنے کا اشارہ فرمایا۔ ان کا اشارہ پاتے ہی عوام کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہجوم پر ایک دم سکوت طاری ہو گیا مگر میں اپنے والد صاحب کے کاندھوں پر سوار پرجوش انداز سے نعرے بازی میں مصروف رہا۔ اسی دوران حضرت قائداعظم کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے میرے والد کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ ہجوم نے والد صاحب کو دروازے تک پہنچنے کے لئے راستہ دے دیا جیسے ہی میرے والد صاحب دروازے کے قریب پہنچے قائداعظم نے ہاتھ بڑھا کر تبسم فرماتے ہوئے میرا کاندھا تھپتھپایا اور انگریزی میں میرے پاکستانی سبز ہلالی پرچم والے لباس کی تعریف کی۔ میں آج تک اپنے کاندھے پر قائداعظم کے ہاتھ کا لمس محسوس کرتا ہوں اسے اپنی زندگی کا سب سے قیمتی اور ایک عظیم اعزاز سمجھتا ہوں۔

پھر قیام پاکستان کے اعلان کا مرحلہ آتا ہے ماہ اگست کے آخر میں ریاستی سکھ حکومت کی طرف سے کپورتھلہ کی ایک مسلم آبادی والی تحصیل سلطان پور اور گرد و نواح کے دیہات میں اعلان کیا گیا کہ ایک بہت بڑا قافلہ ہندو ملٹری کی حفاظت میں پاکستان جائے گا۔ اس لئے تمام مسلمان پاکستان جانے کے لئے قافلے میں شامل ہو جائیں۔ چنانچہ کئی ہزار سادہ لوح مسلمان اپنے مال و اسباب سمیت قافلے میں شامل ہو گئے۔ جب یہ قافلہ کپورتھلہ کے نواح سے گزر رہا تھا تو ہزاروں سکھوں نے اس پر حملہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ قافلے سے جانیں بچا کر شہر کپورتھلہ کی طرف بھاگنے والے مردوں عورتوں اور بچوں کی حفاظت پر مامور ”ریاستی ملٹری“ نے انہیں بھون ڈالا۔ تمام دن قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا کپورتھلہ کے مسلمان اپنے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے بے بسی اور بیچارگی سے اپنے مسلمان بھائی بہنوں کو گاجر مولی کی طرح کٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے مگر ان کی کوئی مدد اس لئے نہ کر سکے کہ قافلے کی حفاظت پر مامور ٹینک اپنی مشین گنوں سے شہر کی طرف مسلسل فائرنگ کر رہے تھے۔

قافلے کے قتل عام کے بعد ریاستی انتظامیہ نے مسلمانوں کے منظم اور وسیع پیمانے پر قتل عام کے لئے ایک اور سکیم تیار کی شہر میں اعلان کیا گیا کہ ایک سپیشل ٹرین مسلمانوں کو لے کر ملٹری کی حفاظت میں پاکستان جائے گی۔ شہر کے بیشتر مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کی یہ ایک گھناؤنی سازش تھی جس کے بارے میں شہر کے مسلمانوں کو بروقت خبر ہو گئی۔ اس کے باوجود بہت سے گھرانے خصوصاً دو سادہ لوح مسلمان جو گرد و نواح کے دیہات سے آ کر شہر میں پناہ گزین تھے اس ٹرین میں جو بغیر چھت کے 82 چھکڑوں پر مشتمل تھی، سوار ہو گئے۔ یہ ٹرین 9 ستمبر کو شہر اور ریاست کی حدود سے باہر جا کر تہ تیغ کر دی گئی۔ آج ہمارے حکمران ہمارے ازلی دشمن ہندو اور سکھوں سے پیار و محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں اور وزیراعظم نواز شریف متعصب بھارتی وزیراعظم نریندر مودی کو آموں کا تحفہ بھیج رہے ہیں لیکن جن لوگوں نے اس قوم کی درندگی، وحشت اور بربریت کے مظاہرے کو 1947ء میں دیکھا ہے وہ کسی صورت ان پر اعتبار نہیں کر سکتے۔ ہندو کبھی بھی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا۔

■○■

تاریخی ناول

پنجاب پر سکھوں کا قبضہ کیسے ہوا؟ مغلیہ سلطنت کیسے برباد ہوئی؟

مغلانی بیگم

رفیق ڈوگر قسط: 12

شہنشاہ کی برہنہ لاش

جموں کے راجا رنجیت دیو نے شہر سے پانچ میل باہر نکل کر مغلانی بیگم کا استقبال کیا۔ بیگم کی سواری پر نظر پڑتے ہی راجا اپنی سواری سے اتر آیا۔ ان کے امرء، وزراء اور درباری بھی پیدل چلتے ہوئے بیگم کی سواری تک پہنچے اور انہیں سلام کیا اور پھر ان کی اجازت سے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور بڑی شان سے بیگم کو شہر میں لائے۔ بیگم کے قافلہ میں دو صد سے زائد خدام اور ملازمین قدیم تھے۔ قافلہ جموں شہر میں داخل ہوا تو لوگ بیگم کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئے۔ جلوس ایک شاندار حویلی کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ بیگم کی آمد کی اطلاع ملنے پر راجا نے ان کے قیام کے لئے یہ حویلی خالی کر دی اور ان کے مستقل قیام کے لئے ان کے شایان شان ایک نئی حویلی کی تعمیر شروع کرا دی تھی۔ تعمیر کی نگرانی کوتوال شہر خود کر رہے تھے۔

راجا رنجیت دیو کچھ دیر کے لئے بیگم کے حضور حاضر رہے، اپنے حکام اور خدام کو بیگم کی مہمان نوازی کے لئے احکامات جاری کئے اور ان کے ملازمین کے وظیفے مقرر کر کے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو بیگم نے انہیں تین بیش قیمت ہیرے اور خلعت عطا کر کے رخصت کیا۔

راجا ہفتہ میں دو بار بیگم کے حضور حاضری دیتے تھے۔ جب نئی حویلی تعمیر ہو گئی تو بیگم اور ان کے وابستگان کو وہاں منتقل کروا دیا اور ان کے اخراجات کے لئے ایک ہزار روپیہ ماہانہ کا وظیفہ مقرر کرنے کی اجازت چاہی۔ بیگم نے راجا سے مستقل وظیفہ قبول کرنے سے معذرت کر دی، اپنی رعایا کے راجا سے وظیفہ قبول کرنا وہ اپنے مرتبہ اور شان کے منافی سمجھتی تھیں۔ راجا رنجیت دیو ان کے خاندان اور ان کی صوبیداری کے وقت ان کیا تحت ہوتا تھا اس لئے ان کی رعایا تھا۔

آدینہ بیگ نے جس حکمرانی کے لئے عمر بھر جدوجہد کی تھی اس پر وہ صرف پانچ ماہ فائز رہ سکا اور چند روز بیمار رہ کر بٹالہ میں انتقال کر گیا۔ ان پانچ ماہ میں اس نے سکھوں کی شورش دبانے میں جو کامیابیاں حاصل کی تھیں، دربار شہنشاہیت سے ان کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ظفر جنگ کا خطاب عطا کیا گیا تھا اور انہیں مغل شہنشاہ کے ماتحت ایک خودمختار حکمران تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کی اچانک موت پر مسلمانان پنجاب نے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور سکھوں نے خوشیاں منائیں۔ آدینہ بیگ نے جنگلوں اور پہاڑوں میں سکھوں کا تعاقب کر کے انہیں تہ تیغ کرنا شروع کر دیا تھا۔

آدینہ بیگ کی اچانک موت پر مغلانی بیگم نے خوشی محسوس کی تھی لیکن چند روز کے بعد ہی اسے محسوس ہوا کہ اب وہ بٹالہ میں بھی نہیں رہ سکے گی۔ پنجاب کا حکمران اب خواجہ مرزا خان تھا اور وہ انہیں اپنی حکمرانی کی حدود میں دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔ شاہجہان آباد میں ان کے داماد عماد الملک خودمختار وزیراعظم تھے مگر دربار اور شہر کے امراء بیگم کے شدید مخالف تھے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے وقت اس نے ان امراء پر جو سختیاں کروائی تھیں وہ خود اسے بھی یاد تھیں۔ اسے یقین تھا کہ احمد شاہ ابدالی ایک بار پھر ہندوستان آئے گا اور خواجہ مرزا خان کے علاوہ عماد الملک کو بھی اس کے غضب کا نشانہ بننا ہو گا اس لئے وہ کسی ایسے حکمران کے ہاں قیام نہیں کرنا چاہتی تھی جس سے ابدالی ناراض ہو۔ ان سارے پہلوؤں پر غور کر کے اس نے بٹالہ سے جموں منتقل ہو جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کی طرف سے دوآبہ اور جموں کشمیر عطا ہونے کے بعد بیگم نے جموں کی حکمرانی کے لئے اسی رنجیت دیو کو سندِ حکمرانی ارسال کی تھی اور اب بھی اسے

اپنی رعایا سمجھتی تھی۔

شاہجہان آباد سرہند اور لاہور کے حکمرانوں کے معتوب اور مفرور مغل اور ترک امراء اور شرفاء کی بہت بڑی تعداد جموں میں پناہ گزین تھی اور وہاں ان کی ایک الگ بستی مغلپورہ کے نام سے آباد ہو چکی تھی۔ بیگم اور ان کے خاندان کی رعایا کے یہ پناہ گزین امراء ان کی ڈیوڑھی پر حاضری کے لئے آنے لگے۔ راجا رنجیت دیو کی مانند وہ بھی بیگم پر احمد شاہ ابدالی کی عنایات سے واقف تھے اور بیگم کے وسیلہ سے احمد شاہ ابدالی کی فوج اور دربار میں کوئی ملازمت اور مقام حاصل کرنے کی خواہشات پالنے لیتے تھے۔ رنجیت دیو بھی بیگم کی فطرت اور صلاحیتوں سے آگاہ تھا، اسے خوف تھا کہ بیگم احمد شاہ ابدالی سے اس کی شکایت نہ کر دے اس لئے وہ سارے ہی بیگم کو خوش کرنے اور اس سے بہتر تعلقات قائم کرنے کی کوشش میں لگ گئے۔

بیگم نے بھی ان کے ساتھ حاکمانہ سلوک جاری رکھا جو بھی کوئی نذرانہ پیش کرتا وہ اسے تحائف اور انعامات عطا کر کے رخصت کرتی۔ اس طرح جلد ہی ان کی دولت اور سخاوت کے چرچے پہاڑی ریاستوں سے ہوتے ہوئے سری نگر تک پہنچ گئے۔

چیت کا مہینہ شروع ہو چکا تھا لیکن شمال میں ہمالہ کی چوٹیوں پر ابھی تک برف قابض تھی۔ جس رات باد شمال چلتی دن سرد ہو جاتا اور بیگم کے لئے سردی ناقابل برداشت ہو جاتی۔ ایسی ہی ایک سرد صبح وہ انگیٹھی کے سامنے بیٹھی دیوان حافظ کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ وقار بیگم نے حاضری کی اجازت طلب کی، بیگم نے نگاہ اٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ اس کے چہرے پر جم گئی، اس کے پھول سے چہرے سے تازگی کی بہار رخصت ہوتی دکھائی دی۔ مغلانی بیگم کے اندر ماں جاگ اٹھی اس نے کھڑے ہو کر بیٹی کو سینے سے لگا کر پیشانی پر بوسہ دیا اور پاس بٹھا لیا۔ وہ خاموش تھی۔ ''جان مادر! آپ کے چہرے پر موسم کی تبدیلی کا آثار نہ پا کر ہمیں خوشی نہیں ہوئی''۔ بیگم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''مادر مکرم! حضور کی خوشی ہماری زندگی ہے، ہمیں افسوس ہے کہ باد شمال کا اثر ہم چھپا نہ سکے''۔ وقار بیگم نے سر جھکا کر جواب دیا۔

''باد شمال اور اس کے اثرات سب عارضی ہیں، بہت جلد کشمیر کا حسن نکھر آئے گا اور آپ خوش ہو جائیں گی''۔ بیگم بیٹی کا مطلب نہ سمجھ سکی۔

''مادر محترم! گستاخی کی معافی ہو تو کچھ عرض کریں؟'' بیٹی نے پوچھا۔

''ہم تو زندہ ہی آپ کے احکامات سننے کے لئے رہ رہے ہیں۔ فرمائیں، ہماری سماعت بے تاب ہے؟'' اس نے بیٹی کا سر گود میں لے لیا۔

''ہمیں کشمیر ہرگز پسند نہیں''۔ وقار بیگم نے انگیٹھی میں اٹھتے شعلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بہشت بروئے زمین دیکھے بغیر ہی مسترد کر دی۔ یہاں تو اس کی صرف ہوا آتی ہے، کشمیر تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ان سفید سر چوٹیوں کے دوسری طرف جہاں زعفران کے پھول آپ کے قدم چومنے کے لئے بے تاب ہیں''۔ بیگم نے اسے خوش کرنے کو کہا۔

''ہم اپنے میں پھولوں کو روندنے کی خاطر پتھروں سے پاؤں زخمی کرنے کا حوصلہ نہیں پاتے''۔ وقار بیگم نے جواب دیا۔

''ہم اپنے پاؤں پتھروں سے زخمی کریں گے تاکہ آپ پھولوں پر چل سکیں''۔ بیگم بیٹی کے جواب پر حیران سی رہ گئی۔

''ہم یہ درخواست لے کر آئے ہیں کہ حضور ہمیں

مانده کے وکیل کی درخواست قبول کرنے سے پہلے سری نگر کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لیں''۔ وقار بیگم نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

بیگم مسکرائی۔ ''ہمیں خوشی ہے کہ ہماری دختر عزیز بھی حالات کے بارے میں سوچنے لگی ہے''۔

''حضور کا کرم ہے کہ اس ناچیز کو اس قابل جانا گیا کہ وہ بھی اپنی رائے دے سکے''۔ وقار بیگم میں اعتماد آ گیا۔

''جب سکھ جیون رام کا پیامبر ہمارے حضور پیش ہوا تو ہم نے اس وقت بھی اپنی دختر عزیز سے رائے طلب کی تھی۔ اب آپ کے سوا ہمیں یہاں مشورہ دینے والا کوئی نہیں، آپ سے مشورہ یوں بھی لازم ہے کہ اب آپ نے ہمارا بوجھ بٹانا ہے''۔

''ہم سکھ جیون رام کے پیامبر کے خلوص پر یقین کرنے کے خلاف تھے''۔

''ہمیں سکھ جیون کے لگان کی ضرورت نہیں، اسے ہماری سرپرستی کی ضرورت ہے اس لئے یقین کرنے میں کوئی نقصان نہیں''۔

''سکھ جیون رام شاہ قندھار کا باغی ہے۔ حضور ایک باغی کی سرپرستی کر کے بادشاہ معظم کو ناراض کریں گی''۔ وقار بیگم نے ماں کو یاد دلانے کی کوشش کی کہ کشمیر کے راجا نے بھی ہوا کا رخ دیکھ کر قندھار سے آنکھیں پھیر لی ہیں''۔

''ہم اسے بادشاہ معظم کی اطاعت پر مجبور کر دیں گے، اب ان کی اطاعت اور خوشنودگی کے بغیر اس خطہ میں کوئی حکمران نہیں رہ سکے گا''۔ بیگم نے آنے والے حالات کی طرف اشارہ کیا۔

''اس کا مطلب ہے حضور نے حسن مانده کے وکیل کی درخواست مسترد کر دی ہے، ہمیں اس سے خوشی ہوگی''۔

''ہم نے حسن مانده کے وکیل کی درخواست بھی مسترد نہیں کی''۔

''ہم سنتے ہیں طہماس خان حضور سے یہ درخواست قبول کر لینے کی استدعا کر چکا ہے''۔

''آپ نے درست سنا''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''طہماس خان لالچی اور خودغرض خادم ہے، اس کی بات اور درخواست پر سوچ کر فیصلہ کرنا لازم ہے''۔

''دختر عزیز! اس کی بات سننا لازم ہے، باہر کے حالات اور رابطہ کے ذرائع محدود ہو چکے ہیں''۔ بیگم نے اپنی مجبوری بیان کی۔

''ہم سنتے ہیں کوتوال شہر سے اس کے مراسم بڑھ رہے ہیں، ہو سکتا رنجیت دیو حضور کو جموں سے کہیں اور بھیجنے کے لئے اس کو استعمال کر رہا ہو''۔ وقار بیگ نے خدشہ ظاہر کیا۔

''جموں سے کہیں اور جانے کا فیصلہ ہمیں خود کرنا ہے، کسی کی سازش ہمیں اس کے لئے مجبور نہیں کر سکتی''۔ بیگم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

جموں کے راجا رنجیت دیو نے بیگم کے گرد مخبروں کا جال پھیلا دیا تھا مگر احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے امکان کے پیش نظر وہ ایسا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے احمد شاہ ابدالی ناراض ہوں۔ سری نگر کے حاکم سکھ جیون رام کو خوف تھا کہ بیگم کشمیر پر حکمرانی کا دعویٰ نہ کر دیں۔ اس نے بیگم کے پاس ایک وفد بھیجا تھا اور تحائف اور لگان کا وعدہ کر کے درخواست کی تھی کہ بیگم سری نگر کا سفر اختیار نہ کریں۔ سکھ جیون رام کا وفد ابھی جموں میں مقیم تھا کہ سری نگر سے حسن مانده کا وکیل اس درخواست کے ساتھ حاضر ہوا کہ بیگم سری نگر کا سفر اختیار کریں۔ وکیل نے بتایا کہ حسن مانده نے بارہ ہزار فوج جمع کر رکھی ہے اور وہ سکھ جیون رام کو حاکمیت سے ہٹا کر بیگم کو حاکم کشمیر بنانا چاہتے ہیں، انہیں صرف بیگم کی سرپرستی کی

ضرورت ہے۔ کیونکہ احمد شاہ ابدالی نے کشمیر انہیں عنایت فرمایا تھا بیگم اس بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہ کر سکی تھی اور وقار بیگم اس کے فیصلہ پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میاں خوش فہم نے حسن ماندہ کے وکیل کی آمد کی اطلاع دی تو وقار بیگم سلام کر کے کمرے سے باہر چلی گئی بیگم گاؤ تکیہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے وکیل کی اس وقت آمد پسند نہیں آئی۔

وکیل میاں خوش فہم کی معیت میں کمرے میں داخل ہوا اور کورنش بجالا کر مؤدب کھڑا ہو گیا۔

بیگم نے آداب کا جواب دے کر اس کی طرف دیکھا، وہ سر جھکا کر اپنے قدموں پر نظریں جمائے آگے بڑھا اور سونے کی اشرفی نذرانہ پیش کی۔

بیگم نے نذرانہ قبول کر کے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''حضور عالیہ کا خادم جلد سری نگر پہنچنا چاہتا ہے اس کے آقا اور سری نگر کے امراء حضور کی آمد کے منتظر ہیں''۔ وکیل نے بات شروع کی۔

''ہماری طرف سے اپنے آقا کو آگاہ کر دیں کہ ہماری دعائیں ان کے ساتھ ہیں''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''کشمیر کے عوام حضور کی قدم بوسی کے لئے بے تاب ہیں''۔ وکیل نے عرض کیا۔

''ہم کشمیر کے عوام کی خوشحالی کے لئے دعا گو ہیں اور ان کی فلاح کے کسی کام سے اجتناب نہیں برتیں گے''۔ بیگم نے جواب دیا۔

''میرے آقا کی درخواست سری نگر کے امراء اور عوام کی طرف سے ہے اور وہ سب امید کرتے ہیں کہ حضور اسے شرف قبولیت بخشیں گے''۔

''ہمارے دل میں ان کے جذبات اور خواہشات کا بے حد احترام ہے مگر بعض وجوہ کی بناء پر ہم ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے''۔

''میرے آقا کے پاس فوج بھی ہے، وہ کئی ماہ سے سکھ جیون رام کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ انہیں صرف حضور کی شفقت اور سربراہی کی ضرورت ہے''۔

''ہم ان کی کامیابی کے لئے دعا گو ہیں وقت آنے پر ہم ان کے ساتھ ہوں گے''۔ بیگم اسے کوئی واضح جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔

بیگم کے جواب سے وکیل کوئی مطلب اخذ نہ کر سکا اس نے بیگم سے متعدد ملاقاتیں کی تھیں اور درخواست کی تھی کہ بیگم اس کے ہمراہ سری نگر کا سفر اختیار کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس نے کہا تھا کہ ان کے جانے سے حسن ماندہ سکھ جیون رام کو بھگا دیں گے اور وادی کے لوگ بیگم کی حکمرانی قبول کر لیں گے۔ احمد شاہ ابدالی کی طرف سے انہیں کشمیر عنایت کرنے کے بعد سے وہ اب تک انہیں ہی اپنی اصل حکمران سمجھتے ہیں۔

بیگم نہ تو انکار کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی اس کے ہمراہ جا سکتی تھی۔ وہ سری نگر کے امراء اور حسن ماندہ کی قوت پر وہ بھروسہ نہیں کر سکتی تھی اور جموں میں رہ کر حالات کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔

حسن ماندہ کے وکیل نے رخصتی سلام کیا اور نہایت مایوسی کے عالم میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

بیگم نے انگیٹھی کی طرف رخ کر کے پھر سے دیوان حافظ کی ورق گردانی شروع کر دی۔

اگلے روز بیگم نے اپنے دور حکومت کے بخشی غازی بیگ خاں کو طلب کیا وہ بھی ان دنوں جموں میں پناہ گزین تھا۔ بیگم اس سے پنجاب اور کشمیر کے حالات کے بارے میں تبادلہ خیال کرتی رہی۔ غازی بیگ جموں میں عافیت کی زندگی گزار رہا تھا اور ہر قسم کی سیاست اور سازش سے الگ رہنا چاہتا تھا۔ اس نے پنجاب میں

سکھوں کی بڑھتی ہوئی شورش کے بارے میں تو بتایا مگر سکھ جیون رام اور اس کے امراء کے باہمی تنازعہ کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی۔ بیگم جائزہ لینا چاہتی تھی کہ کسی مہم میں وہ اس کا ساتھ دے گا یا نہیں اس کی بات چیت سے اس کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی مہم جوئی کے لئے تیار نہیں۔

***

خواجہ مرزا خان کی شکست کی خبر سے بیگم کو بہت مسرت ہوئی تھی۔ آدینہ بیگ کی موت کے پندرہ روز کے اندر اندر افغان دستوں نے گکھڑوں کی مدد سے خواجہ مرزا خان اور سکھوں کی مشترکہ فوجوں کو گجرات کے قریب دو بار شکست دے کر مار بھگایا تھا لیکن احمد شاہ ابدالی کی اجازت کے بغیر انہوں نے دریا پار کر کے ان کا تعاقب نہیں کیا تھا۔ افغانوں اور گکھڑوں کے حملہ کے خوف سے خواجہ مرزا خان اور سکھ ایک بار پھر متحد ہو گئے تھے۔ اس اتحاد کا زیادہ فائدہ سکھوں کو ہوا تھا۔ شمالی پنجاب میں عملاً ان کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور خواجہ مرزا خان کا اقتدار اور اختیار لاہور شہر کی فصیل تک محدود ہو گیا تھا۔ خواجہ مرزا خان نے بیگم کو لاہور سے نکالا تھا، وہ خواجہ کے نکالے جانے کی دعائیں مانگنے لگی۔

بیگم کو اس خبر سے مسرت ہوئی تو دوسری طرف ان کے داماد عمادالملک وزیراعظم ہندوستان کے لئے یہ ایک بُری خبر تھی۔ آدینہ بیگ کی موت کے بعد وہ پنجاب کے لئے اپنا صوبیدار مقرر کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دکن سے مرہٹہ سالار فوجوں کے ساتھ شاہجہان آباد پہنچ گئے۔ ان کا کہنا تھا کہ آدینہ بیگ ان کا باجگزار تھا اس لئے پنجاب کا نیا حاکم وہ مقرر کریں گے۔ ابھی یہ جھگڑا جاری تھا کہ افغانوں کے ہاتھوں سکھوں اور خواجہ مرزا خان کی شکست کی خبر موصول ہوئی۔ مرہٹہ سالار نے عمادالملک سے پوچھے بغیر اپنی فوج کا ایک حصہ پنجاب بھیج دیا تاکہ وہ گکھڑوں کی شورش دبا کر افغان فوج کے بے قاعدہ دستوں کو لاہور کی طرف بڑھنے سے روکے رکھیں۔

مرہٹہ فوجیں ایک ہی ماہ میں پشاور تک پہنچ گئیں۔

ایک ماہ کی بات چیت کے بعد عمادالملک نے مرہٹہ سرداروں کو خلعت پیش کئے اور آٹھ لاکھ روپیہ دے کر اس طوفان کا رخ پنجاب کی طرف موڑ دیا ماچھی واڑہ کے مقام پر آدینہ بیگ کی بیوہ بھی مرہٹہ لشکرگاہ میں پہنچ گئی اور مرہٹہ سالار کو اشرفیوں کے توڑے اور ہیروں کی تھیلیاں پیش کر کے خوش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ اپنے داماد خواجہ مرزا خان کو لاہور کی حکومت پر برقرار رکھنے کی درخواست لے کر آئی تھی۔ مرہٹہ سالار نے اشرفیاں اور ہیرے شکریہ کے ساتھ قبول کر لئے مگر خواجہ مرزا خان کو حکومت پر برقرار رکھنے کا وعدہ نہیں کیا۔

عمادالملک نے مرہٹوں کو پنجاب سکھوں کی سرکشی دبانے اور افغانوں کے حملہ کے خوف سے روپیہ دیا تھا اور پنجاب کے لئے اپنی مرضی کا حاکم مقرر کرنے کا ان کا حق تسلیم کر لیا تھا۔

شاہجہان آباد سے روانگی سے پہلے ہی مرہٹہ فوجوں کے کماندار جنکوجی نے پشاور تک پھیلی اپنی افواج اور سرداروں اور لاہور پہنچ جانے کے احکامات بھیج دیئے۔

***

مرہٹہ سپاہی ایک سرخ و سفید شخص کو سیاہ گدھے پر سوار کر کے لاہور کی گلیوں اور بازاروں میں گھماتے پھر رہے تھے۔ جدھر سے یہ جلوس گزرتا تھا لوگ آگے بڑھ بڑھ کر گدھا سوار کے سر میں خاک ڈالتے تھے۔ اس کے سر منہ اور داڑھی پر غلاظت کی لیپ ہو گئی تھی۔ کپڑے پھٹ گئے تھے اور پاؤں سے جوتے کہیں گر گئے تھے۔ یہ شخص خواجہ سعید تھا خواجہ مرزا خان کا بھائی جو کل تک اہل

لاہور کی موت و حیات کا مالک سمجھا جاتا تھا اور جس کے نام کی دہشت سے لوگ کانپنا شروع کر دیا کرتے تھے۔

ملک سجاول نے دور سے خواجہ سعید کا جلوس آتے دیکھا اور ایک چھوٹی سی گلی میں مڑ گیا۔

مرہٹوں نے لاہور میں داخل ہوتے ہی خواجہ مرزا خان کو قلعہ کے ایک تاریک تہہ خانہ میں بند کر دیا تھا اور خواجہ سعید کو گدھے پر بٹھا کر اس کا جلوس بازاروں میں گھمانے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اہل شہر کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے مرہٹہ سالار نے خواجہ سعید کے مظالم کے بارے میں جان کر اسے یہ سزا دی تھی اہل شہر اس فیصلہ پر بہت خوش ہوئے۔

مرہٹہ سالار نے لاہور کے بعد ملتان کے لئے بھی اپنا ناظم مقرر کر دیا تھا جس سے پنجاب پر مرہٹوں کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔

لاہور کے علماء ایک بار پھر کوچہ ڈوگراں کے قریب نیتوں مسجد میں جمع ہو رہے تھے اور ملک سجاول ان کی مشاورت میں شرکت کے لئے جا رہا تھا۔

جلوس دیکھ کر خواجہ مرزا خان اور خواجہ سعید خان کی زندگیوں کے کئی مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئے مگر ان کی اس قدر ذلت اور رسوائی ہے اس کا دل بوجھل ہو گیا شاہجہان آباد سے واپسی کے سفر میں اسے بتایا گیا تھا کہ سکھوں نے آدینہ بیگ کی قبر کھود کر اس کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔ ''کیا یہ ہے آدینہ بیگ کی زندگی بھر کی کمائی؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

''ملت کے ساتھ جو بھی غداری کرتا ہے اس کا یہی انجام ہوتا ہے''۔ ایک شریک مشاورت نے آدینہ بیگ کی قبر اور خواجہ سعید کے جلوس کے بارے میں سن کر کہا۔

''میر منو تو ملت کا محسن تھا، اسے کس کے گناہوں کی سزا ملی؟'' ایک اور شریک مشاورت نے سوال اٹھایا۔

وہ سب لاجواب ہو گئے۔

ملک سجاول نے علماء کرام کو شاہجہان آباد کے حالات اور احمد شاہ ابدالی کے نام شاہ ولی اللہ اور دیگر علماء کے خطوط کے بارے میں بتایا تو ایک عالم نے پوچھا۔ ''ہندوستان کی مسلم ملت کب تک بیرونی مجاہدین کے جذبہ جہاد کی بدولت زندہ رہ سکے گی؟''

اس کا ملک سجاول کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

***

جموں شہر سے باہر مغلانی بیگم کے سپاہیوں کے ڈیرے پر رات اپنا قبضہ مستحکم کر چکی تھی۔ ڈیرہ کے درمیان میں نصب خیمہ کے پاس اونچے ستون پر شمع روشن تھی اور دور سے آنے والوں کو بیگم کی لشکر گاہ اور خیمہ کا پتہ دے رہی تھی۔ طہماس خان ابھی تک اپنے خیمہ میں جاگ رہا تھا، وہ دن بھر سری نگر پر چڑھائی کے لئے سوار پیادہ نقیب اور پہرہ نویس بھرتی کرتا رہا تھا۔ بیگم کی طرف سے سری نگر پر چڑھائی کی خبر سنتے ہی لوگ جوق در جوق بھرتی کے لئے آنا شروع ہو گئے تھے اور حسن مانده کا وکیل اور طہماس خان کئی روز سے فوج بھرتی کر رہے تھے اور ملازمین کے کوائف اور فہرستیں مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ ہر طرف بیگم کے فوج بھرتی کرنے اور سری نگر پر چڑھائی کے منصوبہ کا چرچا تھا اردگرد کے چھوٹے چھوٹے راجے اور حکمران ابھی سے بیگم کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے لگے تھے مگر رنجیت دیو کے لئے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ اگر بیگم کشمیر پر قابض ہو گئی اور احمد شاہ ابدالی کی جاری کردہ پرانی سند حکمرانی مان لی گئی تو اسے بھی اس کی حکمرانی قبول کرنا پڑے گی۔ بیگم کی طرف سے سری نگر کے سفر کا ارادہ ظاہر نہ کرنے پر حسن مانده کا وکیل واپس چلا گیا تھا مگر حسن مانده اس کے بعد بھی بیگم کے پاس درخواستیں بھیجتا رہا کہ بیگم سری نگر پہنچ کر سکھ جیون رام کو نکالنے کی مہم کی سرپرستی کریں اور حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ بیگم نے جب دیکھا

کہ پنجاب پر مرہٹوں کا قبضہ مستحکم ہو گیا ہے اور احمد شاہ ابدالی کے ان کے خلاف فوج کشی اور پنجاب پر قبضہ کا کوئی امکان نہیں تو اس نے حسن مانده کی درخواست قبول کر لی۔ حسن مانده نے سری نگر کے امراء کے مشورہ پر لکھا تھا کہ بیگم خود سری نگر کے سفر کی زحمت پسند نہیں کرتیں تو ان کے وکیل کے ہمراہ اپنے کسی نمائندہ کو چند سو سواروں کے ساتھ سری نگر بھیج دیا تا کہ وہ کشمیر کے عوام کو بتا سکیں کہ بیگم نے سکھ جیون رام کو نکال کر کشمیر پر خود حکومت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ان کے نمائندہ اور سواروں کو دیکھ کر وادی کے لوگ ان کی مہم میں شامل ہو جائیں گے۔

حسن مانده اور سری نگر کے امراء کی درخواست قبول کرنے کے بعد بیگم نے ایک بار پھر غازی بیگ خان کو طلب کیا اور اسے سری نگر میں اپنا نمائندہ مقرر کرنے کی پیشکش کی تھی مگر اس نے معذرت کر لی اور بتایا کہ اس کا ایک بھائی سکھ جیون رام کے دربار سے وابستہ ہے۔ اس لئے وہ سکھ جیون رام کے خلاف کسی مہم کی سربراہی اور بیگم کی طرف سے نمائندگی قبول نہیں کر سکتا۔ غازی بیگ خان کے انکار پر بیگم نے ابوتراب خان کو کشمیر میں اپنا نمائندہ مقرر کر دیا اس پر حسن مانده کے وکیل نے اعتراض کیا کہ ابوتراب خان کشمیری ہے اور کشمیر کے لوگ کسی کشمیری کو اپنا حکمران تسلیم نہیں کریں گے اس لئے کسی غیر کشمیری کو نمائندہ بنانا لازم ہے مجبوراً بیگم نے طہماس خان کو نامزد کر دیا اور وہ جموں سے باہر خیمہ اور جھنڈا گاڑھ کر فوج بھرتی کرنے لگا۔

سب سے پہلے حسن مانده کے وکیل نے خود طہماس خان کو نذر پیش کر کے بیگم کے نمائندہ کے طور پر تسلیم کیا اور پھر وہ دونوں لشکر اور سفر کی تیاریوں میں لگ گئے۔ لاہور سے بیگم کے ساتھ آنے والے ان کے ترک سوار بھی اپنے اپنے گھوڑوں اور تیر و تلوار کے ساتھ لشکرگاہ میں منتقل ہو گئے تھے۔

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، تمام لشکری اپنے اپنے خیموں میں سو چکے تھے کہ پہریدار گھوڑ کے قدموں کی آواز سن کر ہوشیار ہو گئے۔ آواز مستول سے لٹکتی شمع کی طرف بڑھ رہی تھی۔ انہوں نے نیزے اور تلواریں سنبھال لیں۔ گھوڑسوار سیدھا چلتا ہوا شمع کے نیچے آ کر رک گیا۔

”حکمرانی ابھی ملی نہیں اور سائل ابھی سے آنا شروع ہو گئے“۔ ایک پہریدار نے دوسرے سے کہا۔

”یہ مغلانی بیگم کی شمع ہے اور بیگم جہاں بھی ہو حکمران ہوتی ہے۔ سائل اور حاجتمند ان کے دروازے پر جمع رہتے ہیں“۔ دوسرے نے شمع کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر بیگم تو حویلی میں ہے اتنی رات گئے کوئی معصیبت کا مارا راستہ بھول گیا ہو گا“۔

”بیگم سے بڑا مصیبت کا مارا اور کون ہو سکتا ہے جو راستہ بھول کر جموں پہنچی اور اب آگے سری نگر جا رہی ہے“۔

وہ باتیں کرتے ہوئے شمع کی طرف چلنے لگے۔

لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی سوار نے گھوڑے کا رخ ان کی طرف کر دیا۔

اس نے سر پر دستار اور جسم پر ہتھیار سجا رکھے تھے اور چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا جیسے کسی واردات کے لئے آیا ہو۔

”رک جائیں“۔ پہریداروں نے حکم دیا۔

طہماس خان پہریدار کی آواز سن کر جلدی سے خیمے سے باہر آ گیا۔

سوار نے اسے دیکھتے ہی نقاب الٹ دی۔

طہماس خان نے آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔

”حضور! اس وقت آپ نے کیوں تکلیف اٹھائی، خادم کو

حکم بھجوادیا ہوتا''۔

''جلدی سے ہتھیار لگاؤ اور ہمارے ساتھ چلو''۔ سوار نے حکم دیا۔

طہماس خان نے گھوڑا منگوایا اور ہتھیار لگا کر سوار کے ساتھ چل دیا۔

حسن ماندہ کا وکیل اور پہریدار سب حیران رہ گئے۔

کسی کو بیگم کے بھیس بدل کر رات کے اندھیرے میں لشکرگاہ میں آنے اور طہماس خان کو ساتھ لے جانے کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

سورج کی ٹھٹھری ہوئی شعاعیں جموں کی ایک بستی کی چھتوں سے صحنوں میں اترنے کی کوشش کر رہی تھیں اور طہماس خان ایک دستہ کے ساتھ بستی کی گلیوں میں پیر کرم شاہ کے گھر کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا جس کسی سے پوچھتا وہ لاعلمی کا اظہار کر دیتا۔

''حیران ہوں کہ بیگم صاحبہ کے پیر کو یہاں کوئی جانتا ہی نہیں''۔ اس نے تھک کر اپنے ساتھی سے کہا۔

''کیا معلوم لوگ بیگم صاحبہ کو بھی جانتے ہیں یا نہیں''۔ ساتھی نے جواب دیا۔

ایک نوجوان کو آتا دیکھ کر وہ رک گئے۔ ''آپ مغلانی بیگم کو جانتے ہیں؟'' طہماس خان نے ساتھی کا شک دور کرنے کو پوچھا۔

''مغلانی بیگم کو کون نہیں جانتا، اب تو وہ کشمیر فتح کرنے جا رہی ہیں اور فوج بھرتی کرنے کو کیمپ لگا رکھا ہے''۔ نوجوان نے انہیں کہیں دور سے آئے ہوئے مسافر سمجھا۔

''اسی بستی میں رہتے ہو؟'' طہماس خان نے دوسرا سوال کیا۔

''جب سے پیدا ہوا ہوں یہیں پر رہ رہا ہوں''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

''پیر کرم شاہ کو جانتے ہو؟'' طہماس خان اپنے مطلب کی طرف آ گیا۔

''کون پیر کرم شاہ؟'' نوجوان نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

''مغلانی بیگم کا پیر کرم شاہ جو اسی بستی میں رہتا ہے''۔

''اس بستی میں تو کوئی چھوٹا موٹا پیر بھی نہیں رہتا، مغلانی بیگم کا پیر رہتا ہوتا تو سب ہی جانتے''۔ نوجوان نے اتنی ہی حیرانی سے جواب دیا۔

''اصل میں بیگم صاحبہ کے حضور ایک بزرگ پیش ہوئے تھے اور بتایا تھا کہ وہ اسی بستی میں رہتے ہیں''۔ طہماس خان نے وضاحت کی۔

''بیگم کو لوٹ تو نہیں لے گیا وہ پیر؟'' نوجوان نے سیدھا سوال کیا۔

''بیگم صاحب سے ایک گھوڑا اور زر نقد لایا تھا وہ، گھوڑے کو ذبح کر کے کچھ وظیفہ کرنا چاہتا تھا مگر ابھی تک واپس نہیں گیا''۔ طہماس خان نے اسے بتایا۔

''بیگم صاحبہ کے کرم سے اسے نجات مل گئی اور وہ دو رات پہلے کرایہ مکان اور قرض ادا کر کے گھوڑے پر سوار کہیں چلا گیا تھا''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

''وہ یہاں کا رہنے والا نہ تھا؟ کہاں گیا ہے کچھ معلوم ہو سکتا ہے؟'' طہماس خان نے ایک ہی سانس میں دو سوال پوچھ ڈالے۔

''نہ وہ یہاں کا تھا نہ کسی کو علم ہے کہاں گیا۔ ایک ماہ پہلے ادھر آیا تھا، مکان کرایہ پر لیا اور دیگر بستیوں میں لوگوں کو دھوکہ دینے لگا اور دو روز پیشتر کہیں چلا گیا''۔ نوجوان نے تفصیل سے جواب دیا۔

وہ طہماس خان اور اس کے ساتھیوں کو اس مکان کے مالک کے پاس لے گیا جس میں پیر کرم شاہ کی رہائش ہوتی تھی۔ مالک نے بھی اس کے فرار کی تصدیق

کر دی اور بتایا کہ بستی والوں کو اس نے اپنا نام ملاں کا ملی بتا رکھا تھا اور باہر لوگوں کو مختلف نام بتایا کرتا تھا۔

حویلی پہنچ کر طہماس خان نے بیگم کو پیر کرم شاہ کے فرار کی خبر سنائی تو وہ طیش میں آ گئی اور ان سب خدام کو طلب کر کے زدوکوب کروایا جو پیر کرم شاہ کو ان کے پاس لائے تھے اور اس کی کرامات کا ذکر کر کے انہیں پیر سے فتح کا وظیفہ کرانے پر راضی کیا تھا۔

بیگم نے پیر کرم شاہ کو گھوڑا اور دو ہزار روپیہ نقد دیا تھا تاکہ وہ وظیفہ کے لئے خوشبویات خرید سکے اور وظیفہ پڑھنے والے شاگرد پیشہ کو معاوضہ ادا کر سکے۔

پیر کرم شاہ کے ہاتھوں بیگم کے لٹنے کی خبر لشکر گاہ میں پہنچی تو نئے بھرتی شدہ سواروں نے تنخواہوں کا مطالبہ شروع کر دیا اور کہا کہ جب تک انہیں پوری تنخواہ اور زادِ سفر ادا نہ کیا جائے وہ سری نگر کی مہم میں شامل نہیں ہوں گے۔

شاہانہ زندگی دو صد ملازمین کے اخراجات اور تنخواہوں کی وجہ سے بیگم کی مالی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ ساری فوج کو فوری ادائیگی کے لئے اس کے پاس رقم نہ تھی اور جموں کا کوئی ساہوکار اسے قرض دینے پر تیار نہ تھا۔ حسن ماندہ کا وکیل بھی اس صورت حال سے پریشان ہو گیا۔ دو روز تک تنخواہ کی ادائیگی کا انتظار کرنے کے بعد بیشتر سوار اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے مگر کچھ ملازمین سواروں کے ساتھ بیگم کے حضور پیش ہوئے اور فوری طور پر تمام بقایاجات کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ بیگم کے انکار پر ایک سوار نے آگے بڑھ کر بیگم کو تھپڑ رسید کیا، دوسرے نے چابک اور تیسرے نے بیگم کو زمین پر لٹا کر گلے پر چھری رکھ دی۔

''آپ کا مطالبہ بجا ہے، ہم ابھی اپنے جواہرات بیچ کر تمہیں ادائیگی کروا دیتے ہیں''۔ بیگم نے چھری کے نیچے سے جواب دیا۔

ڈیوڑھی پر جمع سواروں نے بیگم کو رہائی دلائی اور بیگم کے وعدہ پر یقین کر کے سب الگ ہو کر بیٹھ گئے۔

بیگم نے مکان کی چھت پر چڑھ کر شور مچا دیا، اردگرد کے لوگ جمع ہو گئے، حملہ کرنے والے کچھ بھاگ گئے، کچھ کو لوگوں نے پکڑ لیا۔

پیر کے ہاتھوں لٹنے کے بعد اس توہین کا صدمہ بیگم کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ کوتوال کے دستے مدد کو پہنچے تو بیگم نے ملزموں کو ان کے حوالے کر دیا۔ سواروں کو بغاوت پر آمادہ کرنے اور انہیں قتل کرانے کی کوشش کے الزام میں بیگم نے طہماس خان کو بھی گرفتار کروا دیا۔

کوتوال نے ان سب کے بازو پشت پر باندھ کر انہیں اندھے کنویں میں لٹکا دیا۔

بیگم کو علم ہوا تو وہ خود سوار ہو کر کوتوال کے پاس گئیں اور اپنے ملازمین کو اندھے کنویں میں سے نکلوایا۔

فوج کی بھرتی کے مرحلہ میں ہی اس بغاوت کی وجہ سے تمام لشکر منتشر ہو گیا۔

حسن ماندہ کا وکیل ایک بار پھر ناکام واپس لوٹ گیا۔

اور بیگم کا کشمیر فتح کرنے کا منصوبہ ادھورا رہ گیا۔

اس ناکامی سے بیگم کی شہرت کو بہت نقصان پہنچا لیکن جموں میں مقیم ترک اور مغل امراء اب بھی ان کے حضور حاضری دیتے تھے کیونکہ احمد شاہ ابدالی کی ایک بار پھر ہندوستان پر فوج کشی کی تیاریوں کی خبریں آنے لگی تھیں۔ جموں کا راجا رنجیت دیو بھی حالات کے تیور دیکھ کر پھر سے بیگم کو خوش رکھنے کی کوششوں میں لگ گیا۔

بیگم خاموشی سے حالات کا اندازہ کرنے لگی۔ اب اس کے لئے سب سے اہم مسئلہ وقار بیگم کی شادی کا تھا۔ ان حالات میں ان کی مالی اور سیاسی حالت اس قابل نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے خاندان کے مقام و مرتبہ کے

مطابق بیٹی کے نکاح کا انتظام کر سکے۔

وزیراعظم ہندوستان عمادالملک نے اسے کئی مراسلے بھیجے کہ وہ شاہجہان آباد آ جائیں مگر وہ ایسا کوئی اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی جو احمد شاہ ابدالی کو پسند نہ ہو۔ جب بیٹی اور داماد کا اصرار بڑھ گیا تو اس نے دوصد سواروں کا قافلہ تیار کر کے وقار بیگم کو شاہجہان آباد بھیج دیا، وہ اب جموں میں اکیلی تھی۔ طہماس خان کو وقار بیگم کے قافلہ کے ساتھ شاہجہان آباد بھیج دیا تھا۔ مالی مشکلات کی وجہ سے متعدد ملازمین برخاست کر چکی تھی اور دن بھر بیٹھی سوچتی رہتی تھی اور حالات کی ڈور اپنے ہاتھوں سے کھسکتی ہوئی محسوس کرنے لگی تھی۔

ہندوستان کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے خوف سے شاہجہان آباد کے علماء کے علاوہ جے پور اور مارواڑ کے راجپوت راجے بھی پریشان تھے۔ انہوں نے بھی احمد شاہ ابدالی کو مراسلے لکھے تھے اور اپنی طرف سے فرمانبرداری کا یقین دلا کر مرہٹوں اور عمادالملک کے خلاف فوج کشی کی درخواستیں بھیجی تھیں۔ جموں میں مقیم امراء کے ذریعے بیگم کو سب خبریں پہنچ رہی تھیں مگر وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ مرہٹوں کا اتحادی عمادالملک اس کا داماد تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس بار وہ اسے ابدالی سے معافی نہیں دلا سکے گی۔ عمادالملک نے احمد شاہ ابدالی سے کئے تمام معاہدوں اور وعدوں کی خلاف ورزی کی تھی۔ مرہٹوں کو پنجاب پر قبضہ میں مدد دینے کا جرم بہت سنگین تھا جسے ابدالی معاف نہیں کر سکتا تھا۔

***

شاہجہان آباد کے افق پر امید اور دکھ کے گہرے ہوتے ہوئے سائے مغلانی بیگم کے آنگن میں اتر آئے۔ پہلے تراوڑی کے میدان میں جہان خان کے ہاتھوں عمادالملک اور مرہٹوں کی شکست کی خبر ملی۔ دو روز بعد شہنشاہ عالمگیر ثانی کی برہنہ لاش کوٹلہ کے ویرانے میں پڑی پائی گئی۔ اس قتل کا شبہ بھی عمادالملک پر کیا جانے لگا۔ عمادالملک نے شہنشاہ کے دو بیٹوں کو قلعہ معلیٰ میں نظر بند کر رکھا تھا۔ حکومت کے معاملات میں شہنشاہ کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ مغلانی بیگم کی مدد سے وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کے وقت اس نے احمد شاہ ابدالی سے نیک چلنی کے جو وعدے کئے تھے ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا تھا۔ اس کی خودسری اور خودمختاری دیکھ کر شہنشاہ عالمگیر ثانی نے خود احمد شاہ ابدالی کو خفیہ خطوط لکھ کر مدد کی درخواست کی تھی اور خدشہ ظاہر کیا تھا کہ عمادالملک انہیں اور ان کے بیٹوں کو قتل کروا دے گا۔ ان کا ایک خدشہ پورا ہو گیا تو اہل قلعہ ان کے نظر بند بیٹوں کی زندگیوں کے بارے میں خوفزدہ ہو گئے۔ بیگم کے لئے یہ صورت احوال بہت پریشان کن تھی۔

احمد شاہ ابدالی کے درہ بولان کے راستے ہندوستان میں داخل ہونے کی خبر سنتے ہی مغلانی بیگم جموں سے شاہجہان آباد پہنچ گئی تھیں۔ سامان اور خدام کی ترتیب سے فارغ ہوتے ہی وہ مغل دارالحکومت کی خبروں کے حصول میں لگ گئی۔ ان خبروں کے تجزیہ سے جو تصویر بنتی تھی وہ اس کے اور عمادالملک کے مستقبل کے بارے میں پریشان کن تھی۔ شاہجہان آباد کے علماء پہلے سے بھی زیادہ عمادالملک کے خلاف تھے اور اسے مسلمانوں کا دشمن اور مرہٹوں کا ایجنٹ سمجھتے تھے جس کی رضا اور مدد سے مرہٹوں نے عملاً مغلیہ سلطنت پر قبضہ کر لیا تھا اور علماء کا خدشہ پورا کر دیا تھا وہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے مقابلہ کے لئے مرہٹوں کی فوجیں لے آیا تھا۔ اس طرح اس نے وہ سارے الزامات درست ثابت کر دیئے تھے جو علماء اور شہنشاہ اس پر لگاتے رہے تھے۔ مغلانی بیگم کو اندازہ تھا کہ مرہٹے افغانوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ابدالی کی فوجوں کے ہندوستان میں

داخل ہونے کی خبر سنتے ہی پشاور، لاہور اور ملتان پر قابض مرہٹہ سالار اور عمال بھاگ کر شاہجہان آباد واپس آ چکے تھے۔ بیگم نے عمادالملک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ مرہٹوں کا ساتھ چھوڑ دے اور ابدالی سے ایک بار پھر معافی کی درخواست کر کے اس کے ساتھ مل جائے مگر اس نے بیگم کے مشورہ پر عمل کرنے کی بجائے اپنے بیوی بچے سورج مل کے ہاں بھیج دیئے اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر ابدالی کی فوجوں سے لڑنے چل پڑا تھا۔

اسے مرہٹوں کی قوت پر بہت اعتماد تھا۔

شہنشاہ عالمگیر ثانی کو قتل کس نے کیا؟ شاہجہان آباد میں قسم قسم کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔

"قتل جس نے بھی کیا مجرم عمادالملک کو ٹھہرایا جائے گا"۔ بیگم نے سنا تو تاسف سے کہا۔

شاہجہان آباد پہنچتے ہی بیگم نے عمادالملک اور اس کے ماموں خان خاناں انتظام الدولہ میں مفاہمت کی کوشش بھی کی تھی مگر اس میں بھی اسے ناکامی ہوئی تھی۔

شہنشاہ کے قتل کے اگلے روز انتظام الدولہ کو بھی قتل کر دیا گیا۔

مگر عمادالملک خود ابھی تک شاہجہان آباد نہیں پہنچا تھا۔

مغلانی بیگم نے وہ ساری رات جاگ کر گزاری، صبح مشرق میں طلوع ہوتا ہوا سورج اسے مغرب میں غروب ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ "اس اندھیرے میں ہمیں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی"۔ وہ کمرے میں بڑبڑاتی ہوئی ٹہل رہی تھی۔

کنیز نے پردہ ہٹا کر دیکھا وہ واپس جانے کو تھی کہ بیگم نے دیکھ لیا۔ "شہباز خان کو حاضر کریں"۔

کنیز آداب بجا لا کر باہر نکل گئی۔

"انتظام الدولہ کا قتل بھی عمادالملک کے نام لکھا جائے گا"۔ اس کی خود کلامی پس پردہ کنیز بھی سن رہی تھی۔ "عمادالملک کا اپنا انجام کیا ہوگا؟ کون جانے اس خاندان کے اقتدار کا سورج آخری منزل بھی مکمل کرنے والا ہے۔ عمادالملک سرابوں کا تعاقب کر رہا ہے"۔

کنیز نے شہباز خان کی حاضری کی درخواست پیش کی تو وہ تکیہ کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ شہباز خان نے فرشی سلام کیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

"ہم نے کہا تھا کہ ہم شہنشاہ اور انتظام الدولہ کے قتل کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں"۔ بیگم نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"حضور شاہجہان آباد کی ایک گلی کی افواہ دوسری گلی میں پہلی افواہ سے مختلف ہے۔ ایک بازار والوں نے زبانی کلامی جو قاتل پکڑے ہوتے ہیں وہ دوسرے بازار والوں سے مختلف ہوتے ہیں"۔

"ہم گلیوں اور بازاروں کی افواہوں اور قاتلوں کے بارے میں نہیں اصل قاتلوں کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں"۔ بیگم نے اسے بات مکمل کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔

"شاہجہان آباد اور قلعہ معلٰی میں کوئی بھی ان قاتلوں کی تلاش اور پہچان میں دلچسپی نہیں رکھتا، امراء، اور عمال سب اپنی اپنی جانوں کی فکر میں ہیں"۔ شہباز خان نے جواب دیا۔

"جس شہر میں ملک کے شہنشاہ کی لاش ویرانے میں پڑی رہے اور کوئی نہ جانے کس کی لاش ہے، قاتل کون ہے، دشمنی کیا تھی۔ جس ملک کے مرحوم وزیراعظم کا بیٹا جو خود بھی وزیراعظم رہ چکا تھا، قتل کر دیا جائے، وہاں کوئی بھی محفوظ نہیں"۔ مغلانی بیگم نے ایسے کہا جیسے وہ شہباز خان کی بات کا جواب نہیں اپنے آپ کو بتا رہی ہو۔ "جب بھی ہم تمہاری بے بسی دیکھتے ہیں ہمیں سرفراز خان یاد آتے ہیں"۔ اس نے شہباز خان کی طرف دیکھا۔

"حضور کے خادم کو اپنی نااہلیوں پر افسوس ہے"۔ شہباز خان نے شرمندگی سے جواب دیا۔

"طہماس خان کو ڈھونڈ کر پیش کرو"۔ بیگم نے حکم دیا۔

"حضور کا خادم میاں محبت کے ذریعے سے بھی معلوم کر چکا ہے۔ طہماس خاں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا"۔

"ہمارے سامنے اس حرام خور کا نام نہ لو۔ ہم نمک حرام میاں محبت اور اس فاختہ کی چمڑی اتروا کر اس میں بھس بھروا دیں گے"۔ بیگم کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔ شہباز خان سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

"ہماری نظروں کے سامنے سے دور ہو جاؤ، ہم سمجھتے ہیں تم کل کا سورج نہیں دیکھنا چاہتے"۔ بیگم غصہ سے چلائی۔

شہباز خان وہیں سجدہ میں گر گیا۔

"تم پاکیزہ فرش اپنی منحوس پیشانی سے پلید کرنے سے باز نہ آئے تو ہمیں جلاد کو بلانا پڑے گا"۔ وہ مزید غصہ سے چلائی۔

شہباز بلند آواز میں رونے لگا، وہ گھٹنوں کے بل چلتا ہوا آگے بڑھا اور بیگم کے قدموں میں سر رکھ کر معافی کی درخواست کرنے لگا۔

بیگم خاموش بیٹھی رہی، شہباز خان کو اپنے قدموں پر پڑا دیکھ کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہونا شروع ہو گیا۔

"حضور کے قدموں میں جان دینا غلام کی زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے"۔ وہ آہیں بھر رہا تھا۔

بیگم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ہم ایک ہی بار معاف کیا کرتے ہیں۔ طہماس خان کو ڈھونڈ کر پیش کرو، ہم یقین رکھتے ہیں تم ہم سے معافی کی درخواست کرنے سے بچنے کی کوشش کرو گے"۔

شہباز خان اٹھا اور الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

بیگم اسے جاتا دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

***

ملک سجاول اور ان کے ساتھیوں نے اپنے گھوڑوں کا رخ مقبرہ ہمایوں کی طرف موڑا تو شاہجہان آباد کے آسمانوں پر ایک دوسرے کا تعاقب کرتے امید اور ناامیدی کے بادلوں کے پیچھے چھپا سورج گھونگھٹ اٹھا کر ہلکا سا مسکرایا۔ ان کے گھوڑے تھکے تھکے دکھائی دیتے تھے جیسے کہیں بہت دور سے آئے ہوں۔ سورج دیوتا نے بھی اپنی رتھ کے گھوڑے کھول دیئے۔ وہ بیرونی پہریداروں کی ویران ڈیوڑھی کے سامنے گھوڑوں سے اتر آئے۔ ان کے ساتھیوں نے بھی گھوڑوں کی لگامیں ہاتھوں میں تھام لیں سواریاں وہیں باندھ کر وہ پیدل چلنے لگے۔ مقبرہ کے وسیع و عریض احاطہ کی قلعہ نما دیواروں میں مقیم خامشی شاید ان کے اعصاب پر اثر انداز ہونے لگی تھی۔ وہ سر جھکائے خاموش چلے جا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف لانوں میں دور تک پھیلی سوکھی گھاس نے اپنا سر ہلا کر حیرانی کا اظہار کیا۔ مزار کے سامنے وہ رک گئے۔ دونوں جانب دور تک محرابوں اور دروازوں کے پیچھے ابھی سے اندھیرا گہرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ انہی محرابوں میں سے کسی میں برہنہ شہنشاہ کو کفن پہنا کر سپرد کر دیا گیا تھا۔ وہ کس محراب کے سامنے فاتحہ کہیں اور کس قبر پر چادر چڑھائیں۔ ابھی وہ سوچ ہی رہے تھے کہ اندر سے ایک خادم برآمد ہوا۔ دن کے خاتمہ اور رات کے آغاز پر اتنے آدمیوں کو مزار کے سامنے دیکھ کر وہ کچھ حیران سا دکھائی دیتا تھا۔

"شہنشاہ عالمگیر مغفور کس محراب میں آرام فرما ہیں؟" خادم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی انہوں نے پوچھا۔

اس نے ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کیا اور خود بھی اس طرف چلنے لگا۔ محراب میں اندھیرا تھا، اس نے موم بتی جلائی، اس کے پیچھے چلتے ہوئے وہ سب قبر تک پہنچے۔ سنہری دھاگوں سے بنی چادر قبر پر چڑھا کر سب نے فاتحہ پڑھی اور اسی طرح خاموش چلتے ہوئے باہر آ گئے۔

سورج دیوتا اپنی خواب گاہ میں قدم رکھ چکا تھا۔ ملک سجاول نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور مقبرہ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا، اس کے ساتھی بھی پیچھے چل دیئے۔ چھت کی محراب میں بنے شہنشاہ ہندوستان ہمایوں کی قبر کے تعویذ کے سرہانے سوکھے پھول بکھرے تھے۔ ملک نے آگے بڑھ کر پھولوں کی پتیاں اٹھائیں۔ وہ دیر تک انہیں غور سے دیکھتا رہا اور پھر وہیں رکھ کر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ باہر آ کر اس نے گہرے ہوتے اندھیرے میں چاروں طرف پھیلے شاہجہان آباد کا سرسری نگاہ سے جائزہ لیا اور سیڑھیاں اترنے لگا۔ مقبرہ کا خادم کچھ فاصلہ پر ان کے پیچھے آ رہا تھا۔

''سردار! آپ نے پھول کی پتیاں جمع کیں اور پھر وہیں رکھ دیں''۔ خادم نے نیچے پہنچ کر کہا۔ ''عرش آشیانی کے مزار سے تو پھول کی ایک پتی گھر لے جانا بھی باعث برکت ہے۔ حضور اجازت دیں تو چند پتیاں پیش کروں؟''

''نہیں، شکریہ!'' ملک سجاول نے کہا اور ڈیوڑھی کی طرف چل دیئے۔

خادم سر جھکائے کھڑا دیکھتا رہا۔

''سردار ہلکا سا ہوا کا جھونکا ان سوکھی پتیوں کو پھر سے بکھیر دے گا''۔ ملک سجاول کے ایک ساتھی نے چلتے چلتے کہا۔

''ہم جو کچھ کر سکتے ہیں کرتے رہنا چاہئے''۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

''جس طرح کچھ لوگ مغل سلطنت کے بکھرے اجزاء کو اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں''۔ دوسرے ساتھی نے کہا۔

ملک سجاول نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش چلتا رہا۔

حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ سے متصل مسجد میں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر وہ باہر آئے تو محفل سماع کے لئے چٹائیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ کھلے میدان میں شمعیں روشن کر دی گئی تھیں۔ عقیدت مند اور درویش جمع تھے جو چٹائی بچھ جاتی وہ اس پر قابض ہو جاتے اور آنکھیں بند کر کے وظیفہ پڑھنا شروع کر دیتے۔

بستی نظام الدین کی گلیاں اور بازار ویران تھے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند ہو کر دروازے بند کر چکے تھے۔ اندھیری گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ بستی سے باہر آ گئے اور گھوڑوں کا رخ مدرسہ رحیمیہ کی طرف موڑ دیا۔

شہنشاہ ہندوستان کی برہنہ لاش چھ پہر جمنا کی ریت پر پڑی رہی تو مہدی علی خاں کشمیری نے اٹھوا کر ہمایوں کے مقبرہ میں دفن کروا دی تھی۔ شہنشاہ کا کوئی بیٹا اس کی نماز جنازہ میں شرکت نہ کر سکا تھا اور نہ ہی امرائے دربار اس کے جنازے کو کندھا دے سکے تھے۔ شہنشاہ کے دو بیٹے اور داماد عماد الملک کی حراست میں تھے اور تیسرا بیٹا اس سے جان بچا کر بنگلہ بھاگ گیا تھا۔ شاہجہان آباد کے امراء اور شرفاء اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جانیں بچاتے پھر رہے تھے۔ شہر میں کسی کے پاس نہ مقتول شہنشاہ کے لئے آنسو بہانے کے لئے وقت تھا نہ نئے شہنشاہ شہجہان ثانی کی تخت نشینی پر خوش ہونے کی فرصت تھی۔ ہر گھر اور آنگن میں دکھ اور ناامیدی کے سائے دراز ہو رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی کو شہنشاہ کی موت کی خبر پہنچی تو اس نے ملک سجاول کو اس کی قبر کے

لئے پھول اور چادر روسے سرشا جہان آباد بھیجا تھا۔ شہنشاہ عالمگیر ثانی اس کا سمدھی بھی تھا اور مظلوم بھی۔

ملک سجاول شہنشاہ ہند کی بے بسی اور موت کے ان واقعات کے بارے جتنا زیادہ سوچتا تھا، اتنا ہی مغلیہ سلطنت کے مستقبل کے بارے میں زیادہ مایوس ہو جاتا تھا۔

کسی افغان یا روہیلہ سردار کو چادر کے ساتھ بھیجنا ممکن نہ تھا کیونکہ شہر سے باہر مرہٹہ فوجیں خیمہ زن تھیں۔ شہر کے اندر کسی کی حکومت نہ تھی، نئے شہنشاہ کی حکومت قلعہ معلی کی دیواروں کے اندر خواجہ سراؤں تک ہی محدود تھی۔ قلعہ دار عماد الملک نے مقرر کیا تھا، وہ بھی اس کی رعایا نہیں کہا جا سکتا تھا۔

***

''ہم جاننا چاہتے ہیں کہ تم اور تمہارے ساتھی شہنشاہ کے قتل کی سازش میں کیوں شامل ہوئے؟''
مغلانی بیگم نے طہماس خان سے پوچھا جو سر جھکائے ان کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا۔ بیگم بہت ناراض معلوم ہوتی تھی۔

''حضور عالی کا کوئی خادم اس سازش میں شامل نہیں تھا''۔ طہماس خان نے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔

''کیا یہ درست نہیں کہ تم سب اس روز کوٹلہ میں موجود تھے اور شہنشاہ کے قتل کے بعد تم خواجہ سرا عنبر علی خاں کے ہمراہ قلعہ معلی گئے تھے اور وہاں نئی آنملت کی تخت نشینی کی تقریب میں شریک ہوئے تھے؟'' بیگم نے اپنے مخبروں کی فراہم کردہ تفاصیل اسے بتا دیں تاکہ وہ انکار نہ کر سکے۔

طہماس خان نے اندازہ کیا کہ بیگم کو دھوکہ دینا ممکن نہیں اس کا سر مزید جھک گیا تھا اور آواز حلق میں پھنس پھنس کر جاتی تھی۔ اس نے انکار کی بجائے اقرار کرنا شروع کر دیا۔ ''حضور کے کسی غلام نے شہنشاہ ہند

ان کے قتل اور منصوبہ سازی میں حصہ نہیں لیا انہوں نے جو کیا حضور نواب عمادالملک کے حکم پر کیا"۔

بیگم کو شبہ تھا اس قتل میں عمادالملک شامل ہوں گے اور اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح ان کا شبہ دور ہو جائے۔ طہماس خان سے عمادالملک کے حکم کا سن کر ان کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ "ہم جاننا چاہیں گے کہ نواب عمادالملک نے کیا حکم دیا تھا"۔

"حضور نواب عمادالملک نے حضور کے غلاموں کو حکم دیا تھا کہ وہ فیل نشین خواجہ سرا عنبر علی خاں کے ساتھ جائیں اور جو وہ حکم دیں اس کی تعمیل کریں۔" طہماس خان نے جواب دیا۔

"نمک حرام! تم ہمیں دھوکہ نہیں دے سکتے، ہم جانتے ہیں کہ نواب عمادالملک اس روز شاہجہان آباد میں نہیں تھے"۔ بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔

"حضور عالیہ بیگم! عمدہ بیگم کے حکم پر ہم نواب صاحب کے لشکر میں حاضر تھے"۔ طہماس خان نے اعتماد سے جواب دیا۔

"ہم سمجھتے ہیں نواب عمادالملک اس روز مرادآباد میں تھے"۔ بیگم کے سوالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے طہماس خان کے جواب پسند نہیں۔

"حضور کا فرمانا درست"۔ طہماس خان نے تسلیم کیا۔

"شہنشاہ معظم شاہجہان آباد میں قتل کیے گئے اور تمہیں مرادآباد پہنچنے کا حکم دیا گیا؟" وہ تفتیش سے اسے تھکانا چاہتی تھی۔

"حضور کا یہ غلام اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مرادآباد نواب حضور کی لشکرگاہ حاضر ہوا تو نواب حضور نے ہمیں خواجہ سرا عنبر علی خاں کے ہمراہ شاہجہان آباد کے لیے روانہ کر دیا۔ ہم ساری رات سفر کرتے رہے اور صبح شاہجہان آباد پہنچ گئے۔ یہاں پہنچتے ہی ہمیں کوٹلہ فیروز شاہ پہنچنے کا حکم دیا گیا اور بتایا گیا کہ شہنشاہ معظم قندھار سے آئے ایک بزرگ کے حضور حاضری دینے کوٹلہ گئے ہیں۔ ہم وہاں پہنچے تو ہمیں راستے کے دونوں طرف قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ جب شہنشاہ معظم بزرگ سے مل کر برآمد ہوں تو تم نے انہیں سلام کرنا ہے۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک سوار کوٹلہ سے باہر آیا اور خواجہ سرا کو ایک طرف لے جا کر اس سے کوئی بات کی خواجہ سرا فوراً ہمیں ساتھ لے کر قلعہ معلیٰ روانہ ہو گئے"۔ طہماس خان نے اس صبح اپنے وہاں موجود ہونے کی تفصیل بتا دی۔

"شہنشاہ معظم کے قتل کا تمہیں کب علم ہوا؟" بیگم کے سوال سے طہماس خان نے محسوس کیا کہ اس کی ناراضگی کم ہونے لگی ہے۔

"قلعہ معلیٰ کے دروازے پر قلعہ دار نے ہمیں قلعہ کے اندر جانے سے روک دیا۔ عنبر علی خاں نے اسے ایک طرف لے جا کر کچھ بات کی تو اس نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا، ہم سواریاں وہیں چھوڑ کر خواجہ سرا کے ہمراہ دیوان خاص کے سامنے پہنچے تو عنبر علی خاں نے ہمیں دیوان خاص کے دروازے پر پہرہ کی ڈیوٹی پر لگا دیا اور خود دیگر خواجہ سراؤں کے ہمراہ محل شاہی کی طرف چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد وہ شہزادہ محی الملت کے ہمراہ محل سے برآمد ہوئے تو نقار خانہ شاہی سے شہنشاہ کے برآمد ہونے کا نقارہ بلند ہوا۔ سب آداب کے لیے جھک گئے، وہ شہزادہ کو جلوس کی صورت میں تخت شہنشاہی تک لے گئے اور تاج پہنا کر شہنشاہ عالمگیر ثانی کے وضع کے ایک محل کی سیڑھیوں سے گر کر اچانک وفات پا جانے کا بتا کر محی الملت کے تخت نشین ہونے کا اعلان کر دیا گیا تب ہمیں معلوم ہوا کہ شہنشاہ معظم رحلت فرما گئے ہیں"۔

"اس کے بعد تم نے کیا دیکھا؟" بیگم کی ہچکی بندھ گئی۔

"خواجہ سرا، امراء اور درباریوں نے شہنشاہ کے حضور نذرانے گزارنا شروع کیا تو قلعہ معلی میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ نصف شب تک ہم وہاں رہے اور پھر اپنے گھروں کے لئے روانہ ہو گئے اور طلوع آفتاب کے بعد جب ہم خواجہ سرا عنبر علی خاں کے حضور حاضر ہوئے تو پتہ چلا کہ نواب انتظام الدولہ کو بھی قتل کر دیا گیا ہے۔ ہمیں حکم دیا گیا کہ [illegible] ساتھ نواب عماد الملک کی لشکرگاہ جاؤ۔ اس مجبوری سے ہمیں شاہجہان آباد سے باہر رہنا پڑا اور حضور کی قدم بوسی کے لئے حاضر نہ ہو سکے۔"

"نواب انتظام الدولہ کے قتل کی سازش میں عنبر علی خاں کا ہاتھ تھا؟" بیگم نے سوال کیا۔

"حضور کا یہ غلام اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" الماس خان نے شہباز خان کی طرف دیکھتے ہوئے دست بستہ عرض کیا۔

"حضور ارشاد فرمائیں تو غلام ایک شخص کو پیش کر سکتا ہے جس نے شہنشاہ معظم کو قتل ہوتے دیکھا تھا اور نواب انتظام الدولہ کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔" شہباز خان نے عرض کیا۔

مغلانی بیگم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہم اس کی حاضری سے خوش ہوں گے۔" بیگم نے حکم دیا۔

شہباز خان کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو چھوٹے قد کا ایک سیاہ فام نوجوان اس کے پیچھے سر جھکائے داخل ہوا۔ اس نے خاص انداز میں جھک کر سلام کیا اور آنکھیں اپنے پاؤں پر گاڑھ کر دست بستہ کھڑا ہو گیا۔ بیگم نے محسوس کیا کہ وہ درباری آداب سے اچھی طرح واقف ہے۔ نوجوان خاموش کھڑا رہا۔ بیگم نے اسے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "ہم جتا دینا چاہتے ہیں کہ جھوٹ کی سزا بہت سخت ہو گی۔"

"حضور کا یہ غلام جھوٹ بول کر مزید گنہگار نہیں ہونا چاہتا۔ خلد آشیانی اس خادم پر بہت مہربان رہتے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اپنے امراء اور مصاحبوں میں خلد آشیانی مہدی علی خاں کشمیری پر سب سے زیادہ شفقت فرماتے تھے۔ خلد آشیانی درویشوں اور بزرگوں سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔ مہدی علی خاں نے خبر دی کہ افغان لشکر کے ہمراہ ایک درویش قندھار سے شاہجہان آباد آئے ہیں اور کوٹلہ کے کھنڈرات میں چلہ کاٹ رہے ہیں اور بادشاہ قندھار ان درویش سے بہت عقیدت رکھتے ہیں۔ مہدی علی خاں کشمیری نے خلد آشیانی کو ان درویش کے حضور حاضر ہو کر اپنے اور اپنے بیٹوں کے لئے دعا کروانے کا مشورہ دیا تو خلد آشیانی آمادہ سفر ہو گئے اور اپنے داماد مرزا بابر اور چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر درویش کے حضور حاضر ہونے کے لئے قلعہ معلی سے برآمد ہوئے۔ کوٹلہ کے کھنڈرات کے ایک کونے میں ایک خستہ مکان کے سامنے پردہ لٹک رہا تھا اور دروازے کے سامنے چھ درویش مستی کی حالت میں بیٹھے ورد کر رہے تھے۔

شہنشاہ معظم نے سواری سے زمین پر قدم فرمایا تو مہدی علی خاں نے جھک کر حضور کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور حضور سے اپنی تلوار ان کے سپرد کرنے کی درخواست کی اور کہا کہ سائیں درویش کے حضور تلوار لے کر پیش نہیں ہو سکتے۔ مہدی علی خاں نے پردہ اٹھایا شہنشاہ معظم اندر تشریف لے گئے۔ مہدی علی خاں نے مکان کا دروازہ مقفل کر کے پردہ گرا دیا۔ مرزا بابر کو شبہ گزرا وہ تلوار لہراتے دروازے کی طرف دوڑے۔ دروازے کے پاس ورد کرنے والے درویشوں نے ان کو روکنا چاہا تو مرزا نے دو تین کو وہیں گرا دیا اور ان کی تلوار اور ہتھیار چھین کر مشکیں کس دیں اور پہلے سے وہاں موجود [illegible]

گڑھ کے قلعہ کی شاہی جیل کی طرف روانہ کر دیا۔ چند منٹ بعد مکان کے اندر پہلے سے موجود مہدی علی خاں کے آدمیوں نے شہنشاہ معظم کی لاش باہر پھینک دی''۔

نوجوان کی باتیں سن کر بیگم کے چہرے پر دکھ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ ''نواب انتظام الدولہ کو کس نے قتل کیا؟'' بیگم نے اس سے پوچھا۔

''مہدی علی خاں کاشمیری نے''۔ نوجوان نے جواب دیا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''چونکہ حضور کا یہ غلام اس ہلاکت میں شامل نہیں ہوا''۔

بیگم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم ہلاکت میں شامل نہ ہوئے تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ انہیں کس نے قتل کیا؟''

''شہنشاہ معظم اس غلام پر بہت شفقت فرماتے تھے جب انہوں نے درویش کے حضور حاضری کا فیصلہ کیا تو یہ غلام وہاں موجود تھا اور حضور کے جلو میں کے ساتھ کوٹلہ گیا تھا۔ خلد آشیانی کو اس مکان میں داخل ہوتے اور ان کی لاش باہر پھینکتے خود دیکھا تھا جب نواب حضور کے قتل کے ارادہ کا علم ہوا تو اس غلام نے نواب حضور کی جان بچانے کی کوشش کی مگر کچھ نہ کر سکا''۔ نوجوان نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں چھپالیں۔

بیگم غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی، جب وہ آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھا کر پھر اپنے قدموں کی طرف دیکھنے لگا تو اس نے پوچھا۔ ''نواب انتظام الدولہ حراست میں تھے، تم نے کیسے کوشش کی انہیں بچانے کی؟''

''رات گزرنے والی تھی، نواب مرحوم کے کمرے پر پہرہ دینے والے حضور کے اس غلام کے دوست اور ساتھی تھے۔ میں نے انہیں خبردار کر دیا اور کہا کہ قتل کے مجرم وہ ٹھہریں گے۔ وہ نواب کو وہاں سے نکال کر کہیں اور چھپانے پر آمادہ ہو گئے مگر ان کے ایسا کرنے سے پہلے عنبر علی خاں اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ نواب صاحب کو ہلاک کرنے کے بعد وہ اس خاکسار کو بھی قتل کر دیتے زندگی کے دن باقی تھے، میں ہنگامہ میں وہاں سے نکل کر چھپ گیا۔ اس روز سے چھپتا پھر رہا ہوں، کشمیر کے مخبر مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، نہیں معلوم کب تک زندہ رہوں گا''۔ وہ آہیں بھرنے لگا۔

بیگم نے میاں خوش فہم کو حکم دیا۔ ''اس نوجوان کو مردانہ میں لے جاؤ اور اس کی حفاظت کا اہتمام کرو، یہ ہمارے پاس رہے گا''۔

نوجوان کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو رواں ہو گئے۔ ''حضور نے اس غلام کو خرید لیا ہے''۔ اس نے فرشی سلام کیا۔

طہماس خان ابھی تک سامنے دست بستہ کھڑا تھا، اس کے چہرے پر رونق آ گئی، نوجوان نے جو کچھ بتایا بیگم اس پر مطمئن دکھائی دیتی تھی۔

میاں خوش فہم نوجوان کے ہمراہ کمرے سے باہر جانے کے لئے مڑا تو بیگم نے روک لیا۔ ''اس بدنصیب کی حفاظت کرو، اس نمک حرام کو قید میں ڈال دو''۔ اس نے طہماس خان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

طہماس خان کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا، وہ بیگم کے قدموں میں گر کر معافی کی درخواست کرنے لگا۔ یہ حکم کس جرم میں دیا جا رہا ہے؟ اسے کچھ معلوم نہ تھا اور وہ اپنا جرم پوچھنے کی گستاخی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ صرف رحم کی درخواست کر سکتا تھا۔

بیگم نے اس کی درخواست پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ میاں خوش فہم نے خدام کو بلایا اور وہ طہماس خان کو گھسیٹتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔

***

ماگھ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا، بادِ شمال کی سردی سے
شاہجہان آباد کے میدانی علاقے میں درجہ حرارت بہت
گر گیا تھا، احمد شاہ ابدالی کا لشکر دارالحکومت سے باہر لونی
میں خیمہ زن تھا، نجیب الدولہ اور ان کے ساتھ روہیلہ
سرداروں کی فوجوں نے شاہی لشکر گاہ کے قریب ڈیرے
جما لئے تھے۔ دوسری طرف مرہٹہ اور عماد الملک اپنی اپنی
فوجوں کے ساتھ ڈیرے ڈالے پڑے تھے اور قلعہ معلیٰ
میں نئے شہنشاہ شاہجہان ثانی اپنی شہنشاہیت کے چالیس
روز مکمل کر چکے تھے۔ قلعہ کی فصیلوں کے اندر عماد الملک
کے مقرر کردہ قلعہ دار کی حکومت تھی اور فصیلوں سے باہر
شہر پر کوئی حکمران نہ تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے
شاہجہان آباد کی طرف بڑھنے کی اطلاع ملنے پر بھرت
پور کے راجا سورج مل نے شہر کی حفاظت کے لئے جو فوج
بھیجی تھی شاہ کے جمنا عبور کرنے کی خبر پہنچتے ہی وہ
خاموشی سے واپس چلی گئی تھی۔

دونوں فوجوں کے درمیان براری گھاٹ کے پتن
پر مرہٹوں کا قبضہ تھا۔

مغلانی بیگم شاہجہان آباد سے لونی منتقل ہو گئی تھی،
اس کا ڈیرہ بادشاہ معظم کی خیمہ گاہ سے باہر شاہ ولی خاں
کی لشکر گاہ کی طرف تھا۔ بادشاہ معظم کے دریا پار اترنے
کے اگلے ہی روز وہ شاہی لشکر گاہ میں پہنچ گئی تھی، اس کی
آمد کی اطلاع پا کر بادشاہ معظم نے اپنے فوجی سرداروں
کو ان کے استقبال کے لئے بھیجا تھا اور ان کے ڈیرے
پر حفاظت اور خدمت کے لئے افغان خدام محافظ بھجوا
دیئے تھے۔ شاہ ولی خاں بیگم کے حضور حاضری دے چکا
تھا مگر وہ بادشاہ معظم کے حضور شرف باریابی سے ابھی
محروم تھی۔

احمد شاہ ابدالی مرہٹوں کے مقابلہ کے لئے
ہندوستان کے تمام مسلم صوبیداروں اور علاقائی حکمرانوں
کو متحد کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر اودھ کے شجاع الدولہ
اور بہار کے احمد خاں بنگش نے ابھی تک جہاد میں شامل
ہونے پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی۔ وہ مرہٹوں سے
مذاکرات میں مصروف تھے اور مسلمانوں کے اجتماعی مفاد
کی بجائے اپنے اپنے ذاتی مفادات کی شطرنج کی چالوں
پر غور کر رہے تھے۔

مغلانی بیگم عماد الملک کو مرہٹوں سے الگ کر کے
ابدالی کے کیمپ میں لانے کی خیمہ سفارت کاری میں
مصروف تھی۔ ”اگر عماد الملک بادشاہ معظم کے حضور حاضر
ہوں تو مرہٹوں کا ہندوستان پر حکومت کا خواب منتشر ہو
جائے گا“۔ بیگم نے ملک سجاول کو اپنا رازداں اور سفیر
بنانے کی خاطر اپنے منصوبہ سے آگاہ کیا۔ ”عماد الملک کی
حاضری کے بعد باقی مسلمان حکمران خود بخود بادشاہ کے
حضور پیش ہو جائیں گے اور سب کی قوت مل کر مرہٹہ
قوت کو ختم کر دے گی“۔

”حضور کا خیال بہت مناسب ہے لیکن مرہٹوں کو
عماد الملک نے بلایا ہے، وہ ان سے کیسے الگ ہو جائے
گا“۔ ملک سجاول نے جواب دیا۔

”اگر بادشاہ معظم اس کی خطا معاف فرمانے کا
یقین دلا دیں تو وہ لازماً ان کی قدم بوسی کے لئے حاضر
ہو جائے گا“۔ بیگم نے ملک سجاول کو اپنی آرزو سے آگاہ
کیا۔

”بادشاہ معظم نجیب الدولہ اور علمائے کرام کے
مشورہ اور تائید کے بغیر عماد الملک کو معاف نہیں فرمائیں
گے۔ شاہجہان آباد کے علماء اور روہیلہ سردار نواب
الملک کو مسلم ملت کا مجرم سمجھتے ہیں“۔ ملک سجاول نے کوئی
لگی لپٹی رکھے بغیر جواب دیا۔

”ہم اس سے اختلاف نہیں کرتے مگر عماد الملک
کی خطائیں معاف کر دینے میں ہندوستان کی ساری
مسلم ملت کا فائدہ ہے“۔ بیگم نے وضاحت کی۔

”بادشاہ معظم نواب عماد الملک کو معاف کرنے بھی

آزما چکے ہیں، اب شاید آزمانا پسند نہ فرمائیں۔ اس پر شہنشاہ عالمگیر ثانی اور نواب انتظام الدولہ کے قتل کا الزام بھی ہے۔ شہزادہ علی گوہر کے پیام رساں نے بادشاہ معظم کے حضور جو مراسلہ پیش کیا ہے اس میں شہزادہ نے نواب عمادالملک پر بہت سے الزامات لگائے ہیں اور بادشاہ معظم سے درخواست کی ہے کہ عمادالملک پر اعتبار نہ کیا جائے''۔

''عمادالملک ہمارا فرزند ہے مگر ہمیں ملت کا مفاد اس کی جان سے عزیز تر ہے۔ ہم ملت کے اکابرین اور علمائے کرام کی رائے کے خلاف نہیں جا سکتے''۔ بیگم نے جب دیکھا کہ ملک سجاول اس کے لئے کسی سفارت کاری پر آمادہ نہیں تو اس نے پانسہ پلٹ دیا۔

''حضور کا اپنا مفاد ملت کے مفاد سے وابستہ ہے۔ نواب عمادالملک اپنے اور حضور کے مفاد کو بھی نہ سمجھ سکا''۔

ملک سجاول کے جواب پر بیگم اپنے اور اپنے داماد کے مستقبل کے بارے میں گہری فکر میں ڈوب گئی۔

***

جمنا کے یخ پانی میں قدم جمانے کی کوشش میں رات کی سیاہی بھی یخ بستہ ہو گئی تھی۔ آسمان سے برسنے والی پانی کی دھاریں جمنا کے پانی سے ہم وجود ہونے سے پرسکون پانی میں لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ دریا کے دو دھاروں کے درمیان چھوٹے سے جزیرے پر اگے جنگلی درخت اور پودے ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑوں سے دوہرے ہو ہو جاتے تھے۔ ملک سجاول نے اپنا گھوڑا ایک مضبوط جھاڑی سے باندھ دیا، ملک قاسم اور اس کے ساتھی اپنے گھوڑوں کی لگامیں تھامے اس کے گرد کھڑے تھے۔ بارش کے پانی سے وہ سر سے پاؤں تک بھیگ چکے تھے۔

''اپنے اپنے گھوڑے باندھ کر جزیرے کی پوری لمبائی کا جائزہ لیں کہ دشمن کا کوئی دستہ تو کہیں چھپا ہوا نہیں''۔ ملک سجاول نے قاسم کو ہدایت کی۔ ان کے ساتھیوں نے گھنی جھاڑیوں کے اوپر چھوٹی سی ترپال ڈال کر اس کے آرام کے لئے جگہ بنائی اور تھیلے سے خشک کپڑے نکال کر پیش کئے۔

''سردار! دعا کریں صبح تک بارش اور طوفان ایسے ہی رہیں''۔ قاسم نے وداع ہوتے ہوئے کہا۔

اس کے ساتھیوں نے اس کی آواز سنی مگر رات کے اندھیرے میں مسکراہٹ نہ دیکھ سکے اور خود گھنے جنگل میں غائب ہو گئے۔

احمد شاہ ابدالی نے موسم کی سردی اور رات کی سیاہی کے پردہ میں دریا کے اس پار فوجیں اتارنے کی تیاری کر کے ملک سجاول کو جزیرہ پر قبضہ اور دریا کے دوسرے کنارے پر موجود مرہٹہ محافظوں پر شب خون مارنے والے دستے کی کمان سونپ دی تھی۔ راوی اور اس کے کناروں پر جنگل سے ان کی آشنائی کی وجہ سے ان کے ساتھیوں کی نسبت سے اس کام کے لئے اور کوئی بہتر نہ تھا۔ افغان دریاؤں اور دریائی جنگلوں کے سفر اور مزاج سے آگاہ نہ تھے اس لئے انہیں سب سے آخر میں عبور کرنا تھا۔ ملک سجاول کے دستے کے بعد نجیب الدولہ کی روہیلہ فوج کو دریا پار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

ملک سجاول گھنی جھاڑیوں میں بیٹھا واقعی بارش اور طوفان کی عمر درازی کی پرخلوص دعائیں مانگ رہا تھا۔ دریا کے مغربی کنارے پر مرہٹہ فوجوں کی موجودگی کی وجہ سے وہ شاہجہان آباد کی طرف آگے بڑھ کر بھرت پور کے راجا کو سزا نہیں دے سکتا تھا۔ مرہٹہ سردار آگے بڑھ کر لڑنے کی بجائے شاہ کے عقب میں رہ کر دکن سے مزید فوجوں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

ملک سجاول کے گرد اس کے مسلح ساتھی پہرہ دے رہے تھے۔ بجلی چمکتی تو ان کے نیزوں اور تلواروں کی چمک میں آنکھیں چندھیانا شروع ہو جاتیں۔

سیاہ رات میں جنگلی چیتے کی مانند گھنے جنگل اور جھاڑیوں میں راستہ بناتے دبے قدموں ملک قاسم کے ساتھی جزیرے کے دوسرے کنارے پہنچ کر جھاڑیوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے اور بجلی کے چمکنے کا انتظار کرنے لگے۔ ان کی اندھیرے پر جنگلوں سے آشنا آنکھیں ضرورت سے زیادہ کھلی تھیں۔ آج وہ شکاری نہیں دشمن کی تلاش میں تھے اور دریا عبور کرنے کے منصوبہ کی کامیابی کا دارومدار ان کی کامیابی پر تھا۔

قاسم نے اپنے ساتھیوں کو چار چار کی ٹولیوں میں جزیرہ کے کنارے کا جائزہ لینے بھیج دیا۔ "ہمارے پاس وقت بہت کم ہے"۔ اس نے انہیں رخصت کرتے وقت ہدایت کی۔

بجلی چمکتی تو دریا کے پانی کی سیاہ چادر کو آتشیں آری کی مانند چیرتی ہوئی گزر جاتی اور دریا پر دور تک روشنی پھیل جاتی لیکن دوسرے کنارے پر کسی کی موجودگی یا سرگرمی کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا ممکن نہ تھا۔ اس کے ساتھیوں نے واپس آ کر جزیرے کے مکمل طور پر محفوظ ہونے کی خبر دی تو اس نے سب کو مبارک دی اور کچھ ساتھیوں کو سردار کو آگاہ کرنے بھیج کر باقی ساتھیوں کے ہمراہ یخ بستہ پانی کے سینے سے چمٹ گیا۔ دریا کی لہریں طوفانی نہیں برساتی تھیں، تھوڑی دیر میں وہ دوسرے کنارے ٹھنڈی ریت پر لیٹے اپنے اردگرد کا جائزہ لے رہے تھے۔

گھاٹ کے محافظ مرہٹہ سردار سباجی کی لشکرگاہ دریا سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ بارش اور آندھی کے طوفان میں بھی اس کے خیمے کے سامنے اونچائی پر لٹکتی شمع کی روشنی لشکرگاہ کی نشاندہی کرنے کو کافی تھی۔ آسمانوں پر ڈیوٹی دینے والے فرشتوں نے گرج اور چمک سے ان کا کام آسان بنا دیا۔ دریا کے کنارہ سے لشکرگاہ تک انہیں کہیں کوئی محافظ دستہ دکھائی نہ دیا تو اس نے اپنے دو ساتھیوں کو واپس بھیج دیا اور باقی سب کنارے کے آگے ریت میں مورچے بنانے میں مصروف ہو گئے۔

صبح صادق کا اجالا پھیلنے سے پہلے نجیب الدولہ کی ساری فوج جزیرے پر پہنچ چکی تھی اور ملک سجاول اپنے دستہ کے ساتھ دریا کے اس پار ہنگامی صورت حال کے لئے تیاری مکمل کر چکے تھے۔ افغان فوج کے توپچی دو توپیں مناسب فاصلہ پر نصب کرنے میں مصروف تھے۔

بارش رک گئی، مرہٹہ لشکر کے ساتھ آنے والے برہمن صبح کا اجالا ہونے کے ساتھ ہاتھوں میں گڑویاں لئے جمنا کے پانی میں اشنان کے لئے لشکرگاہ سے برآمد ہوئے اور تھوڑی دور چل کر رک گئے۔ ان کے ساتھ آنے والے محافظوں نے دریا کے کنارے موجود سپاہیوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ "افغان..... افغان!" چلاتے لشکرگاہ کی طرف دوڑ پڑے۔

اس کے ساتھ ہی مرہٹہ لشکرگاہ میں طبل جنگ بجنے لگا۔

نجیب الدولہ کے روہیلہ سواروں نے اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے۔

احمد شاہ ابدالی بھی تہجد کی نماز کے بعد اپنے دستہ کے ساتھ جزیرے پر پہنچ گیا تھا۔ جب مرہٹہ لشکرگاہ میں طبل جنگ بلند ہوا تو وہ جنگلی جھاڑیوں پر ترپالیں تان کر بنائے گئے خیمہ شاہی میں فجر کی نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا اور افغان دستے دریا میں کودنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

نجیب الدولہ کے پیادہ دستے ابھی دریا میں ہی تھے کہ مرہٹہ سوار اور پیادہ جنگی ترتیب کے ساتھ لشکرگاہ سے باہر نکل آئے۔ چھاپہ مار جنگ کی تربیت اور تجربہ کی بناء پر مرہٹہ دستے بہت تھوڑے وقت میں ہتھیار لگا کر میدان اتر سکتے تھے۔

سورج نے جمنا کنارے لڑی جانے والی حق و باطل

کی لڑائی نظارہ کرنے کو بادلوں کا پردہ ہٹا کر دیکھا تو مرہٹہ سورماؤں کے نیزے اور برچھیاں چمکنے لگے۔ وہ قطاریں باندھے تیزی سے کنارہ دریا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ملک سجاول کے ساتھی اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ افغان توپچی گولے برسانے لگے تھے مگر مرہٹہ سوار آگے بڑھتے رہے۔ نجیب الدولہ کی کمان میں روہیلہ سوار اور پیادہ دریا کے کنارے قدم جما کر دائیں اور بائیں سے دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھنے لگے تو ملک سجاول پر دباؤ کم ہونا شروع ہو گیا۔ وہ مرہٹہ دستوں میں جا گھسے۔ مرہٹہ دستے پیچھے ہٹ رہے تھے کہ مرہٹہ فوجدار دتا جی اپنے لشکر کے ساتھ سپاہی کی مدد کو پہنچ گئے۔ ایک بار پھر لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا مرہٹوں کے تابڑتوڑ حملوں کی شدت سے روہیلہ سپاہی پیچھے ہٹنے لگے مگر پیچھے جمنا بہہ رہا تھا۔ جمنا کے درمیان جزیرے پر کھڑا احمد شاہ ابدالی لڑائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے توپچی جزیرے پر بھی توپیں نصب کر چکے تو مرہٹہ توپوں کا جواب توپیں دینے لگیں۔ مرہٹوں کا دباؤ مسلسل بڑھ رہا تھا۔ تلواریں، نیزے، برچھیاں، بندوقیں اور توپیں چل رہی تھیں۔ مرہٹہ سالار، سردار اور سوار بہت بہادری سے لڑ رہے تھے۔ احمد شاہ ابدالی نے توپچیوں کو مرہٹہ فوج کے عقب میں گولے پھینکنے کا حکم دیا کیونکہ مرہٹہ اور مسلمان ایک دوسرے کی لائنوں کے اندر تک گھس آئے تھے۔ بادشاہ کے حکم پر افغان دستے نجیب الدولہ کی مدد کے لئے آگے بڑھے تو پھر سے قطاریں درست ہونے لگیں۔ مرہٹہ سالار دتا جی لڑنے والوں میں سب سے آگے تھا، ایک افغان پیادے نے اس کے سر کا نشانہ لے کر فائر داغا تو گولی اس کی آنکھ کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ اپنے سالار کو گرتا دیکھ کر مرہٹوں نے اسے اٹھا لے جانے کی کوشش کی مگر افغانوں نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ سالار کی موت کے بعد مرہٹہ پسپا ہونا شروع ہو گئے۔ جب مرہٹہ فوجدار جنکو جی اپنے ریزرو دستوں کے ساتھ لڑائی کے میدان میں اترے تو مرہٹہ فوج پہلے ہی میدان سے بھاگنا شروع ہو چکی تھی۔ ملک سجاول کے ایک ساتھی کے وار سے جنکو جی کا بازو لٹک گیا، اس کے محافظ اسے کھینچ کر میدان جنگ سے نکال لے گئے۔ اس کے ساتھ ہی مرہٹہ سوار اور پیادہ جدھر کو راستہ ملا بھاگنا شروع ہو گئے۔

مسلمانوں نے چالیس میل تک بھاگتے ہوئے مرہٹہ پیادہ اور سواروں کا پیچھا کیا، میدان جنگ میں دور دور تک مرہٹوں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں جن میں دتا جی اور بہت سے دیگر مرہٹہ سرداروں کی لاشیں بھی تھیں۔

عمادالملک لڑائی میں مرہٹوں سے پیچھے تھا، بھاگتے وقت وہ اپنے مغل دستوں کے ساتھ سب سے آگے تھا مگر وہ شاہجہان آباد نہیں گیا اپنی فوج کے ہمراہ سورج مل جاٹ کے ہاں جا کر قلعہ بند ہو گیا۔

عشاء کی نماز کے بعد احمد شاہ ابدالی کے خیمہ خاص میں سب سے پہلے نجیب الدولہ نے شاہ کو دتا جی کا سر پیش کیا۔ اس کے بعد ملک سجاول نے چھوٹے قد کا ایک سیاہ رو نوجوان بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ ''یہ بہت باہمت نوجوان ہے، شدید بارش سردی میں اور طوفان میں یہ اکیلا دریا پار کر کے عمادالملک کے لئے حضور مغلانی بیگم کا مراسلہ لے کر گیا تھا''۔

نوجوان سر جھکائے کھڑا تھا۔

''مابدولت جاننا چاہتے ہیں کہ بیگم صاحبہ نے اپنے بیٹے کے لئے کیا پیغام بھیجا تھا''۔ بادشاہ نے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

نوجوان نے فرشی سلام کیا اور آنکھیں اور سر جھکا کر جواب دیا۔ ''ظل الٰہی کا غلام پیغام کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ حضور بیگم صاحبہ نے مہر بند مراسلہ دیا تھا جو اس غلام نے حضور نواب صاحب کو پہنچا دیا۔ انہوں نے جو مراسلہ دیا وہ حضور کے پاس ہے''۔ اس نے ملک

سجاول کی طرف اشارہ کیا۔

ملک نے مہر بند لفافہ ندیم خاص کو پیش کر دیا۔

''حضور کے حکم کے بعد جب ہم رات جزیرہ پر اترے تو مرہٹہ لشکر کی طرف سے یہ دریا عبور کر رہا تھا۔ قاسم نے پکڑ کر تلاشی لی تو اس کی صدری کے نیچے سے یہ مراسلہ ملا''۔

بادشاہ نے نوجوان کی طرف غور سے دیکھا۔

''مابدولت اس کی ہمت اور وفاداری کی قدر کرتے ہیں''۔

نوجوان کے چہرے پر چھائی مُردنی غائب ہونے لگی۔

ندیم خاص نے بادشاہ معظم کی اجازت سے مراسلہ چاک کر کے عرض بیگی باشی کی طرف بڑھا دیا۔

''مادر محترم کا ارشاد ہمارے لئے حکم شہنشاہی سے بڑھ کر ہے، ہم خدائے بزرگ کے شکر گزار ہیں کہ ہمیں حضور کی شفقت اور دعائیں میسر ہیں۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ حضور کے ارشاد پر عمل نہیں کر سکتے۔ بادشاہ معظم کے ارادہ مبارک کا ہمیں علم نہیں۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ تخت ہندوستان پر اپنے فرزند کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد نجیب الدولہ وزیراعظم ہندوستان ہوں گے۔ ہمارے لئے ایک ہی راستہ ہے کہ ہم مرہٹوں کی قوت کے ذریعے ہندوستان کی مغل شہنشاہیت کا تحفظ کریں۔ ہم حضور عالی کے شکر گزار ہیں اور حکم عدولی کے لئے معافی کے خواستگار ہیں۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ حضور مادرانہ شفقت سے ہمیں معاف فرما دیں گے''۔ عرض بیگی باشی نے بلند آواز میں مراسلہ پڑھ کر سنایا۔

بادشاہ کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا۔ ''مابدولت مغلانی بیگم کے مشورہ اور کوششوں پر خوش ہیں انہوں نے اپنے بدبخت اور بدفطرت فرزند کو وہی مشورہ دیا ہوگا جو ایک ماں کو دینا چاہئے''۔

''بیگم صاحبہ بادشاہ معظم کے حضور عماد الملک کے لئے معافی کی درخواست پیش کرنے کی بھی خواہش رکھتی ہیں''۔ ندیم خاص نے عرض کیا۔

''یہ درخواست گزارنا ان کا مادرانہ فرض ہے اور یہ درخواست نہ سننا ہمارا عادلانہ فرض۔ عماد الملک ہمارا نہیں مسلمانان ہند کا مجرم ہے، اسے ہم معاف نہیں کر سکتے''۔ احمد شاہ ابدالی نے جواب دیا۔

''مابدولت اس نوجوان کو انعام کے لائق سمجھتے ہیں''۔ بادشاہ معظم نے نوجوان کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا۔

''حضور کے ارشاد مبارک کی تعمیل اس غلام پر فرض ہے''۔ ندیم خاص نے نوجوان کو خیمہ شاہی سے باہر لے جانے اور انعام سے نوازنے کا حکم دیتے ہوئے کہا۔

نوجوان نے ملک سجاول کو بتا دیا تھا کہ وہ شہنشاہ عالمگیر ثانی کے اور انتظام الدولہ کے قتل کا عینی شاہد ہے مگر اس نے بادشاہ معظم کو اس بارے میں کچھ نہ بتایا۔

خادم نوجوان کو خیمہ شاہی سے باہر لے گیا۔

***

شاہجہان آباد کی گلیاں اور بازار ویران تھے، دکانیں بند تھیں اور خوفزدہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں بند تھے۔ براری گھاٹ کی فتح کے بعد بہت سے افغان سوار شاہجہان آباد میں داخل ہو کر لوٹ مار میں مصروف ہو گئے تھے۔ شہنشاہ ہندوستان شاہجہان ثانی قلعہ معلیٰ میں بند تھا۔ شہر میں نہ کوئی ناظم تھا، نہ نظم اور نہ حاکم۔ افغان سوار جس مکان اور حویلی کو چاہتے لوٹ لیتے تھے۔ بادشاہ معظم ابھی شہر سے دور تھے انہوں نے شہر میں امن کے تحفظ کے لئے سانچی باشی کو دستے بھیجنے کا حکم دیا تھا مگر شہر کا کوئی حاکم مقرر نہیں کیا تھا۔ امراء، شرفاء اور عام لوگ سب خوفزدہ تھے۔ افغان سوار اور پیادے ٹولیوں کی صورت میں شہر میں گھوم پھر رہے تھے اور جس گھر میں مال و متاع کا شبہ ہوتا تھا، اس میں گھس جاتے تھے۔

مغلانی بیگم نے ایک ہاتھی منگوایا، اپنا دستہ ساتھ لیا اور ہاتھی پر سوار شاہجہان آباد کی گلی گلی گھومنے لگی۔ وہ امراء اور شرفاء کے حرم اور بچوں کو ان کے گھروں اور حویلیوں سے نکال نکال کر اپنی اور اپنی خوشدامن سالار پوری بیگم کی حویلی میں جمع کر رہی تھی جن کی حفاظت کے لئے افغان دستے متعین کر دیئے گئے تھے۔ لڑائی کے دوسرے روز صبح ہی وہ شاہی لشکرگاہ سے شاہجہان آباد پہنچ گئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اپنے ملازمین اور خدام کے بال بچوں کو ان کے گھروں سے نکال کر اپنی حویلی میں جمع کیا اور پھر امراء اور شرفاء کے اہل خانہ کو محفوظ مقامات پر پہنچانے لگی۔ بیگم کی سواری دیکھ کر افغان پیادے اور سوار چھپ جاتے اور اہل شہر سکھ کی سانس لیتے۔ شہنشاہ ہندوستان کو بتایا گیا تو اس نے خصوصی ایلچی کے ہاتھ بیگم کے لئے تعریفی سند ارسال کی۔

ایک شام شہر کے معائنہ سے واپس آئی تو گل بنفشہ قدموں میں گر گئی۔ ''حضور کے احسانات کے بوجھ سے کنیز کے لئے سر اٹھانا دشوار ہے۔ اس کے بچوں پر کرم کر کے انہیں بھی اپنے احسانات سے ہمیشہ کے لئے غلام بنالیں''۔ اس کی آہیں سسکیوں میں بدل گئیں۔

''ہم نے اس پر احسان کیا، اس نے نمک حرامی کی ہماری کنیز کو چھپا کر جموں سے شاہجہان آباد لایا اور اس بدفطرت خواجہ سرا کے گھر پہنچا دیا۔ ہم اس کا یہ جرم معاف نہیں کر سکتے''۔ بیگم نے غصہ سے کہا۔

''حضور کی یہ کنیز طہماس خان کی صفائی دینے کا جرم نہیں کر سکتی۔ اپنے بچوں کی خاطر اسے معاف کر دینے کی درخواست لے کر آئی ہے۔ حضور نے اس کنیز کی کبھی کوئی درخواست مسترد نہیں کی۔ یہ درخواست قبول فرما کر اپنے کرم کی روایت جاری رکھیں''۔

طہماس خان کو قید کرنے کا حکم دے کر اس کے بیوی بچوں کی دیکھ بھال بیگم نے اپنے خواجہ سرا کے سپرد کر رکھی اور گل بنفشہ کو حاضری کے لئے ان کی حویلی میں آنے کی اجازت دینے سے سختی سے منع کر رکھا تھا مگر شاہی لشکرگاہ سے واپسی پر گل بنفشہ اور اس کے بچوں کو انہوں نے اپنی حویلی میں منگوالیا تھا۔

''ہم نے جس پر احسان کیا اس نے ہمیں دکھ دیا۔ اس نمک حرام پر سب سے زیادہ احسان کیا اس نے ہمیں سب سے زیادہ دکھ اور دھوکہ دیا اور فریب کاری سے اپنا جرم چھپایا۔ جموں سے قافلہ کے ساتھ آنے والے ہمارے خدام نے اسے بار بار بتایا کہ ہماری حویلی سے فرار ہونے والی کنیز اس قافلہ میں موجود ہے اور اس بدفطرت محبت کے پاس جا رہی ہے۔ ہمارے خدام نے اس کی تلاشی کا مشورہ دیا مگر اس نمک حرام نے کسی کا مشورہ نہ مانا اور اس فاحشہ کو اس کے عاشق خواجہ سرا کی حویلی پہنچا دیا، ہم اسے کبھی معاف نہیں کر سکتے''۔

گل بنفشہ نے اپنا دوپٹہ اتار کر بیگم کے پاؤں میں رکھ دیا۔ ''حضور نے اپنی کنیز کا سر ڈھانپا تھا، حضور کی خوشی کے لئے کنیز باقی زندگی ننگے سر گزارے گی''۔

بیگم جھکی اور دوپٹہ اٹھا کر گل بنفشہ کے سر پر ڈال دیا۔ ''ہم اپنے خاندان کی نیک نامی پر کسی کنیز کے ننگے سر کا داغ نہیں دیکھ سکتے''۔

گل بنفشہ نے سر پر دوپٹہ درست کیا اور بیگم کے قدموں میں گر گئی۔

بیگم نے طہماس خان کو قید سے رہا کرنے کا حکم دے دیا۔

***

اہل شاہجہان آباد احمد شاہ ابدالی کے منتظر رہے کہ وہ کب قلعہ معلی میں نزول فرما کر اپنے بیٹے کو ہندوستان کے تخت پر بٹھاتے ہیں۔ علمائے کرام نے ایک بار پھر ان سے درخواست کی کہ وہ ہندوستان میں قیام فرمائیں اور نامرد مغل شہنشاہیت ختم کر دیں۔ اختیار [illegible] مرہٹوں

کی قوت کا خاتمہ کر کے مسلمانوں اور مسلم سلطنت کا تحفظ کریں مگر بادشاہ اپنی فوج کے ساتھ شاہجہان آباد سے باہر مقیم رہے انہوں نے عمادالملک کے تخت تیموری پر بٹھائے شہنشاہ بحر و بر شاہجہان ثانی کے مقام و احترام کے منافی کوئی اقدام نہیں کیا۔ شہر میں امن وامان اور نظم کے قیام کے لئے بادشاہ نے ایک شاہجہانی افغان امیر کو صوبیدار مقرر کر دیا اور شہر کے پاس سے گزر کر پانچ میل جنوب میں خضرآباد کے مقام پر جا کر خیمے گاڑھ دیئے۔

صوبیدار یعقوب خان ساری رات شاہجہان آباد کی گلیوں اور بازاروں میں گشت کرتا رہا، اس نے شہر کے دروازوں پر مسلح دستے بٹھا دیئے تھے تاکہ کوئی افغان سپاہی شہر میں داخل نہ ہو۔ وہ دن کو لوگوں کی شکایت سنتا، امان کی بحالی کے اقدامات کرتا اور رات کو گلی گلی گھوم کر امن وحفاظت کے انتظامات کا جائزہ لیتا۔

ایک رات کے پچھلے پہر وہ اپنے دستہ کے ہمراہ نواب شولا پوری بیگم کی حویلی کے پاس سے گزر رہا تھا کہ حویلی میں شمعیں روشن نظر آئیں۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ نواب انتظام الدولہ کے قتل کے بعد سے نواب شولا پوری بیگم اور ان کی حویلی شاہجہان آباد میں عبرت کدہ بن چکی تھی۔

''یہ شمعیں کس لئے روشن ہیں؟'' اس نے اپنے دستہ کے سوار کو معلوم کرنے کا حکم دیا۔

اس نے واپس آ کر بتایا کہ بیگم صاحبہ کے خدام ہاتھیوں اور اونٹوں پر سامان لاد رہے ہیں۔

یعقوب خان نے اپنے سپاہی حویلی کے دروازہ پر متعین کر دیئے اور خود حویلی میں چلا گیا خدام صوبیدار کو اپنے درمیان میں دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ اس نے انہیں تسلی دی اور پوچھا کہ سامان سفر کیوں تیار کیا جا رہا ہے۔ خدام ہاتھیوں اور اونٹوں پر خیمے قناتیں اور فرش وغیرہ کے لئے ضروری سامان لاد رہے تھے۔ اس حویلی میں جتنی لشکر گاہ میں ڈیرہ جمانے کا سامان تو تھا مگر کسی لڑائی اور لشکر میں جانے اور وہاں پر ڈیرہ جمانے والا کوئی مرد باقی نہیں تھا۔ بوڑھی نواب شولا پوری بیگم عمر اور صدموں کے باعث اس قابل نہ تھیں کہ وہ کسی لشکر گاہ کا سفر کر سکیں۔

''مغلانی بیگم صاحبہ! بادشاہ معظم احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے ساتھ مل کر جہاد کے لئے جائیں گی''۔ قافلہ کی تیاری کی نگرانی کرنے والے خدام نے بتایا۔ ''انہوں نے سوار بھرتی کر لئے ہیں اور ہم ان کے لئے شاہ کی لشکر گاہ میں ڈیرہ قائم کرنے جا رہے ہیں''۔

صوبیدار کو خوشی ہوئی کہ مرہٹوں کے خلاف بادشاہ معظم کے جہاد میں مغلانی بیگم کی شرکت سے شاہجہان آباد کے امراء بھی شریک جہاد ہوں گے اور ہندوستان کے جو مسلمان صوبیدار اور حاکم ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکے کہ کس کا ساتھ دیں انہیں مرہٹوں کے خلاف جہاد میں شامل کرنا آسان ہو جائے گا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، ماگھ کی سردی عروج پر تھی، بیگم صاحبہ آرام فرما رہی تھیں۔ وہ واپس آ گیا۔

***

مدرسہ رحیمیہ کے طلباء اپنے حجروں سے باہر نکل آئے۔ نواب نجیب الدولہ اپنے روہیلہ سرداروں کے ہمراہ ولی اللہ کے حضور حاضری کے لئے آئے تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے تشخص اور مسلم حکومت کے تحفظ کے لئے شاہ ولی اللہ کی درخواست پر جو مسلمان امراء میدان جہاد میں نکلے تھے ان میں نجیب الدولہ سب سے نمایاں تھے۔ مرہٹے انہیں پورے ہندوستان میں مرہٹہ حکومت کے قیام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور سارے مسلمان اور ہندو راجوں اور حکمرانوں کو ان کے خلاف متحد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مرہٹوں نے نجیب الدولہ کو شاہجہان آباد سے نکال

کر گنگا کے کنارے ایک قلعہ میں کئی ماہ تک محصور رکھا تھا اور روہیلہ سردار حافظ رحمت اللہ کو پیش کش کی تھی کہ اگر وہ نجیب الدولہ کے خلاف ان کا ساتھ دے تو وہ ریاست روہیل کھنڈ کی حاکمیت ان کے حوالے کر دیں گے اور اس کے تحفظ کی ضمانت فراہم کریں گے۔ روہیلہ سردار نے اپنے نواب نجیب الدولہ کے خلاف مرہٹوں کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد کی اطلاع پر مرہٹے نجیب الدولہ کے قلعہ کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے تو سب روہیلہ سردار اپنی اپنی فوجوں کے ہمراہ احمد شاہ ابدالی کی فوجوں کے ساتھ جا شامل ہوئے تھے۔

اس وجہ سے شاہ ولی اللہ نجیب الدولہ اور ان کے روہیلہ سرداروں کے جذبہ اور خلوص کی بڑی قدر کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ کا میدان جہاد علمی تھا۔ مدرسہ رحیمیہ کے طلباء ان کے فلسفہ جہاد کے مبلغ تھے، وہ ابھی عملی جہاد میں شامل نہیں ہوئے تھے اس لئے پورے ہندوستان کے مرہٹہ قوت کے سامنے اکیلے ڈٹ جانے والے نجیب الدولہ اور ان کے ساتھی روہیلہ کے سرداروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے زبان اور قلم کے میدان میں جہاد والے سارے طلباء اور اساتذہ اپنے حجروں سے باہر آ گئے تھے۔

نجیب الدولہ کی چال میں پُر وقار انکساری تھی۔ لڑائی کے میدانوں اور تیغ و تفنگ کے سایہ میں زندگی گزارنے والا سردار سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ پیچھے اور دائیں بائیں دیگر روہیلہ سردار تھے۔ علمی اور قلمی جہاد کی رزم گاہ میں بھی سب نے تلواریں سجا رکھی تھیں۔

شاہ ولی اللہ کے حجرہ کے دروازہ پر انہوں نے تلواریں زمین پر رکھ دیں اور جوتے اتار کر حجرے میں داخل ہو گئے۔

طلباء اپنے اپنے حجروں میں واپس چلے گئے۔

شیخ الحدیث ملک سجاول سے مخاطب ہوئے۔

''عمل اور علم میں اوّلیت کسے حاصل ہے؟'' روہیلہ سرداروں کی آمد سے بے نیاز وہ اپنے حجرہ میں کسی نکتہ پر بحث کر رہے تھے۔

''علم عمل کو جنم دیتا ہے، اس کو جان لینے کے بعد اوّلیت کی بحث ختم ہو جانا چاہئے''۔ ملک نے جواب دیا۔

''تخلیق عمل ہے، علم اس کے بعد آیا''۔ شیخ نے اعتراض کیا۔

''مرحلہ تخلیق سے بھی پہلے علم تخلیق اور مقصد تخلیق موجود تھا''۔ ملک سجاول نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

شیخ الحدیث کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''عملی اور علمی جہاد کی اوّلیت کی ترتیب بھی یہی ہے اور عمل کی علم کے حضور حاضری سے ہمارے جہاد کا مقام متعین ہو جاتا ہے۔ ہم ان طلباء کو علم کے جہادی ہتھیاروں سے مسلح کر کے ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلا دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ ہر جگہ نواب نجیب الدولہ جیسے عملی جہاد کرنے والے تیار کر سکیں''۔

''شیخ میں یہ کہنے کے لئے معافی کا خواستگار ہوں کہ جب تک یہ طلباء ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل کر علمی جہاد کے مراکز قائم کریں گے ہندوستان میں عملی جہاد کا مرحلہ گزر چکا ہوگا، کفر کی گھٹائیں چھا جانے کے بعد چند شمعیں انہیں بھگا نہیں سکیں گی''۔ ملک نے کہا۔

''اس وقت یہ درجن نوجوان جہاد میں شامل نہ بھی ہوں تو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ ہاں، اگر یہ علم کا جہاد ترک کر دیں تو ہمارے ملی مستقبل پر بہت ناگوار اثرات مرتب ہوں گے''۔

شیخ الحدیث کی وضاحت پر ملک مسکرایا۔ ''حضور علم اور عمل کے اجتماع تک معاونت فرمائیں تو خاکسار پر کرم

ہوگا"۔

شیخ الحدیث نے کتاب بند کی اور شاہ ولی اللہ کے حجرے کی طرف چل دیے۔

روہیلہ سرداروں کی روانگی کے بعد شیخ الحدیث نے شاہ ولی اللہ کو ملک سجاول سے ہونے والی بحث سے متعلق بتایا تو انہوں نے ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دادا حضور زندگی بھر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فوج میں مرہٹوں کے خلاف برسر جہاد رہے اور اسی سفر جہاد میں شہید ہوئے۔ والد بزرگوار نے تلوار کے جہاد کی بجائے قلم اور علم سے جہاد کی بنیاد رکھی، ہم اس پر قائم ہیں۔ والد بزرگوار اور ہم بھی تلوار بدست رہتے تو ملت کو صرف دو ہی اہل جہاد میسر آتے۔ ہم خوش ہیں کہ ہمارے تلوار نہ پکڑنے سے ملک سجاول اور نجیب الدولہ کی ساری جماعت میدان جہاد میں آ گئی"۔

ملک نے آگے بڑھ کر شاہ ولی اللہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا تو شیخ الحدیث مسکرا دیے۔

مدرسہ رحیمیہ سے نکل کر روہیلہ سرداروں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر حاضری دی اور خضر آباد روانہ ہو گئے۔

ملک سجاول عشاء کی نماز کے بعد درگاہ کے احاطہ میں آئے تو محفل سماع کے لیے چاندنیاں بچھائی جا رہی تھیں اور قوال اپنے اپنے ساز درست کر رہے تھے۔ وہ ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ شاہجہان آباد کے امراء اور شرفاء کی سواریاں آنا شروع ہو گئیں۔ سب سے پہلے وہ مزار پر حاضری دیتے فاتحہ پڑھتے اور مسلمانوں کی فتح و کامرانی کی دعا مانگتے اور پھر محفل سماع میں شریک ہو کر کلام خسرو پر وجد میں چلے جاتے۔ رات گہری ہو گئی تو وہ انہیں وجد کرتے چھوڑ کر باہر آ گئے، ان کے ساتھی منتظر تھے وہ مدرسہ رحیمیہ کی طرف چل دیے۔

نواب شوالپوری بیگم کی حویلی کے صحن میں دھوپ پھیل رہی تھی اس کے باوجود باورچی خانے سے دھواں نکل رہا تھا ایک کے اوپر دوسرا گرم لباس پہنے کھڑا تھا اور گھوڑوں پر زینیں کسی جا رہی تھیں۔ حویلی کے دالان خاص میں انگیٹھی کے سامنے گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی بوڑھی نواب شوالپوری بیگم اپنی بہو مغلانی بیگم کی طرف دیکھ رہی تھی، وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر حالات کی مانند الفاظ بھی اس کی گرفت میں نہیں آ رہے تھے مغلانی بیگم بھی خاموش تھی جیسے کچھ سننے کی منتظر ہو۔ نواب شوالپوری بیگم نے کروٹ بدلی اور دیوان کی چھت میں کچھ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ "ہماری عمر دو کہانیاں اس آزمائش کے قابل نہ تھیں مگر ہم مقدر کے لکھے پر راضی ہیں اور جب تک سانسیں باقی ہیں ہم کچھ کر سکتے ہیں ... کے حق میں ہوگا"۔ ... آواز کہیں بہت دور سے آتی معلوم ہوئی۔

مغلانی بیگم نے اپنی ساس کی ویران آنکھوں میں ان کے دکھ کی گہرائی ناپنے کی کوشش کی۔ "حضور کی ہمت اور استقامت نے ہمیشہ اس خاندان کو طوفانوں سے ٹکرا جانے کا حوصلہ دیا"۔

"مگر ہم نے ہمیشہ انہیں اپنوں سے ٹکرانے سے باز رکھنا چاہا"۔ شوالپوری بیگم نے اس کی بات کاٹی۔ "ہمارے بیٹے آپس میں ٹکرا کر ختم ہو گئے اس سے بڑی ہماری ناکامی اور کیا ہوگی۔ ہم عماد الملک اور انتظام الدولہ کا تنازعہ نہ نمٹا سکے، زمانے نے اس بڑھاپے میں ہم سے انتقام لیا"۔

"حضور نے زمانے کی گردش میں مبتلا درماندوں بے سہاروں پر کرم کیا۔ مصیبت زدگان پر شفقت کی، دکھیا لوگوں کا دکھ بٹایا، زمانہ حضور کو اس کا اجر ضرور دے گا"۔ مغلانی بیگم نے ہمت و حوصلہ دینے کی کوشش کی۔

"ہم نے کبھی زمانے کا شکوہ نہیں کیا۔ وقت و عصر کا مالک سدا ہم پر مہربان رہا ہے..."

سے کرم اور احسان کا شکر ادا کرنے میں ناکام رہے۔ ہم اس حال میں بھی اس کے شکر گزار ہیں"۔ شولاپوری بیگم کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"حضور کی استقامت اور فراست اس آزمائش میں ہمارا سہارا ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ حضور اس مرحلہ میں بھی ہمیں کامیاب دیکھیں گے"۔ مغلانی بیگم اپنے کو اور نواب شولاپوری بیگم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ہم سمجھتے ہیں زوال کی اس گھڑی میں نجات کی ایک ہی راہ ہے جس پر چلنے کا ہم نے عمادالملک کو ہمیشہ مشورہ دیا اور جس پر چلنے سے اس نے ہمیشہ غفلت برتی اگر آج بھی وہ مرہٹوں اور سورج مل کا ساتھ چھوڑ دے تو ہم اسے انتظام الدولہ کا خون معاف کرنے پر آمادہ ہوں گے"۔

"عمادالملک کو جو بات آج تک سمجھ نہ آسکی وہ اب بھی نہیں سمجھ سکے گا۔ ہماری درخواست ہے کہ حضور اس کے بارے میں فکرمند نہ ہوں، اس کو درمیان سے نکال کر سوچیں"۔ مغلانی بیگم نے کہا۔

"ہمارے لیے ممکن نہیں کہ ہم اپنے خون سے بے فکر ہو جائیں۔ اس نے ہمیں دھوکہ دیا، اس پر بھی ہم اس کا دکھ نہیں دیکھ سکتے۔ ہمارے لئے یہ مشکل سب مشکلوں پر بھاری ہے۔ اس نے ابھی تک ہمارے مراسلہ کا جواب نہیں دیا"۔

"عمادالملک اب بھی اس امید میں ہے کہ مرہٹوں کی مدد سے وہ احمد شاہ ابدالی کو شکست دے کر وزارت عظمیٰ پر بحال رہے گا"۔

"ملت کے زوال پر ذاتی اقتدار کے محل تعمیر کرنے کے خواب کبھی کسی کے پورے نہیں ہوئے۔ مرہٹے فتح مند بھی ہو جائیں تو اسے وزیر اعظم نہیں دیکھنا چاہیں گے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ زوال اس حد تک پہنچ جائے گا، ہم نے کبھی گمان تک نہ کیا تھا"۔ شولاپوری بیگم کو مغلانی بیگم کی بات پسند نہیں آئی۔

کنیز نے سلام کر کے سواریوں کی تیاری کی اطلاع دی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ "ہم دیکھ رہے ہیں کہ افغان بادشاہ اس مہم میں بھی سرخرو ہوگا۔ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کی ہمدردیاں اور دعائیں اس کے ساتھ ہیں۔ آپ ہمارا یہ مراسلہ عمادالملک تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔ ملت سے کٹ کر وہ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکے گا"۔ شولاپوری بیگم نے نشست سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"حضور کے حکم کی تعمیل کی پوری کوشش کی جائے گی، ہم نے عمادالملک سے رابطہ کا انتظام کر رکھا ہے"۔ مغلانی بیگم نے اٹھتے ہوئے بتایا۔

"ہم نے آپ کے لئے شاہ ولی خان کے ڈیرہ کے قریب ڈیرہ لگوا دیا ہے، افغان بادشاہ پر اس کا بہت اثر ہے"۔ شولاپوری بیگم نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "شاہجہان آباد کے حالات کے بارے میں ہم نے ان کے لئے مراسلہ الگ سے ارسال کر دیا ہے"۔

"بادشاہ معظم حضور کی فراست کی بہت قدر کرتے ہیں"۔ مغلانی بیگم نے جواب دیا۔

"ہم بادشاہ معظم کی کامیابی کے لئے دعا کرتے رہیں گے، ملت کی امیدیں اب ان سے وابستہ ہیں"۔

دیوان خاص کے دروازے پر کنیزیں ادب سے جھک گئیں نواب شولاپوری بیگم ان کے درمیان سے چلتی ہوئی ڈیوڑھی تک گئیں جہاں مغلانی بیگم کی سواری اور محافظ دستہ تیار کھڑے تھے۔ دعاؤں کے ساتھ اپنی بہو کو محاذ جنگ کے لئے روانہ کیا اور کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہیں اور پھر آہستہ قدموں سے دیوان خاص کی طرف چل دیں۔ خدام اور کنیزیں سر جھکائے کورنش کے انداز میں پیچھے ہٹ گئے۔

جس حویلی سے ہندوستان کی عظیم الشان مغل سلطنت کے وزیراعظم نواب قمرالدین ہاتھیوں اور سواروں کے قافلوں کے ساتھ امراء اور سرداروں کے جھرمٹ میں جنگ کے لئے روانہ ہوا کرتے تھے، خان خاناں نواب انتظام الدولہ کے دستے ایک شان سے لڑائی کے لئے نکلتے تھے وہاں سے ایک خاتون چند سواروں کے ساتھ محاذ جنگ کے لئے روانہ ہو رہی تھی اور ایک بزرگ خاتون کے سوا اس کی کامیابی اور زندگی کی دعا کرنے والا اور کوئی نہ تھا۔

بادشمال اور بھی تیز چلنے لگی تھی، خزاں رسیدہ پتے درختوں سے گر گر کر ادھر ادھر اڑتے پھر رہے تھے اور آسمان پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نمودار ہو گئے تھے۔ کوئی ٹکڑا سورج کے سامنے آتا تو زمین اس کے سایہ میں آ جاتی، ہوا اسے اڑا لے جاتی تو دھوپ چمک اٹھتی۔

***

ہمایوں کے مقبرہ کے احاطہ میں داخلہ کے دروازے باہر اور اندر افغان دستے قطاریں باندھے کھڑے تھے، ان کے نیزے اور تلواریں چمک رہی تھیں۔ آل تیمور کے اس وسیع وعریض ویران گورستان میں بہت عرصہ بعد اتنے سوار اور پیادہ داخل ہوئے تھے۔ یعقوب خان افغان دستوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے مزار تک گئے اور جلد ہی واپس لوٹ آئے۔ بادشاہ کابل وقندھار احمد شاہ ابدالی اپنے سمدھی مقتول شہنشاہ ہندوستان عالمگیر ثانی پر فاتحہ خوانی کے لئے آنے والے تھے۔ ہندوستان میں آمد کے بعد سے شاہجہان آباد میں یہ ان کی پہلی آمد تھی مگر انہوں نے منع کر دیا تھا کہ شاہجہان آباد کے امراء اور شرفاء میں سے کوئی بھی ان سے ملنے یا استقبال کے لئے نہیں آئے گا اور نہ ہی صوبیدار شہر سے باہر نکل کر ان کا استقبال کرے گا۔ پھر بھی بستی نظام الدین کے لوگ بادشاہ کی سواری کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور افغان فوجیوں کے خوف کے مارے راستوں سے دور کھڑے تھے۔

جب سے یعقوب خان نے شاہجہان آباد کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا تھا لوگوں کے دلوں پر سے افغان سواروں اور سپاہیوں کا خوف کم ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود انہیں لوگوں کو راستہ سے دور رکھنے کے لئے چھانٹے لہرانے پڑ رہے تھے۔

یعقوب خاں ہمایوں کے مقبرہ کی ڈیوڑھی پر بادشاہ معظم کا انتظام کرتے رہے اور وہ وزیراعظم شاہ ولی خان افغان امراء اور سرداروں کے ہمراہ حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی طرف مڑ گئے۔ خواجہ کے مزار پر فاتحہ پڑھی اور مسجد میں دو رکعت نفل ادا کر کے دیر تک گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے رہے۔ ان کا محافظ دستہ مجاوروں اور سجادہ نشینوں کو مسجد کے دروازے سے باہر روکے کھڑا تھا۔ بادشاہ معظم دعا سے فارغ ہو کر باہر آئے تو سجادہ نشینوں نے انہیں نذرانے کا فرض یاد دلایا۔

مسجد سے نکل کر بادشاہ معظم نے ایک بار پھر مزار پر حاضری دی اور مجاوروں اور درویشوں میں اشرفیاں تقسیم کرنے کا حکم دیا۔

جب درویش اور مجاور اشرفیاں وصول کرنے میں اور عمال شاہی تقسیم کرنے میں مصروف تھے تو بادشاہ کابل شہنشاہ روحانیت کے مزار کے احاطہ میں اہل دنیا کی مرمریں لوحائے مزار سے مرحومین کے مقام ومرتبہ کا جائزہ لے رہے تھے۔

دین والوں کی درگاہ سے نکل کر بادشاہ دنیا والوں کے مزاروں کی طرف چل دیئے۔ راستوں سے گرد بستی کے لوگوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

(جاری ہے)

ایک تاثر ایک کہانی

آزادی کے چراغ لہو سے جلتے ہیں

مٹی تو اس کی ہوتی ہے جس کے خون سے سیراب ہو کر لال ہو جاتی ہے۔ مٹی کو اپنانے کے لیے تو اُسے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون سے سینچنا ضروری ہوتا ہے۔ مقبول بٹ نے اپنا زندہ خون دے کر اس زمین پر اپنی ملکیت کی مہر لگا دی۔

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

1947ء میں میرے خاندان کو درندوں نے کس طرح اپنے ظلم کا نشانہ بنایا، کیسے بتاؤں، اب وہ لوگ اس دنیا میں نہیں رہے۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہ خاک اور خون میں تڑپتے نظر آتے ہیں لیکن کیا ستم ہے آنکھیں بند کر کے میں اپنے پیاروں کا دیدار نہیں کر سکتا۔

آج بھی وہی موسم ہے۔ بھورے بادل آسمان پر چھائے ہیں۔ وہی جانی پہچانی ہوا چل رہی ہے۔ مگر وہ کی خوشبو نہیں ہے۔ ہر طرف گھٹن ہے، موسم ہر سال اپنے آپ کو دہراتا ہے۔ ہوا میں پرانی یادوں کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ پرانے لوگ پرانے چہرے، پرانی بستیاں سب ذہن کے دریچوں سے اٹھ اٹھ کر جھانکتے ہیں اور دل کے چھپے ہوئے زخم پچھتاوؤں کا ناسور بن کر رسنے لگتے ہیں۔

ابھی ابھی میں مقبول بٹ کی قبر سے ہو کر آ رہا ہوں۔ ویرانے میں اس کی لاش کے گرد خود بخود بید کی جھاڑیاں اُگ آئی ہیں۔ چاروں طرف بانس کے گھنے جنگل ہیں۔ ہوا درختوں سے سرسرا کر گزرتی ہے تو سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ مقبول بٹ کی موت پر جیسے سب آہیں بھر رہے ہیں، ہر وقت وہاں ماتم کی فضا چھائی رہتی ہے، میں دو گھنٹے تک وہاں بیٹھا گزگڑاتا رہا۔ میں جانتا ہوں کہ میرے ندامت میں ڈوبے آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے وہ کبھی نہیں آئے گا۔ مگر سارا وقت مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے مقبول بٹ میرے پاس موجود ہے۔ وہ میری حالت سے واقف ہے۔ کیا ہوا جو وہ مجھ سے بات نہیں کرتا۔

مسلسل رونے کے بعد میں بوجھل دل لئے واپس آیا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں اب تک خاک پھانکتا رہا ہوں۔ اس نے مجھے معاف نہیں کیا، کر بھی کیسے سکتا ہے۔ چھوٹی بڑی غلطی تو ہر انسان سے ہوتی ہے مگر اتنا سنگین گناہ تو مجھ جیسے ذلیل اور کم ظرف لوگوں سے ہی سرزد ہوتا ہے۔

کاش! مقبول بٹ زندہ ہوتا تو میں اس کی ہر بات مان لیتا، میں اپنی دھرتی سے غداری نہ کرتا۔ میں ہندوؤں کو دوست نہ کہتا، کبھی ڈھٹائی نہ کرتا۔ وہ بالکل ٹھیک کہتا تھا۔ ”آزادی کے چراغ لہو سے جلتے ہیں۔ اس کی ہر بات میں وزن تھا۔ وہ عقل سے سوچنے اور دور تک پہنچنے کا عادی تھا۔ میری طرح جذبات کے ریلے میں کبھی بہہ نہیں جاتا تھا۔ وہ تو سچا تھا۔ چٹان کی طرح مضبوط اور اٹل اسی لئے وہ مر کے بھی زندہ ہی رہا اور میں چار چار گھنٹے اس ویرانے میں پتھروں سے سر ٹکرا کر واپس آ جاتا ہوں۔

رام کشور، گیان پرکاش اور ششو پال اب اس طرف نہیں آتے تھے۔ وہ اس قبر کی طرف دیکھتے ہوئے دور ہی دور سے قہقہے لگاتے گزر جاتے تھے۔ حقارت سے تھوکتے اور ٹھوکر لگاتے ہوئے بڑے فخر سے کہتے تھے کہ آزاد دیس کا باسی موت سے کھیل گیا۔

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا تھا، وہ اس دیس کے باسی کب تھے؟ منافقت ان کے خون میں رچی ہوئی تھی۔ مقبول بٹ کا تو اس مٹی کے ساتھ صدیوں کا ساتھ تھا، وہ اس پاک دھرتی کا اصل نام لیوا تھا۔ مگر وہ لوگ تو ہندو تھے، ان سب کی زبان بھی اور تھی، وہ تہذیب اور وہ معاشرت بھی نہیں تھی۔ اگر وہ آزاد تھے تو ان ہی کی طرح آزاد میں بھی ہوں۔ مگر یہ کیسی آزادی ہے کہ آج میرا رواں رواں بدترین غلامی اور دہشت گردی کے جال میں پھنسا ہے۔ ایک دائمی خوف میرے حواس پر مسلط ہے۔ میں ہنس نہیں سکتا، دل کی بات کسی سے کہہ نہیں سکتا، میں تو چیخ کر رو بھی نہیں سکتا۔

1947ء کا وہ ایک روز تھا کہ پیارے لعل کا باپ ہمارے گھر آیا تھا۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے تحکمانہ انداز میں کہنے لگا۔ ”گزرے دنوں کی یاد میں کچھ نہیں رکھا، کبھی ہو گے تم کھاتے پیتے زمیندار، اب تو زمین رہن رکھنے کی بات کرو۔“

اس پر دادا لرز اٹھا۔ میں دو ٹوک سنانے کو تھا مگر اس

نے مجھے بیچ میں آنے سے روک دیا۔ ٹوٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ''سچ کہتے ہو، دھرم چند! پیٹ کی آگ اگر نہ ہوتی تو میں تم سے بات بھی نہ کرتا''۔

دھرم چند نے زمین پر تھوک کر غصے بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ''دھان آج کل بہت اونچا جا رہا ہے۔ پانچ سیر بھی سونے کے مول ہے، بولو''۔

دادا نے سر جھکا لیا۔ یہ ہماری پسماندگی کا بدلہ تھا کہ دھرم چند کبھی بٹائی کا مزارعہ تھا اور اب سیٹھ ہو رہا تھا۔

''زمین کی بات نہیں کروں گا''۔ دادا قرض کے ڈر سے مرنے لگا۔

''تو پھر بیچ کیوں نہیں دیتے''۔ دھرم چند نے حریص لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے''۔ دادا نے جواب میں زمین کا سودا کرلیا۔ اسے معلوم تھا کہ دو روز سے گھر میں چولہا نہیں جلا۔

میں تو لڑنے کو تیار تھا مگر دادا نے کہا۔ ''عبداللہ! زمین اب ہمارے بس کی نہیں رہی۔ خدا کی مرضی ہوتی تو سیلاب ہی نہ آتا، سب کچھ بہہ نہ جاتا۔ زمین تو ماں ہے اپنے ہاتھوں کوئی اپنی ماں کیسے پھینک سکتا ہے''۔

''نشیب میں ہے یہ زمین''۔ دھرم چند ناک چڑھا کر بولا۔ ''سودا تو مجھے ہی مہنگا پڑ رہا ہے۔ اگر تمہاری بھوک کا خیال نہ ہوتا تو کبھی اپنے سر نہ اوڑھتا''۔

اس پر میں نے اور دادا نے حیرت زدہ ہو کر اسے دیکھا۔ وہ منہ بنا رہا تھا۔ بار بار تھوک رہا تھا، بے لگام بدک رہا تھا۔ بھوک، افلاس، بے روزگاری۔

ملکہ اور لیلیٰ بے بسی سے کواڑ کی اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔ ان کے چہرے اترے تھے۔ ہونٹ سوکھے تھے اور آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔ آدھے پیٹ کھا کر ان میں جان نہیں رہی تھی۔ دھان کی فصل کو کیڑا لگ گیا تھا۔ اس لئے گھر گھر بھوک کی پکار تھی، دادا نے زمین پھینک دی۔

سونا اگلنے والی ماں کا سودا کرلیا۔ دھرم چند نے بدلے میں مٹی بھر چاول ہمارے گھر بھیج دیئے۔ چاول کے دام اونچے ہوتے جا رہے تھے نا...... اس لئے سب نے ایک ایک دانہ ہاتھوں میں لیا۔ دو چار دن جہنم بھرنے کے بعد پیٹ کی آگ پھر بھڑکنے لگی۔

دادا بہت بوڑھا ہوگیا ہے۔ اس کے بازوؤں میں سکت نہیں رہی ہے۔ وہ زیادہ کام بھی نہیں کرسکتا ہے۔ پہلے تو ایسی حالت نہیں تھی۔ لہلہاتے کھیتوں میں وہ شیر کی طرح پھرتا تھا۔ دھان اور گندم کی کھڑی فصل کا پہرہ دیتا تھا۔ لیلیٰ اور ملکہ دن بھر گھر کا کام کرتی تھیں۔ اپنے خالی وقت میں چرخے پر سوت کاتتی تھیں۔ دھان چھڑتی، رتی میں بل ڈالتیں یا گڑ کاڑھتی تھیں۔

لیلیٰ کی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے خواب بھرے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ زندگی میں کبھی کوئی دکھ نہیں آئے گا۔ بیاہ کی بات پکی ہو جانے کے بعد تو وہ اور بھی نکھر آئی تھی۔ دن میں دو بار کپڑے بدل کر بالوں میں سرسوں کا مہکتا تیل ڈالتی، جوڑے میں سورج مکھی کا پھول لگا کر سارے گھر میں اٹھلاتی پھرتی۔

آنگن میں سفید بیلوں کی جوڑی بندھی تھی۔ دادا کہتا تھا کہ لیلیٰ جب اپنے گھر جائے گی تو ان کو بھی ساتھ ہی لے جائے گی۔ جبھی تو وہ صبح شام ان کو دانہ چوکر ڈالتی۔ اپنے ہاتھ سے مل مل کے نہلاتی اور چوری چوری ان کی چوڑی پیشانیاں بھی چوم لیتی تھی۔ بیل اس کے پیروں کی چاپ پہچانتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی اپنے کھونٹے پر خوشی سے اچھلنے لگتے۔

زمین کا سودا ہوا تو گھر کی ویرانی مجھ سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ دادا نے ایک دن دبے لہجے میں کہا۔ ''عبداللہ! تُو تو یونہی دکھ کرتا ہے۔ زمین تیری ماں نہیں تھی، یوں سمجھ لے کہ تیری بہن تھی جس کو ایک نہ ایک دن پرائے ہاتھ میں جانا ہی تھا''۔ میں نے گھور کر اُس کو دیکھا تو اس کی

آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ کندھے پر رکھے رومال سے پونچھ کر بولا۔ ''تو سمجھتا ہے کہ وہ زمین کو میرے پاس رہنے دیں گے؟''

میں اٹھ گیا۔ اب ادھر اُدھر کی باتیں کر کے مجھے منانے سے کیا فائدہ۔ مگر وہ پیچھے پیچھے ہی سرکتا رہا۔ مجھے کندھوں سے پکڑ کر وہ زمین پر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔

''کان کھول کر سن لے، اب یہاں ہمارا کچھ بھی نہیں ہے''۔

میں چونک گیا، وہ کیا کہہ رہا تھا۔

''یہ گھر، یہ سامان، سب کچھ کوئی دن جاتا ہے کہ یہ لوگ گھسیٹ کر لے جائیں گے''۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''تو ابھی نادان ہے، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ ہمیں سنبھل کر چلنا ہوگا۔ یہ بہت گندی ذہنیت کے لوگ ہیں''۔

''دادا!''

''اپنے ہاتھوں اپنا مال لٹا دینا اچھا ہے''۔ دادا نے کہا۔ ''کسی بات کا غم نہ کر''۔

پر میں نے مانا..... پہلے سے بھی بڑھ کر غم زدہ ہو گیا۔ دادا کو وہیں چھوڑ کر اپنی زمین کی طرف چلا گیا۔

وہ ویسی کی ویسی ہی تھی، خاموش اور بے بس۔ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی چپ چاپ گود میں چھپا لینے والی۔

رات ہوئی تو میں نے کسی سے بات نہ کی۔ گھر میں کچھ کھانے کو تھا ہی نہیں اس لئے کھاٹ پر لیٹ گیا۔ معلوم نہیں کب آنکھ لگ گئی۔ شاید آدھی رات کا وقت تھا جب لیلیٰ نے آہستہ سے مجھ پر ہاتھ رکھا۔

''کیا بات ہے؟'' میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

برف جیسی سفید چاندنی میں اس کی آنکھیں بوجھل لگ رہی تھیں۔ آواز بھرائی تھی۔ شاید وہ ساری رات سوئی نہیں تھی۔ بھوکے پیٹ بھلا کب نیند آتی ہے۔ میں نے مندی مندی آنکھوں سے دیکھا، وہ مجھ پر جھکی کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اپنے بکھرے ہوئے بال اس نے کانوں کے پیچھے اُڑس لئے اور سر جھکا کر رونے لگی۔

''کسی نے کچھ کہا؟'' میں پریشان ہوگیا۔

''دادا بیلوں کی بات پکا رہا ہے''۔ اس نے رندھی آواز میں کہا۔

''بیلوں کی؟''

''ہاں!''

میں نے ڈنڈا اٹھا لیا، چادر اوڑھتے ہوئے باہر آ گیا۔ رام کشور کا باپ کھڑا مونچھوں پہ تاؤ دے رہا تھا۔ پگڑی سر سے اچک کر بولا۔

''بیل تو سوکھے کے مارے لگ رہے ہیں، بالکل بڈھے''۔

دادا مارے غم کے سرخ ہوگیا مگر ایک دم زرد پڑ گیا۔ یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے وقت ہی انسان کو بے موت مارتا ہے اور وقت ہی کسی چمار کو بڑا زمیندار بناتا ہے۔

''گھر کے پالے ہوئے بچے ہیں''۔ دادا نے کہا۔

''ابھی بڈھے کیسے ہوگئے؟'' دادا کی آواز میں زور نہیں تھا۔

''گزر گئے وہ زمانے جب تم نے انہیں پالا ہوگا''۔

دادا نے حیرانی سے دیکھا اور کہا۔ ''ابھی تو تین برس بھی پورے نہیں ہوئے۔ زمانہ کیسے گزر گیا؟''

''وقت سے تمہاری طرح ان کی بھی پسلیاں نکل آئی ہیں۔ ہادی میاں! آدمی خود اگر دو وقت نہ کھائے تو کوئی بات نہیں مگر جانور کو کھلانا تو بہت ضروری ہے۔ ان ڈھانچوں کا کیا اچار پڑے گا، خاک!''

میں چپ کا چپ رہ گیا۔ میرے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا ہتھیلی کے پسینے سے بھیگ گیا۔ اسی تکرار میں پو پھٹنے کو ہو گئی۔ چڑیاں جاگ گئی تھیں۔ صبح کی ہوا میرے کانوں کے آر پار ہوئی جا رہی تھی۔

''تم جو کچھ بھی سمجھتے ہو، دام لگا لو۔'' دادا عاجز ہو گیا۔

''ان کا وبال تو ہادی میاں! کوئی بھلا آدمی مشکل ہی سے اٹھا سکے گا اور دو چار رن میں بوچڑ خانے کے لائق ہو جائیں گے۔ دوستی کی لاج رکھ رہا ہوں، ڈھائی سیر دھان''۔

''ڈھائی سیر......؟'' دادا کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''دھان کا بھاؤ پوچھ لو منڈی میں''۔ چیت رام نے بیلوں کی پکڑی رسّی چھوڑ دی۔ ''جاؤ بولی لگوا کر دیکھ لو۔ ان ہڈیوں کے پنجر کا کوئی کیا دیتا ہے''۔

وہ اکڑی ہوئی مونچھیں لئے جانے کو تیار ہوا تو دادا بھوک کے خوف سے مرنے لگا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

''غصہ جانے دو چیت رام میں اور تم کوئی دو تو نہیں ہیں''۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ اکڑ گیا۔ ''دو کیسے نہیں ہیں''۔

دادا ٹھٹک گیا۔ پھر اس نے بے چارگی سے سر جھکا لیا۔ چیت رام نے بیلوں کی رسّی کھولی اور دادا سے بولا۔

''زمانہ بہت بدل چکا ہے ہادی میاں! اب وہ پہلے کی بات نہیں رہی۔ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

دونوں بیل اس کے پیچھے ڈکرا کر گھسٹنے لگے۔ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے تھے اور وہ انہیں ڈنڈے مار مار کر لئے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ لیلیٰ کی سسکیوں نے مجھے بے چین کر دیا۔ پیر پٹخ کر چیت رام کے پیچھے ہی جانے لگا تو دادا گلے گلے پانی میں ڈوب کر ابھر آیا۔ ہوش میں آ کر کہنے لگا۔

''دکھ نہ کر عبداللہ! بیل اگر اپنے ہاتھ سے نہ دیئے جاتے تو کل ہی چوری ہو جاتے۔ اس سے تو اچھا ہے جو بھی ہاتھ آ جائے۔ ڈھائی سیر دھان تو دو وقت کا ساتھ دے جائیں گے مگر بیل تو ایک رات بھی نہ کاٹ سکتے تھے''۔

لیلیٰ تو رو رو کر مری جا رہی تھی۔ بیل چلے گئے تو اس کا بیاہ کیسے ہو گا۔ شگون ہی بدل گیا۔ ہندو ذہنیت کا مطلب اب میری سمجھ میں آنے لگا تھا۔ چیت رام ٹھیک ہی کہتا تھا۔ ہم اور تم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ سدا سے دو چلے آ رہے ہیں اور ہمیشہ دو ہی رہیں گے، ایک کیسے ہو سکتے ہیں۔

جب سوچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہی دن اہمول تھے جب برسوں پہلے ہم ہوشیار پور سے آ کر اس زمین پر بس گئے تھے۔ ہمارے گھر بالکل آمنے سامنے تھے۔ ہم سب اردو زبان بولتے تھے اور پھر اس کو اس طرح اپنا لیا جیسے وہ ہی ہمارا اوڑھنا بچھونا، ہماری مادری زبان تھی۔ اس تمام عرصے میں ہم اس رنگ میں رنگ گئے لیکن چیت رام کی جڑیں اس زمین کی نہیں تھیں نہ دھرم چند کی، دادا تو یہیں کا باسی تھا۔

ہم یعنی رام کشور، ششو پال اور میں ہم سب کے پاؤں اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ ہماری باتیں آسمان کو چھو رہی تھیں مگر زمین میں ہم دھنستے نہ تھے۔ مقبول بٹ اپنی فضاؤں کا پالا تھا۔ اس کی رنگت میں اسی مٹی کا رنگ تھا۔ اس کی مٹی سے محبت، اس کا اٹھنا بیٹھنا، سب اسی کا جزو تھا۔ جو کچھ بھی ہو اس سے کسی کو کیا غرض برسوں تک ایک دھرتی میں رہنے کے بعد زمین غیر نہیں رہتی۔ آہستہ آہستہ اپنے اندر سمیٹنے لگتی ہے۔ میں کیسے کہوں میرا اس سے ناطہ نہیں تھا۔ میں یہاں اجنبی کیسے ہو سکتا تھا۔ ان سارے گزرے برسوں میں ایسا کال بھی کاہے کو پڑا ہو گا۔ ان دنوں تو دادا بھی اکڑ کر چلتا تھا۔ اس کی ایک ہی للکار سے کیا

دھرم چند کیا چیت رام سب ہی ڈرتے تھے۔ اس کی آواز سن کر دہل جاتے تھے۔

دادا نے تو یہاں کی بنجر زمینوں کو اپنے خون سے سینچ کر ہرا بھرا کر دیا تھا۔ دن رات ایک کر کے دھان، پاٹ، جو، گندم، ایسے بھر بھرا اگائے کہ میلے میں ہادی میاں کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ وہ جدھر بھی جاتا لوگ اس کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگاتے تھے۔ دھرم چند، جگت سوامی، چیت رام سب اس کے سامنے سر جھکا کر چلتے تھے۔ کیا مجال جو اونچی آواز میں بات کر جائیں مگر اب معلوم نہیں یہ کایا کیسے پلٹ گئی جو چاہا تھا وہ کیوں نہ ہوا۔ دادا تو بڑے محنتی تھے، کمر کمر اور گلے گلے پانی میں اتر کر دھوپ دوپہر میں کام کرتے۔ کرتہ، چپل سے بے نیاز ہو کر کیچڑ اور بدبو کو گوارا کرتے۔ پاٹ کو سڑاتے، ایسی فصل اگاتے کہ منڈی میں اصل سے دس گناہ فائدہ اٹھاتے۔

انسان کا مقدر ساتھ دے تو آندھی اور سیلاب بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ مگر جہاں سونا ہی مٹی برابر ہونے لگے تو اس ہونی کو کون روک سکتا ہے۔ دھرم چند نے جس زمین پر ہاتھ مارا تھا وہ سونے کی کان تھی۔ ہر سال دریا کی مٹی اور پانی کی لہریں اس کو زرخیز بناتی تھیں۔ اب تو دریا بھی اپنا دھارا بدل رہا تھا۔ کچھ ہی برسوں میں وہ چار گنا زیادہ اناج اگلنے لگے گی۔ مگر بھوک تو آج پڑی تھی۔ سیلاب میں دھان کی کھڑی فصل بہہ گئی تھی۔ اس ہاتھ سے جانے والی زمین کے علاوہ ابھی دادا کے پاس گندم کی فصل تیار کھڑی تھی۔ کٹائی کے بعد پوری امید تھی کہ اچھے دام دے جائے گی تو اتنی بھوک نہیں پڑے گی۔

بیلوں کی جوڑی چلی گئی تو بارہویں روز ہی ششو پال کا باپ ہمارے دروازے پر کھڑا تھا۔ دادا اس کو دیکھتے ہی کھل اٹھا۔

''آیئے آیئے، جگت سوامی جی!'' دادا نے خوش دلی سے کہا۔ ''نصیب جاگے ہمارے، کہئے کیسے آنا ہوا؟''

''ہادی میاں!'' جگت سوامی کھڑ کھڑے بولا۔

''میں نے سنا تھا تمہارے حالات اچھے نہیں ہیں؟''

جگت سوامی نے بڑا بڑھیا جوتا پہن رکھا تھا، کلف لگے دھوتی کرتے میں تو وہ گزرے دنوں کا تیلی دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ سارا دن تیل کی کپیاں بھر بھر بیچنے والا جگتو اب جگت سوامی ہو رہا تھا۔

''یہ تو اس کی دین ہے''۔ دادا نے ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''جب چاہے سوتی کو کنکر بنا دے''۔

جگت سوامی نے بڑی زوروں میں گردن ہلائی۔

''پھر کیا خیال ہے؟''

''حالات کا کیا ہے''۔ دادا ایک دم بجھ گیا اور چونک کر بولا۔ ''سوامی جی آج ٹھیک نہیں ہیں تو کل سدھر جائیں گے''۔

''میں نے سنا تھا پاٹ کی زمین دے رہے ہو''۔ جگت سوامی نے کہا۔

''کیا گزرا تو میں ہو گیا ہوں''۔ دادا روہانسا ہو گیا۔

''مگر کھڑی فصل نہیں دوں گا''۔

''اچھی طرح سوچ لو''۔

''سوچ لیا۔ ہے خوب اچھی طرح''۔

''پھر کیا ارادہ ہے؟''

''فصل کاٹ لوں تو پھر زمین کا سودا بھی دیکھا جائے گا''۔

''تمہاری گری پڑی حالت پر ترس آ گیا تھا تو چلا آیا تھا''۔ جگت سوامی نے مکارانہ لہجے میں کہا۔ ''ورنہ مجھے کیا پڑی تھی یہاں آنے کی''۔

دادا کی آنکھوں میں پھریری آ رہی تھی، آستین سے پونچھ کر بولا۔

''تم اس کی فکر مت کرو''۔

وہ پیر پٹخ کر جانے لگا، ملکہ اس کے لئے شربت بنا

کر لائی تو اس نے منہ موڑ لیا۔ جاتے جاتے بولا۔ ''جب فاقوں سے مرتے مرتے اونے پونے وصول کرنے لگو تو مجھ سے پوچھ لینا، میں پھر بھی تمہاری دوستی کی لاج رکھ لوں گا''۔

''مہربانی ہے آپ کی سوامی جی! ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے''۔

وہ چلا گیا تو میں جیسے گہرے خواب سے بیدار ہوا۔ دادا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''تو کس سوچ میں ہے؟''

''میں قادر آباد چلا جاؤں گا۔ شاید کسی پاٹ کول میں مزدوری مل جائے''۔

''مزدور بھرتی ہو گا تو؟'' دادا کی آواز میں طنز تھا۔

''ہاں دادا!''

وہ خاموش ہو گیا، اس کے بعد وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ میں جانتا تھا اس کے سینے پر پتھر کی سل رکھی ہے۔

دن چڑھتے تک جب میں دھلے کپڑے پہن کر روانہ ہونے لگا تو لیلیٰ نمک ملا باسی بھات لے آئی۔ میں نے دو نوالے حلق سے اتارے، پانی کا گلاس ایک سانس میں پی کر پیدل ہی نکل گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں بال اڑے جاتے تھے۔ گھر میں کھانے کو نہیں تھا تو سر میں لگانے کو تیل کہاں سے آتا۔ دو چار قطرے پہلے کے پڑے تھے وہ تو لیلیٰ نے لگا لیا تھا۔

دن بھر خوار ہونے کے بعد شام کو میں جھک مار کر واپس آ گیا۔ پل کے پل میں کیسا اندھیر ہو گیا تھا۔ مسلمان کارخانوں میں ہندوؤں نے ساری جگہ گھیر لی تھی۔ جہاں اسامیاں تھیں وہاں راتوں رات مشینیں اکھاڑ کر ہندوستان پہنچائی جا رہی تھیں۔ میرے جیسے بے شمار نوجوان گرد میں اٹے پریشان چہرے لئے وہاں کھڑے ہندوؤں کے تعصب اور نفرت کی آگ میں جل رہے تھے۔ فیکٹریاں بند، کل پرزے غائب، عہدے ختم، روزگار نایاب، آزادی کے نام پر ہندو لوٹ مار میں سرگرم تھے۔

میرا ضمیر ہتھوڑے مار مار کر میرے ذہن کے پردے پھاڑ رہا تھا۔ پیٹ میں بھوک کے مارے بل پڑ رہے تھے۔ ایک طرف آزادی، آزادی، آزادی کے فلک شگاف نعرے تھے۔ لوگ ہر طرف آزادی کا جشن منا رہے تھے تو دوسری طرف روزگار کی مایوسی تھی۔ میرے ہونٹوں پر تھکان اور مایوسی کی پپڑی جمی تھی۔ ماتھے پر غربت کی خاک اڑ رہی تھی۔ تھک ہار کر اپنی کھاٹ پر پڑ گیا۔ مسلمان کے لئے اس دھرتی میں سب دروازے بند ہو گئے تھے۔ خدا کا دروازہ تو ہمیشہ کے لئے کھلا تھا۔ جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ بغیر کچھ کھائے پیے سو گیا تو دادا نے گہری رات میں جھنجھوڑ کر جگایا۔ ''عبداللہ...... عبداللہ!''

''کیا ہے دادا! سونے بھی نہیں دیتے''۔ میں نے کسمسا کر کروٹ بدلی۔

''پاٹ (گندم) کو آگ لگی ہے''۔ دادا نے گھبرائی آواز میں کہا۔

میں دیوانہ وار اٹھ کر اندھیرے میں بھاگتا چلا گیا۔ راستے میں ٹھوکر لگی تو منہ کے بل گرتے بچا۔ کچھ سجھائی بھی تو نہیں دیتا تھا۔ کوئی گیلی گیلی چیز میرے پیر میں سے نکل کر زمین میں جذب ہو رہی تھی۔ ٹٹول کر دیکھا تو خون تھا۔

زمین میرے خون کی پیاسی تھی۔ میں نے پروانہ کی اور بھی تیزی سے بھاگنے لگا۔ دریا کنارے جا کر دم لیا۔ نظروں کے سامنے ساری امیدیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں۔ دادا ایک طرف منڈیر پر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔ وہ تو چیخ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس کو اتنا بے حال نہیں دیکھا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ فصل اچھی پک جائے گی تو دونوں لڑکیوں کا بیاہ ہو جائے گا۔ گھر میں کچھ دن کھانے کا آسرا بن جائے گا۔ ہو سکا تو دودھ

کے لئے گائے بھینس لے لیں گے۔ مگر نہ معلوم کس طرح آگ لگ گئی۔

لیلیٰ تو لڑتی رہی کہ دادا نے ضرور کھیت کنارے چلم سلگائی ہو گی۔

دادا ہزار کہتا رہا گھر میں کھانے کو نہیں ہے تو چلم پھونکنے کو پیسے کہاں سے آئیں گے۔ چھ مہینے ہو چلے چلم کو ہاتھ لگائے۔

میرے پیروں تلے زمین کھسکنے لگی۔

زمینیں گئیں، بیل گئے، اب فصل بھی گئی اور بھوک وہیں کی وہیں رہی۔ رات بھر انگاروں پر لوٹتے گزری۔ صبح ہی صبح جگت سوامی پھر سے آ گیا۔

''کھڑی فصل جل گئی، بہت بُرا ہوا''۔ اس نے دادا سے کہا۔''اب خالی زمین کا سودا کر لو، اب بھی کچھ مل سکتا ہے''۔

''زمین کو چور تو نہ لے جائیں گے''۔ دادا جلا بیٹھا تھا۔

جگت سوامی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ جاتے جاتے تھوک کر بولا۔''کیا خبر جو چور ہی لے جائیں۔ یاد رکھو! ہیرانند تو سرکاری طور پر کوشش کر رہا ہے کہ وہ زمین اس کو مل جائے، وہ روز کچہری جاتا ہے''۔

دادا سناٹے میں رہ گیا۔

''بھئی ہادی میاں!'' جگت سوامی نے طنزیہ انداز میں کہا۔''جیسے تم اس زمین کے مالک ویسا ہی وہ بھی ہے۔ یہ ابھی قانونی طور پر تقسیم نہیں ہوئی۔ برسوں تک تم نے اس پر عیش اڑایا ہے، اب اس کا بھی تو حق ہے''۔

میرا تو جی چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اس کا منہ توڑ دوں مگر بابا ہی مرنے لگا۔ ہاتھ پکڑ کر جگت سوامی کو چارپائی پہ بٹھایا پھر پوچھنے لگا۔''اصل بات ہے؟''

''تم ان لوگوں کو تو خوب اچھی طرح سمجھتے ہی ہو ہادی میاں!'' وہ چوٹ کرتے ہوئے بولا۔''وہ دن ختم ہو گئے جب ان زمینوں پر تمہارا زور چلتا تھا۔ اب تو وہ لوگ بھی حقدار ہیں جو اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں سے جا رہے ہیں۔ تمہاری آزادی کے بعد یہ زمین بھی تقسیم ہو گی''۔

''کون لوگ؟''

''منہ کھلواتے ہو میرا، تو سن لو''۔ جگت سوامی نے کہا۔''میں بھی برابر کا حقدار ہوں مگر میں تمہاری دوستی کی لاج نبھا رہا ہوں۔ قیمت دے کر زمین لینے آیا ہوں''۔

''حق دار..... کیسا حق؟'' دادا بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا۔

''واہ ابھی کیا ہے۔ ابھی تو بہت کچھ ہو گا، جن زمینوں اور جاگیروں پر تم لوگ کنڈلی مارے بیٹھے ہو۔ سب کی پرکھ ہو گی جو اصل حقدار ہوں گے اب یہاں وہ ہی رہیں گے''۔

دادا کا دم گھٹ رہا تھا۔ کھانس کھانس مرنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کھانسی غربت اور کمزوری کی علامت ہے۔ بس اب دادا زمین پھینک کر جان چھڑا لے گا اور ہوا بھی یہی۔ جگت سوامی نے کاغذوں پر لکھت پڑھت اسی وقت کر کے دو من دانے ہماری کوٹھری میں پھینک دیئے۔ کہنے لگا۔''ہادی میاں! تم فکر مت کرو، ہیرانند سے تو میں وہ ٹکر لوں گا کہ ساری عمر یاد کرے گا''۔

دادا سے الجھنے کی میری عمر نہیں ہے۔ وہ مجھ سے زیادہ اپنے حالات کو سمجھتا تھا۔ میرا کیا ہے زیادہ سے زیادہ دو چار دن منہ پھلا کر دور دور پھروں گا پھر ان سب میں ایک ہو جاؤں گا۔ آخر تو مجھے اسی گھر میں رہنا ہے۔ بس میں دادا سے بات نہیں کروں گا۔ دن بھر اپنا دکھ اپنے ساتھ لئے سڑکوں اور ویرانوں کی خاک چھانتا پھروں گا اور رات کو مچھلی کے شکار پر جایا کروں گا۔ یوں دادا اور زمینوں سے میرا کوئی واسطہ بھی نہیں رہے گا۔ مجھے کیا پروا ہے کسی کی۔ نوکا تو میرے پاس ہے ہی اور جال بھی میرا اپنا ہے۔

کچھ دن میں دل ہی دل میں منصوبے بناتا رہا۔

میرے چاروں طرف ایسی سرگوشیاں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ غبار چڑھا ہے۔ جن ہندو دوستوں کو اب تک میں اپنا سمجھتا آیا وہ میرے نہیں تھے۔ ان کے اور میرے درمیان مذہب کا فاصلہ تھا۔ تہذیب اور معاشرت کا بعد تھا۔ ایسی ایک دوری تھی جس سے ہم نے آزادی حاصل کی تھی۔ ہم کبھی بھی ایک دوسرے کے دوست نہیں بن سکتے۔ کبھی بھی یکسانیت کے پردے میں ڈھل نہیں سکتے۔

میں نے ہندو دوستوں کے فریب میں آ کر مقبول بٹ کو ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مقبول بٹ جو میرا بھائی تھا، جس کے ساتھ میرے سبھی رشتے تھے۔ خون کے، مذہب کے، روح کے، ہم تو ازل سے ایک ہی تھے ابد تک ایک ہی رہیں گے مگر نہ جانے کیوں میں آنکھوں پر پٹی باندھ کر اندھیروں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ چاند چڑھا تو دریا کنارے رونق آ گئی، ڈھول بجنے لگا۔ دور دور سے لوگ کھنچے آنے لگے تو میں بھی امیدیں لئے وہاں پہنچ گیا۔ شور ہو رہا تھا۔ ماہی جال بکھیرنے کی تیاری میں تھے۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ بدمست ہو کر دنیا کے غم بھلا رہے تھے۔ اتنے میں ہجوم میں پہچان کر رام کشور اور ششو پال میری طرف بھاگے آئے۔

”عبداللہ! نوکا بیچو گے؟“

”نوکا..... مگر کیوں؟“

”تمہارے گھر کی حالت اچھی نہیں ہے اس لئے“۔

”تم سے کس نے کہا؟“

”سب گاؤں والے بتاتے ہیں“۔

”نوکا کون لے گا؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہمیں دے دو، جو مچھلی ہاتھ آئے گی اس میں آدھی تمہاری“۔

معلوم نہیں میرے ہاتھوں کا زور کیوں ٹوٹنے لگا۔ وہ سب میرے گرد جمع ہو کر میرے جواب کے منتظر تھے۔ وہ بہت تھے اور میں اکیلا تھا۔ میرا دم گھٹنے لگا، مجھے آسمان پر پورا چاند کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ناامیدی کے کالے بادل گھرے آ رہے تھے لیکن آزادی کا جشن میری آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔

میں مان گیا، سودا طے ہو گیا۔

میں نے سوچا دادا لڑے گا تو کہہ دوں گا۔ تم نے جو زمینیں پھینک گنوائیں تو میں نے نوکا دے کر مسئلہ حل کرنا چاہا ہے۔ رام کشور اور ششو پال میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ وہ اگر دھوکا بھی دے گئے تو کیا ان کے باپ تمہارے ساتھ چال نہیں چل گئے؟

اب تو ہمارے چاروں طرف جھوٹ ہے، چالاکی ہے اور فریب ہے۔ دادا زیادہ اونچ نیچ کرے گا تو میں شہر بھاگ جاؤں گا۔ یہاں میرا رکھا ہی کیا ہے؟

وہ دونوں اچھلتے کودتے نوکا لے گئے۔ ساتھ ہی جال بھی تھا۔ اُن کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں اور بازوؤں میں بجلی بھری تھی۔ رات گئے تک میلہ لگا رہا۔ وہ دونوں دریا کی سطح پر بہت دور نکل گئے۔ میں اُن کے ساتھ جانے کی ہمت نہ کر سکا۔ گھر کی حالت اچھی ہوتی تو میں بھی ان میں شامل ہو کر ضرور خوش ہوتا۔ کنارے پر بیٹھے بیٹھے دیر ہونے لگی تو میں گھر چلا آیا۔

کھاٹ پر آنکھیں بند کر کے لیٹا تو نیند نہ آئی۔ بربار کے بستر پر سسکیوں کی آواز بے چین کئے دے رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ لیلیٰ کو اپنے بیلوں کی یاد ستا رہی ہے۔ بھوک پھر ہمارے دروازے میں گھسی تھی۔ میں نے اسے چپ کرانے کا کوئی جتن نہ کیا۔ حالات تو ہم سب کے سامنے ہی تھے۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ملکہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ مجھے جاگتے پایا تو آہستہ سے بولی۔

”عبداللہ! تو نے نوکا بھی دے دی؟“

”ہاں!“ میں نے کروٹ بدلی اور چپ ہو گئی۔ میرا ذاتی معاملہ تھا۔

''کھائیں گے کہاں سے؟''

یہ میرا مسئلہ نہیں تھا، دادا کا تھا۔ اس لئے میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بھی دم سادھ گئی اور یوں رات آنکھوں میں کٹ گئی۔

صبح ہوئی اور میں ابھی باہر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دھڑ دھڑاہٹ ہوئی۔ رام کشور اور ششو پال دونوں منہ پھیلائے کھڑے تھے، میرے منہ پر جال مارتے ہوئے بولے۔

''سنبھالو اپنا جال، ردی ہو چکا ہے یہ''۔

''کون کہتا ہے؟''

''نوکا تو، ضرور نئی بناؤ گے؟ لاکھوں چھید ہیں اس میں، رات ہم ڈوبتے ڈوبتے بچے''۔

''رام کشور! ایک چھ ماہ ہی ہوئے ہوں گے جب میں نے یہ نوکا تمہارے ساتھ ہی بنوائی تھی''۔ میں انہیں سمجھانے کی ناکام کوشش کرنے لگا مگر وہ مردہ ضمیر بگڑے گھوڑے کی طرح بدک رہے تھے۔

''وہ کوئی اور ہوگی''۔

''ہوگی کیسے؟'' میں کھسیانا ہو گیا۔ ''اور ہے ہی نہیں''۔

''مجھے تمہاری نوکا کی کوئی خبر نہیں ہے''۔ رام کشور نے بے نیازی سے کہا۔

''تمہیں اطمینان نہیں ہے تو پھر واپس دے دو''۔

''واپس کہاں سے دیں!'' ششو پال نے کہا۔ ''ایسی خستہ حالت تھی کہ میں نے وہیں کنارے پر اس کے ٹکڑے پھینک دیئے''۔

''نوکا کے ٹکڑے...... '' میری جان نکلنے لگی۔

''اور کیا روٹی کے ٹکڑے؟'' وہ طنز سے ہنسا۔

''یہ لو''۔ اس نے سیر بھر مچھلی زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اٹھا لو۔ رات بھر کی محنت اس ٹوٹی ہوئی نوکا سے اور وصول بھی کیا ہو سکتی ہے۔ دوستی کی لاج رکھنے کو یہ بھی لے آئے ہیں ورنہ تمہارا حصہ تو اس میں بنتا بھی نہ تھا''۔ ششو پال احسان جتانے لگا۔

اور پھر وہ دونوں جلدی سے چلے گئے۔ میں ان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ تو اتنی جلدی بدل گئے کہ مجھے سمجھنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ میری ان سے پندرہ بیس سال کی دوستی چلی آ رہی تھی۔ وہ معمولی کسان کے بیٹے تھے۔ دونوں کے باپ کھیتوں میں بٹائی کا کام کرتے تھے۔ نہ اُن کی اپنی زمینیں تھیں، نہ نوکا، نہ کوئی کرنگا۔ ہم میں کوئی اونچ نیچ نہیں تھی۔ میں بہت بڑے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ مگر میرے دل میں کبھی میل نہیں آیا تھا۔ آزادی سے پہلے ہم سب ایک تھے لیکن ہندو مسلم نفرت دلوں میں موجود تھی۔ پھر بھی تیج تہوار ہمارے سب ساتھ کے تھے۔ میرے گھر ہر سال محرم کی دس تاریخ کو کھچڑی یا کھیر کی نیاز ہوتی۔ رات بھر نوحہ پڑھا جاتا تو رام کشور اور ششو پال ساتھ بیٹھ کر سنتے اور نیاز کھاتے تھے۔ عید بقر عید ہم ساتھ ساتھ خوشیاں مناتے۔ مل کر میلے میں جاتے۔ ہنس ہنس کر گلے ملتے۔ رمضان میں برابر کے روزے رکھتے۔ ان کے گھر میں درگا پوجا ہوتی، آرتی کیرتن کا ڈھول بجتا تو میں بے اختیار بھاگا جاتا۔ کھانڈ کھلونے جیب میں بھر کر لاتا۔

ہمارے یہاں بارہویں کی فاتحہ ہوتی تو اس میں پیارے لال بھی آتا، رام کشور بھی ہمارے ساتھ ہوتا۔ سب ہی مل کر مسلم لیگ کے جلسوں میں جاتے اور قائداعظم کی تقاریر سنتے۔ مجھے تو وہ گزرا ہوا ایک ایک پل ایک ایک لمحہ اس طرح یاد ہے جیسے یہ سب ابھی ابھی کی باتیں ہوں۔ ہمارا تو مرنا جینا ہی ساتھ کا تھا۔ برسات کی گھٹائیں امڈ کر آتیں۔ بہتے دریا میں مچھلی پکڑتے۔ یہ مچھلیاں ہمارا شکار تھیں۔ ان سے ہماری خوشحالی اور خوشی کی ساری امیدیں بندھی تھیں۔ پو پھٹنے تک کشتیوں کی دوڑ جاری رہتی۔ سب سے آگے نکل جانے والا مارے خوشی کے اونچی آواز میں ماہیے گاتا تھا۔ صبح کا اجالا پھیلنے لگتا تو

گاؤں کے لوگ چاول، گڑ اور چنے کی بارش کرتے۔ لوٹنے والے ادا بدا کر بھاگتے جو بھی ہاتھ آتا سمیٹ کر لے جاتے۔

رام کشور اور ششو پال تو میرے ساتھ ہی ہوتے تھے۔ میں تو اب یہی کہوں گا کہ ان دنوں زندگی صحیح معنوں میں زندگی تھی۔ نہ فکر تھی نہ فاقہ دادا وقت پہ ہل چلاتے، دانے بکھیرتے، پانی دیتے اور وقت پہ فصل کاٹتے۔ موسم اپنے وقت کے مطابق بدلتے تھے۔ ان دنوں تو ندیوں میں بڑا سریلا پیچ وخم تھا۔ ہر طرف سبزے کی فراوانی تھی، بادل جھومتے آتے تھے، دھواں دھار برستے تھے۔ بجلی تڑپ کر کڑکتی تھی۔ ہوائیں اٹھلا کر چلتی تھیں۔ بالیوں سے بھرے جھومتے مسکراتے کھیت لہرالہرا کے اٹکھیلیاں کرتے جیسے بچہ ماں کی گود میں قلقاریاں مار رہا ہو۔ کیسے کیسے دن دبے پاؤں گزر گئے۔ آنکھیں بند کرتا ہوں تو جیسے ان دنوں کی بکھری ہوئی موسیقی روح کے تار جگانے لگتی ہے۔ ہر ذرے میں ایسے ایسے سُر چھپے تھے کہ ساری کائنات مستی میں ڈوبی لگتی تھی۔

صبح کے وقت گاؤں کے سب لڑکے مل کر مدرسے جاتے۔ رات کو رت جگا مناتے۔ ہم سب ایک تھے۔ مسلمان اور اسلام کی جڑیں اس وقت بھی اس زمین میں بہت گہری تھیں۔ پانچ وقت مؤذن کی صدا اٹھ کر چلنے کی راہ بتاتی۔ سب مسجد میں جمع ہو کر وضو کرتے اور مل کر نماز پڑھتے۔ مقبول بٹ نماز میں ہمیشہ پہل کرتا۔ میں اس کو روکنا رہ جاتا مگر وہ یہی کہتا تھا کہ دیر سے نماز پڑھی تو کیا فائدہ؟ اس نے تو مرنے میں پہل ہی کی۔ چاہے یہ موت کس طرح بھی آئی ہو، ہماری دیکھا دیکھی رام کشور اور ششو پال بھی مندر جاتے تھے۔ کئی بار بحث ہوتی تو وہ یہی کہتے کہ خدا سب کا ایک ہی ہے۔ تم اگر اپنے خدا کے قریب جانا چاہتے ہو تم ہم اس سے دور کیسے رہ سکتے ہیں۔

وہ دن تو ایسے پُراسرار تھے کہ جیسے میں کسی سراغ رسانی کی مہم میں شامل ہوں۔ یہ دنیا مجھے جادو بھری دکھائی دینے لگی۔ نہ جانے کیسی بانسری کی لے تھی کہ میں بے خود ہو گیا۔ وطن کی آزادی، وطن جو اپنی جان سے بھی پیارا ہے، جس پر ہندو اور انگریز نے مل کر قبضہ جما رکھا تھا۔ جس پر غاصبوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ میرا وطن، مقبول بٹ کا وطن...... سب کا پیارا دیس اب آزاد ہو چکا تھا۔

آزادی...... انگریز کی غلامی سے نجات کا نشہ چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے اناج کی بوریاں واہگہ کے راستے سرحد پار لے جاتا۔ وہاں کے لوگوں کو دیتے وقت میرا دل کتنا بڑھ جاتا میں سمجھتا کہ میں انسانیت کے لئے بہت بڑا کام کر رہا ہوں۔ میں تو ایسا بے بس کھلونا تھا کہ جدھر وہ میرے ہندو دوست چابی گھماتے میں گھوم جاتا۔

حالات نے مجھے مقبول بٹ کا دشمن بنا دیا۔ میں نے اس سے کنارہ کر لیا۔ وہ میرے دروازے پر بھی آتا تو کوئی اسے منہ نہ لگاتا۔ ہندو دوستوں کے ساتھ میں جب انگریز فوجیوں کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتا تو میرا دل اونچا اچھل جاتا۔ سارے گاؤں میں گڑ چنے بانٹتا پھرتا۔ اس کے بعد ہمارا روز ہی یہی کام ہو گیا کہ جو بھی کوئی صورت سے ہندو نظر آئے اور ذرا سی بھی ہندوستان کے حق میں آواز اٹھائے اس کا گھات لگا کر نشان ہی مٹا دو۔ ایسے ہی ایک دن جب ہم نے ایک بہت بڑا ہندو افسر گھیر کر مارا تو سب کا سیروں خون بڑھ گیا۔ رات بھر الاؤ کے گرد ڈھول بجا بجا کر تاڑی چلتی رہی۔ سب ناچتے اور گاتے رہے۔

ایک شام مجھے میرے خفیہ ذرائع سے خبر ملی کہ بہت بڑا شکار پھنسا ہے۔ میں اس وقت گھر جانے کی جلدی میں تھا۔ لیلیٰ کے بیاہ کی بات چل رہی تھی، اس لئے جلد سے جلد تاریخ مقرر کرنا ضروری تھا۔ حالات جانے کیا سے کیا ہو جائیں۔

سڑک کے موڑ پر مجھے مقبول بٹ نظر آیا۔ میں کترا

کر بھاگنے کو تھا کہ وہ لپک کر میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے قدم تیز کر لیے تو وہ بھی تیز تیز چلنے لگا۔ وہ تو بھاگتا بھی بہت تیز تھا۔ جیسے شکاری کتوں کی آواز پر ہرن چوکڑیاں بھرتا ہے۔ کئی دنوں سے میں نے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے کچھ کہنے کا موقع دیا تھا۔ وہ زور سے چلایا۔

"آنکھوں پر پردہ ڈال لیا ہے عبداللہ!"

وہ بڑی اچھی اردو بول رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا۔

"تجھے کیا؟"

"بے شک میری بات پر نہ دھیان دو، پر یاد رکھنا کہ ہندو کی بات میں نہ آنا۔ رام کشور اور ششو پال اس مٹی کے دشمن ہیں۔ ہندو کسی مسلمان کا دوست نہیں ہو سکتا"۔

"میں تو تیری باتوں میں نہیں آؤں گا"۔

"پچھتاؤ گے، بہت عبداللہ بھائی!" اس نے فکرمند لہجے میں کہا۔ "یہ لوگ ہمیں ایک ایک کر کے مار دیں گے۔ ہندو کے دل سے بھی منافقت ختم نہیں ہو سکتی"۔

"دیکھ لوں گا"۔

میں بھاگتا ہوا گھر جانے کی بجائے اس طرف چل دیا جہاں میرے سر چڑھا خون مجھے کھینچ لے گیا۔

لاٹھیاں، خنجر، بھالے میرے منتظر تھے۔ سڑک سے ذرا نیچے ڈھلوان پر اتر کر ترائی میں دس بارہ آدمی درختوں کی اوٹ میں چھپے تھے۔ میرے دوستوں نے دور ہی سے پہچان کر پاکستان زندہ باد کے نعرے لگائے۔ آزادی کی پکار میں آنکھ جھپکتے ہی ہم ان آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ مار مار کر ان کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ساری کی ساری زمین خون سے رنگ گئی۔ مجھے تو خبر ہی نہ تھی کہ وطن کی باگ تو اسی کے ہاتھ میں رہتی ہے جس کا خون مٹی میں رچ جائے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آ بھی نہیں سکتا۔ میرے دماغ پر میری آنکھوں میں ہندو کی دوستی کا نشہ چڑھا تھا۔ ان دنوں عجیب سرور کی کیفیت چھائی رہتی۔ دن بھر ہم چپ چاپ سر جھکائے کھیتوں میں کام کرنے والے سیدھے سادے کسان دکھائی دیتے تھے، رات کو ہم بڑے افسروں کے گھر پہ چھاپے مارتے۔ ان کے بچوں کو تلواروں کی نوک پر الٹا لٹکا کر اچھالتے، زندہ جلا دیتے۔ تڑاتڑ ہڈیاں چٹخنے کی آوازیں آتیں۔ جتنی تیز انسانی گوشت جلنے کی بو اٹھتی اتنی ہی تیز ہمارے روئیں روئیں میں آزادی کی خوشی بھرنے لگتی۔ آزادی تو دشمن کی لاش پر پاؤں رکھ کر ہی ملتی ہے۔

ہر طرف مسلم لیگ کی دھاک بندھی تھی۔ ہم ایک ہیں، ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا، وطن کی آزادی ہم سب کی پکار ہے۔ ہم ایک ساتھ جئیں گے اور ایک ساتھ ہی مریں گے۔ مسلم لیگ ایک کھلا سمندر بن چکی تھی۔ اس میں روز بروز ادھر ادھر سے ندی کی لہریں اکٹھی ہو کر مل رہی تھیں۔ ان میں کئی لوگ میرے گاؤں کے تھے۔ میں ان کی شکلیں پہچانتا تھا مگر اس سے بھی زیادہ میرے گمان سے بھی بڑھ کر سرحد پار سے لوگ گھس آئے تھے۔ ان میں انگریز فوجی بھی شامل تھے۔ رام کشور اور ششو پال مجھے سمجھاتے۔ یہ ہمارے ساتھی ہیں، خیر خواہ ہیں۔ یہ ہمیں ہر دکھ سے نجات دلاتے آئے ہیں۔ میں ان سب کا احسان مند تھا، وہ میرے وطن کے لئے اپنا وطن چھوڑ کر آئے تھے۔ میری مدد کر رہے تھے۔

مقبول بٹ کبھی مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوا تھا۔ سفید ٹوپی پہن کر بس وضو ہی کرتا رہتا۔ اس کا لہجہ ذرا بھی اچھا معلوم نہ ہوتا تھا۔ مگر وہ اقبال کے شعر پڑھ پڑھ کر دیوانہ ہوا جاتا۔ اس نے تو سارے کا سارا کلام ہی رٹ ڈالا تھا۔ ایک دن سب کی موجودگی میں مجھ سے بولا۔ "اگر سچے مسلمان ہو تو اقبال کو سینے میں چھپا لو"۔

رام کشور بدک اٹھا اور بولا۔ "مقبول بٹ! تم کیا سوچتے ہو، کوئی بھی حکومت مذہب کی بنیاد پر نہیں چل سکتی"۔

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ''جب خدا نے ہر انسان کو ایک ہی جیسا گوشت پوست کا بنایا ہے تو پھر یہ مذہب وذہب کیا ہے۔ میں تو انسانیت کا پرستار ہوں''۔

مقبول بٹ مجھے باتوں باتوں میں الگ لے گیا۔ کہنے لگا۔ ''عبداللہ! تم ہندو کو کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ ہم نے کلمہ کی پکار پر جو آزادی حاصل کی ہے وہ ہمارے واسطے جان سے بھی بڑھ کر قیمتی ہیں اپنے ملک اور قوم سے غداری مت کرو۔ ہندو سے دوستی چھوڑ دو''۔

میں نے اس کو تھپڑ مار دیا۔ پانچوں انگلیوں کے بھرپور نشان اس کے گال پر دیر تک جمے رہے۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

''عبداللہ! یہ ہندو ہمارے دریاؤں کے دھارے موڑ دیں گے''۔ گال سہلاتے ہوئے وہ چلایا۔ ''ہم کو ایک ایک بوند کو ترسائیں گے۔ ہمارے کھیت بنجر ہو جائیں گے، یہ ہمارا مال منڈیوں میں گھسیٹ کر لے جائیں گے''۔

میں نے اس سے پیٹھ موڑ لی۔

''ہندو کی دوستی کا سودا تمہیں مہنگا پڑے گا''۔ وہ پھر چلایا۔

''مقبول بٹ!'' میں تیزی سے مڑا اور اس کو ٹھوکریں مار مار کر عاجز کرنے لگا۔ میرے سر پر تو آزادی کا بھوت سوار تھا۔ ان دنوں میں کیسے سہانے خواب دیکھتا تھا۔ کھلی آنکھوں میں ایسا نور تو کبھی برسا ہی نہ تھا، جیسے میرے خوابوں میں ڈھلا تھا اور سب سے بڑھ کر ایک بہت بڑا عہدہ مل جانے کے خواب کی تعبیر۔

آزادی پاکستان میں گھر گھر خوشیاں برسائے گی۔ میرے اپنے گھر میں۔ میرے گاؤں میں۔ میرے سارے ملک میں کوئی غریب نہ رہے گا، کسی کو کوئی دکھ نہ ہو گا۔ سارے قرضے پلک جھپکتے اتر جائیں گے۔ سارے رہن چھوٹ جائیں گے۔ آزادی تو ایک پھونک ، ر کر ہی ہمارے اندھیرے دور کر دے گی۔ ہمارے دکھوں کی تو بڑی لمبی فہرست تھی۔ میرے بھائیوں کو، میرے دوستوں کو روزگار نہیں ملتا تھا۔ آزادی ملے گی تو اونچی نوکریوں پر قبضہ جمائے بیٹھنے والے ہندو اور انگریز بھاگ جائیں گے۔ بڑی اسامیاں خالی ہو جائیں گی۔

لیلیٰ اور ملکہ کے بیاہ ہوں گے۔ دادا سے ہل بیل نہیں سنبھلتا کوئی خزانہ ہاتھ لگے گا تو بڑھاپا سنور جائے گا۔ ابھی میں ہی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ نہ پڑھائی میں جی لگتا تھا، نہ کام کرنے کو جی چاہتا تھا۔

میرے سر پر تو انقلاب سوار تھا۔

ایک بار مسلمان آزاد ہو گا تو آسمان سے خوشیوں اور حقوق کی موسلادھار بارش ہو گی۔ میں نے اس کے منہ پر بے تحاشہ تھپڑوں کی بارش کی دی۔

مقبول بٹ گال سہلاتا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر لڑے تو میرے ہاتھ میں اس کو مارنے کا بہانہ آ جائے۔ مگر وہ تو موم کا بنا تھا۔ کبھی بات کرتا تو سرگوشی میں جیسے اس کے چاروں طرف کان لگے ہوں۔ وہ مجھے بھی سمجھاتا تو اتنی پیار بھری آواز سنائی دیتی جیسے کوئی پہاڑی جھرنا آرام آرام سے بہہ رہا ہو۔ مگر میرا تو رواں رواں میرے ہندو دوستوں سے بندھا تھا۔ میں اُن کے خلاف کوئی بات کیسے سن سکتا تھا۔

یقیناً مقبول بٹ مکار تھا، بڑا دھوکے باز، بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا جب میں کسی صورت نہ مانتا تو وہ بڑا معصوم بن کر بولا۔

''بھائی! بدفطرت اور بدسرشت ہندو خبیث آپ کی مخالفت کرے گا، یہ آپ کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کرے گا''۔

میں نے پھاڑ کھانے والی نظروں سے دیکھا اور اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرا اس سے نہ کبھی کوئی واسطہ تھا اور نہ رہے گا۔ وہ پکا غدار ہے، قوم کا غدار، غدار کی سز

موت ہے۔

میں نے طیش میں آ کر ساتھیوں کو پکارا۔ "بڑا شکار پھنسا ہے، جلدی آؤ!" وہ سب کے سب لپک پڑے، مقبول بٹ ان کے ڈر سے بھاگا نہیں، بڑے حوصلے سے کھڑا رہا۔

"عبداللہ! میں آپ کا بھائی ہوں"۔ آخری مرتبہ وہ مجھ سے کہنے لگا۔ "آپ کو میری باتیں بہت یاد آئیں گی"۔

"جا رہنے دے"۔ میں نے کہا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ "بڑا آیا نصیحت کرنے والا"۔

آن کی آن میں اس کو چت گرا کر میں اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ اس نے چھڑانے کو ہاتھ پیر مارے۔ اپنی جگہ کسمسانے لگا اور پھڑ کنے لگا۔ تو رام کشور اور ششو پال نے اس کے بازو قابو میں کر لئے۔ پھر بھی وہ ٹانگیں مارتا رہا۔ ایڑیاں رگڑتا رہا۔ اس کے حلق میں سے بھیانک خرخراہٹ نکلتی رہی مگر میری انگلیوں نے اس کی گردن نہ چھوڑی۔ میں نے پوری طاقت سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اس کی آنکھیں ابل کر باہر نکل آئیں۔ رام کشور نے جیب سے سرنج نکال کر اس کا خون بھرا اور زمین پر ٹپکا دیا۔

مٹی پیاسی تھی، سارا خون ایک منٹ میں چوس گئی، کسی کو بھی یہ خیال نہ آ سکا کہ مٹی تو اس کی ہوتی ہے جس کے خون سے سیراب ہو کر لال ہو جاتی ہے۔ مٹی کو اپنانے کے لئے تو اُسے اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے گرم خون سے سینچنا ضروری ہوتا ہے۔ مقبول بٹ نے اپنا زندہ خون دے کر اس زمین پر اپنی ملکیت کی مہر لگا دی۔ سب نے چاقو اور خنجروں کے وار کر کے اس کی لاش کو چھلنی کر دیا اور اسے گھسیٹ کر جھاڑیوں میں چھوڑ آئے۔ کئی دن تک چیلیں اور گدھ لاش پر منڈلاتی رہیں۔

میں نے قہقہوں میں سب کچھ بھلانے کی کوشش کی مگر اس کی کھلی آنکھوں کو نہ بھول سکا۔ اکیلے میں بیٹھتا تو وہ میرے سامنے ہوتیں جیسے انصاف کی بھیک مانگ رہی ہوں۔ میں سر سے پاؤں تک پشیمانی کے پسینے میں ڈوب جاتا۔ کبھی ان جھاڑیوں کے قریب سے گزرتا تو دل کی دھڑکن بڑھنے لگتی۔ ڈرتے ڈرتے نظر اٹھاتا تو مکھیوں کا ڈھیر اڑنے لگتا۔ اس کی آنکھیں ہر ذرّے پر چمکتی دکھائی دیتیں۔

کئی دنوں بعد اُن آنکھوں سے چھٹکارا پانے کو میں نے سب سے چھپ کر آدھی رات کو اُسے بغیر کفن کے دفن کر دیا۔ آسمان پر چمکتا ہوا چاند سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ہَوا کے تیز جھونکے میرے کام میں رکاوٹ ڈالتے رہے۔ مگر میں بے نیاز ہو کر اس کی بوسیدہ لاش کو دفنانے میں مصروف رہا۔

جب میں قبر کو بند کر کے اس پر گھاس اور جڑی بوٹیاں پھیلا رہا تھا تو پَو پھٹ رہی تھی۔ تارے ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ میں بظاہر مطمئن ہو کر گھر واپس آ گیا مگر میری وحشت اور تنہائی میرا ساتھ نہ چھوڑ سکی۔ میرا دل اندر ہی اندر ڈوبا جا رہا تھا۔ ضرور کوئی زبردست طوفان آنے والا تھا۔

میرے دوستوں نے بار بار میری اداسی کا سبب پوچھا مگر میں انہیں کچھ بھی نہ بتا سکا۔ انہوں نے مقبول بٹ کے گھر کو آگ لگائی، اُس کے ماں باپ کو زندہ جلا دیا۔ چاروں بہنوں کو تشدد کر کے ڈنڈوں سوٹوں سے مار دیا۔ تو میں ان کے ساتھ ان تمام کاموں میں شریک نہیں ہوا۔ میری روح کو گھن لگ رہا تھا۔ میرا سب کچھ کھو چکا تھا۔ میں کہاں تھا، کیا تھا۔

آزادی مل گئی...... ہر طرف شادیانے بجے اور میرے سب ہندو دوست مجھ سے آنکھیں چرانے لگے۔ میں ان کے گھر جاتا تو باہر ہی سے جواب مل جاتا۔ راستے میں کہیں مڈبھیڑ ہوتی تو وہ رکھائی برتتے پلک جھپکتے میں ہی سارے ناطے ٹوٹ چلے تھے۔

میں ان کے رویہ کو پہچان نہ سکا۔ ہر بار وہ مصروفیتوں کا رونا روتے۔ اب کیسی مصروفیت تھی، میں نے بار بار پوچھا۔ ہر بار ٹکا سا جواب مل گیا۔ میں بددل ہو کر گھر میں پڑا رہتا۔ نہ کہیں آتا نہ جاتا۔ آزادی کی خوشی کو گلے سے لگائے مقبول بٹ کی یاد میں خون کے آنسو بہایا کرتا۔

رام کشور، ششو پال آزادی کا خراج لوٹ رہے تھے۔ راتوں رات میرے وطن سے مشینری اکھاڑ کر سرحد پار بھیج دیتے تھے۔ گندم کے انبار غائب کر دیتے تھے۔ پکی اینٹیں سمیت، سریا یہاں تک کہ ملوں کے پیچ پرزے بھی۔

جب ساری دنیا بے خبر سوتی تھی تب رات کے پردے میں یہ کاروبار جاگتا تھا۔ ان سب کا تو جنم جنم سے بھارتیہ بھومی کا ساتھ تھا۔ وہ تو ہندو ذہنیت کی پیداوار تھی۔ آہستہ آہستہ میرے وطن کی رونق اجڑنے لگی جیسے آسمان سے ٹڈی دل اترا اور ہمارے گھروں سے صفایا ہو گیا۔ یوگ راج نے ہمارا گھر رہن رکھ لیا۔ کچھ دن بعد بولا۔

''گھر خالی کرو''۔

''ہم نہیں جائیں گے، اب تم جاؤ''۔ میں نے کہا۔

''ہم کہاں جائیں؟''

''جہاں ہندو ہیں، اُس ہندوستان میں جاؤ۔ چند سال پہلے یہ سارے گھر، کھیت کھلیان، باغ باغیچے ہمارے تھے تم نے ڈاکہ ڈالا اور سب کچھ لوٹ لیا۔ تم انگریز کے پٹھو ہو''۔

گھر پر قبضہ، زمین پر قبضہ، دکان پر قبضہ، روزگار پر قبضہ، آئے دن جھگڑا۔

دادا بھوک سے تنگ آ کر ریل کی پٹری بھیک مانگتا چلتا گیا۔ اس کی زمینیں دونوں طرف ذرا سی ڈھلوان اتر کر تھیں۔ پیارے لال اور یوگ راج ہل چلا رہے تھے۔ اونچی آواز میں گیت گا رہے تھے، فتح اور خوشی میں ڈوبی آوازیں دور سے سنائی دے رہی تھیں۔ دادا کو دیکھ کر پیارے لال زمین پر تھوک کر بیلوں کو ٹشکارتا ہوا بولا۔

''بے وقوف بڈھا اب اپنی عزت کا سودا کرے گا''۔

دونوں نے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگایا۔ بیل بے قابو ہو گئے۔ اچھل اچھل کر دادا کے ہاتھ سونگھنے اور چاٹنے کو سر ہلانے لگے۔ شکنجہ ایسا مضبوط تھا کہ بے بس ہو کر رہ گئے۔ یوگ راج نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور تڑاتڑ مارنے لگا۔ دادا لنگڑاتا ہوا شام کو واپس آ گیا۔ مردہ لگ رہا تھا۔ بھیک نہیں ملی تھی۔ میں بھوک سے بے تاب ہو رہا تھا۔ رات ہو رہی تھی۔ کئی دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ لیلیٰ اور ملکہ گھٹنوں میں سر دیئے چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ آسمان پر پھیلی چاندنی پھیلی تھی۔ چاند کے گرد ہالہ تھا۔ شاید کسی بڑے طوفان کی آمد تھی۔

میں اپنی جوتیاں گھسیٹتا کھاٹ پر سے اٹھا۔ جا کر رام کشور کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ابھی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ وہ اندر ہی سے بولا۔

''یہاں کچھ نہیں ملے گا۔''

''تم باہر تو آؤ''۔

''بہت مشکل ہے''۔

میں نے اس کی پرانی دوستی کا واسطہ دیا تو وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ کہنے لگا۔ ''سونے بھی نہیں دیتے کمبخت!''

جھگڑے کا وقت نہیں تھا۔ میں ندامت سے گڑگڑایا۔ ''کچھ ٹکا مل جائیں گے؟''

''ٹکا...... کوئی درختوں پر تو نہیں لگتے ...... ہاتھ پیر توڑ کر ہی آتے ہیں''۔

''اس وقت بہت ضرورت تھی''۔

''ضرورت کے خیال سے ہی تو کہہ رہا ہوں''۔ اس نے طنز کیا۔

پھر وہ رک کر بولا۔ ''کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟''

''کام ملے جب نا!''

''کام کرنے کی تمہاری نیت ہی نہیں''۔

میں پھیکی چاندنی میں اس کے ماتھے پر پڑی شکنیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پھر سے اکڑتا ہوا بولا۔ ''کام نہیں کرنا چاہتے تو لیلیٰ کی شادی مجھ سے کردو''۔

میں ہناٹے میں رہ گیا، وہ کیا کہہ رہا تھا۔

میں نے آنکھوں میں آنکھیں ملائیں تو وہ للکار کر بولا۔

''احسان فراموش!''

''کیسا احسان؟'' میں نے پوچھا۔

''واہ، اتنی جلدی بھول گئے..... تمہیں آزادی نہیں دی کیا؟''

میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرالیا اور زنانے کا ہاتھ منہ پر مارا۔ پھر ٹھڈوں اور گھونسوں کی بارش کردی۔ وہ اٹھ کر ایک طرف بھاگا اور جب واپس آیا تو وہ اکیلا نہیں تھا، لڑکوں کا ایک ٹڈی دل میرے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں سب کو جانتا تھا، پہچانتا تھا۔ رام کشور، ششو پال، رام سروپ، یوگ راج، پیارے ہر دیال سب کے سب ایک ہی ذات، ایک ہی ذہنیت کے تھے۔ میرے گھر کے کواڑ چیخ رہے تھے۔ دیکھتے ہی شعلے بھڑکنے لگے۔ لیلیٰ اور ملکہ کی چیخیں آسمان کو ہلا رہی تھیں۔ لوگ انہیں گھسیٹ کرلے جا رہے تھے۔ وہ بے حال ہوئی جارہی تھیں کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ میں نے طیش میں آکر نیزے سے ان سب کے جسم چھلنی کردیئے۔

''اب بولو''۔ میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

ان کے پاس سہم کر چپ رہ جانے کے علاوہ اور چارہ بھی نہیں تھا۔

''سچ بولو، آزادی تم نے مجھے دی کہ میں نے چھینی ہے؟'' وہ چپ رہے۔

''بولو بولتے کیوں نہیں؟'' وہ سوچتے رہے۔

''اب سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ بولو!''

پھر میں نے ان کے منہ پر بھرپور تھپڑ مارے اور ایک ایک کی پسلی میں نیزے کی نوک اتاردی۔ وہ کچھ دیر تک تڑپتے رہے۔ پھر ساکت ہوگئے۔ میں نے ان کی ماؤں، بہنوں کو گھروں سے گھسیٹ کر ننگے سر ہیرا منڈی بازار میں چھوڑ دیا۔ میں پاگلوں کی طرح بھاگا، گرم گرم آنسو میری خوشی اور میری آزادی کا پیغام بن کر میری آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ مقبول بٹ کی قبر پر جاکر میرے قدم رک گئے۔ میں نے اس کو بے اختیار پکارا۔ وہ وہاں نہیں تھا، کہیں نہیں تھا۔ پھر میں بے ہوش ہوکر اس کی ڈھیری پر گر پڑا۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔ مٹی تو اس کی ہوتی ہے جس کے خون سے سیراب ہوتی ہے۔ میں آزادی کا سورج دیکھ رہا تھا۔ شہادت کا فخر میرے نصیب میں نہیں تھا۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے سرخ مٹی سے قبر کی زمین پر چاند تارا بنایا۔ اپنے ہاتھوں سے اس کو اٹھا کر ماتھے پر سجایا۔ سینے سے لگا کر چوما۔ میں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ میری آواز دھرتی کا سینہ چیر کر مقبول بٹ تک پہنچی ہوگی۔

مجھ سے کیسی بھول ہوگئی تھی، میں نے ایسا کیوں کیا، مقبول بٹ سچا تھا، وہ ٹھیک کہتا تھا۔ آزادی کے چراغ لہو سے جلتے ہیں۔ وہ آزاد ہوگیا۔ پاکستان آزاد ہوگیا۔ کاش میں اب روحانی کرب سے آزاد ہو جاتا۔ پھر میں نے کھیتوں کی طرف دیکھا، وادا پھر سے فصلوں میں شیر کی طرح چل رہا تھا۔ آج ایک آزمائش کی گھڑی میرے سامنے ہے۔ خون میں رنگی سرخ مٹی مجھ سے میرے گناہوں کا کفارہ مانگ رہی ہے۔

عشق و آزادی بہار زیست کا سامان ہے
عشق میری جان، آزادی میرا ایمان ہے
عشق پر کردوں فدا میں اپنی ساری زندگی
لیکن آزادی پر میرا عشق بھی قربان ہے

ناقابل فراموش

تقسیم کے وقت پیش آنے والا دل گداز واقعہ

''کس منہ سے جاؤں پاکستان ابو جانی! میرے پاس کیا رہا ہے؟''

آزادی کی قیمت

☆ محمد نذیر ملک

اگست کا مہینہ جہاں ہمارے لئے ہر سال خوشیوں کا پیام بر ہوتا ہے کہ اس ماہ میں ہمیں آزادی ملی، اپنا ایک الگ وطن ملا، ہمیں اپنی شناخت ملی۔ یہ مہینہ ہمیں آزادی کی نعمت سے سرشار بھی کرتا ہے اور اس شرف سے ہمکنار بھی کرتا ہے تو وہاں یہ ہمارے غموں کا نقیب بھی ہے کہ اس پیارے وطن کے حصول کے لئے دی جانے والی قربانیوں کی ہمیں یاد بھی دلاتا ہے اور آزادی کے نام پر ہمیں لگنے والے زخموں کی گنتی بھی کراتا ہے۔

بڑی بھاری قیمت دے کر ہمیں یہ وطن ملا ہے۔

ماسٹر نور عالم 60 کے پیٹے میں تھے جب وہ ہمیں ساتویں جماعت میں تاریخ کا مضمون پڑھاتے تھے۔ تب تاریخ انگلستان کے ساتھ ساتھ تاریخ ہندوستان بھی پڑھائی جاتی تھی۔ وہ پڑھاتے پڑھاتے اکثر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوستان کی تقسیم اور ملک پاکستان کے معرض وجود میں آنے پر آبادی کی جو ہجرت ہوئی وہ برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی ہجرت

تھی۔ ماسٹر نور عالم بتایا کرتے تھے کہ ملک کی تقسیم کے وقت وہ گورداسپور کے پرانے رہائشی تھے۔

"پاکستان معرض وجود میں آیا تو شروع میں ہمیں باور کرایا گیا تھا کہ گورداسپور کا ضلع پاکستان کے حصہ میں آئے گا۔ اس لئے ہم لوگ مطمئن تھے کہ ہمیں کہیں نہیں جانا، یہیں رہنا ہے، یہی ہمارا پاکستان ہوگا۔ جبکہ ہمارے چاروں طرف ہر سُو مسلمانوں کی نئے ملک پاکستان کی جانب ہجرت جاری تھی اور ہر طرف سے فسادات، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور آتش زنی کی خبریں آ رہی تھیں۔ وہاں پر میں گورنمنٹ خالصہ ہائی سکول میں سیکنڈ ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس سکول میں اکثریت سکھ طلباء کی تھی۔ وہاں میں نویں جماعت کو تاریخ پڑھاتا تھا۔ میری جماعت میں طلباء کی تعداد 25 تھی جن میں 5 مسلمان، 3 عیسائی، 2 پارسی اور 15 سکھ تھے۔ سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی سکھ تھے۔ ان کا نام سردار جگدیش سنگھ تھا۔

ملکی حالات کے پیش نظر سکھ لڑکے اکثر "راج کرے گا خالصہ" کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ تاہم زندگی نہایت پُرسکون طور پر رواں دواں تھی۔ علاوہ ازیں ہماری گھریلو زندگی اور فضا مثالی تھی۔ میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں جو کالج سکولوں میں پڑھتے تھے۔ ہماری کچھ زرعی اراضی بھی تھی ہم نے مال مویشی بھی رکھا ہوا تھا۔ زمین مزارعوں کو دے رکھی تھی۔ ہماری بہت اچھی گزر بسر ہو جاتی۔ ہمارے ساتھ والا گھر سردار دارا سنگھ کا تھا جو علاقہ کا بڑا زمیندار تھا۔ وہ اچھی خاصی زرعی زمین کا مالک تھا۔

دارا سنگھ کے گھرانہ کے ساتھ ہمارے دیرینہ تعلقات تھے یہاں تک کہ ہم نے صحن کی دیوار سے ایک دوسرے کے گھر آنے جانے کے لئے الگ سے راستہ بنایا ہوا تھا۔ جہاں سے ہم ان کے اور وہ ہمارے گھر بلا جھجک آیا جایا کرتے تھے۔ دونوں گھر والوں کی آپس میں گاڑھی چھنتی تھی۔ حتیٰ کہ ہمارے مال مویشی بھی اکٹھے چگنے چرتے تھے۔ یوں کہتا تھا ان کی بھی آپس میں دوستی تھی، وہ بھی ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔

ان کی اور ہماری زمین بھی ساتھ ساتھ تھی۔ دارا سنگھ کے بھی دو جوان بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، لڑکوں کی آپس میں بڑی گہری دوستی تھی اسی طرح لڑکیاں بھی ایک دوسری کی خوب سہیلیاں تھیں۔

روزانہ دوپہر شام دونوں گھروں میں جو پکتا تھا اس کا آپس میں تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ کہیں شادی بیاہ یا غمی پر جانا ہوتا تو دونوں گھروں کے مرد اکٹھے اور خواتین اکٹھی ہو کر جاتیں۔ غرض دونوں گھرانے آپس میں شیر و شکر تھے۔ جب کہیں اکیلے میں ان کے یا ہمارے گھر سے کوئی کسی شادی غمی میں چلا جاتا تو لوگ باقاعدہ پوچھتے تھے کہ آج آپ کے ساتھ والے کہاں ہیں؟

سردار دارا سنگھ گھریلو اور نہایت نجی قسم کے مسائل پر مجھ سے مشورہ لیتے اور میں بھی ان کے سامنے اپنے مسائل کی پوٹلی کھول دیتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کا کہنا مان لیتے۔ دارا سنگھ کے بیٹے بڑے تھے۔ پڑھائی میں تو اتنے خاص نہ تھے لیکن ویسے زمینوں میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ خوب گھبرو جوان تھے۔ میرے ہاں بیٹیاں بڑی تھیں جو کالج جاتی تھیں۔ بیٹے بھی ہائی سکول میں نویں دسویں میں تھے۔

ایک روز دارا سنگھ نے میرے گھر آ کر ایک انوکھی فرمائش کر ڈالی جس نے مجھے بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا۔ اس نے اپنے بڑے بیٹے رگھبیر کے لئے میری بڑی بیٹی زینب کا رشتہ مانگ لیا۔ دارا سنگھ کے لئے تو یہ فرمائش کر ڈالنا کوئی اتنا مسئلہ نہ تھا کہ اس کا بیٹا تھا مسئلہ میرے لئے آن پڑا کہ میں کیسے اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک غیر مسلم کے ہاتھ پکڑا دیتا۔ اب میں اگر انکار کرتا ہوں تو اس نازک موقع پر برسوں کے تعلقات اور بھائی چارہ جانے کا

خدشہ تھا۔ یوں دونوں گھرانوں کی آپس میں بدمزگی پیدا ہونے کا قوی امکان تھا۔ کم از کم میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا گھر چاروں طرف سے سکھ برادری کے گھروں میں گھرا ہوا تھا۔ میرے رشتہ دار اور عزیز و اقارب سب ذرا دور رہتے تھے۔ دارا اور میں دوست بھی تھے اور پڑوسی بھی۔ کہتے ہیں ہمسائے ماں باپ جائے۔ مصیبت میں سب سے پہلے پہنچنے والے ہمسائے ہی ہوتے ہیں۔ عزیز و اقارب تو آتے آتے پہنچتے ہیں۔

رشتہ حاصل کرنے کی آس میں دارا سنگھ کے گھر والوں کی ہمارے گھر میں آمد و رفت معمول سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی۔ ادھر ہم دونوں میاں بیوی سوچ سوچ کر ہلکان ہونے لگے کہ انہیں کیا جواب دیں اور کیسے دیں۔ اگر ہم مذہب کو آڑ بنا کر جواب دے دیتے ہیں یعنی انکار کر دیتے ہیں تو ہمیں پہلے سوچنا چاہئے تھا کہ ہماری آپس میں راہ و رسم بھی اتنی رہتی جہاں سے با آسانی واپسی ہو سکتی۔ اس وقت وہ دونوں گھرانوں نے یہ سوچا بھی نہ تھا۔ اپنے دھرم کے معاملہ میں دارا سنگھ بھی واہ گرو کا کٹر خالصہ تھا۔ وہ باقاعدگی سے گوردوارے ماتھا ٹیکنے جاتا تھا۔ بسا اوقات اس کا سارا پریوار بھی اس کے ساتھ جاتا۔ میں دارا سنگھ کو حکمت سے ٹالنا چاہتا تھا اور وہ میرے سر پر سوار تھا کہ میں اسے ہاں یا نہ کا فوری جواب دوں۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اسے اتنی کیا جلدی تھی ملکی حالات دگرگوں تھے۔ دونوں طرف وسیع پیمانے پر ہجرت جاری تھی۔ ہر طرف قتل و غارت گری عصمت دری اور لوٹ مار کی خبریں آ رہی تھیں۔ ایسے میں دارا سنگھ مجھ سے ضد لگا کر بیٹھ گیا کہ بیٹی کا رشتہ دو۔ اس حوالے سے اس نے اپنے گھر والوں کو بھی ذہنی طور پر اتنا مائل کر ڈالا تھا کہ انہوں نے تو ہمارے گھر میں چھاؤنی ہی ڈال رکھی تھی۔ ہر وقت ان کے گھر کا کوئی نہ کوئی فرد ہمارے گھر میں آیا ہوتا۔

ملکی حالات کے پیش نظر سکول کالج بند ہو گئے تھے۔ میں بھی گھر بیٹھ گیا، اسی مخمصے میں میرے دن گزرنے لگے کہ میں دارا کو انکار کیسے کروں۔ کروں تو کیا کروں۔ نہ جانے اس کا ردعمل کیا ہو۔ وہ بہت اڑیل اور اپنی ہٹ کا پکا تھا اسے جتنا میں جانتا تھا اتنا کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس نے تو اس انکار کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ عین ممکن تھا وہ دشمنی پر اتر آئے جس کا میں ان حالات میں متحمل نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ دارا نے کوئی چیز مانگی ہو اور میں نے انکار کر دیا ہو یا میں نے کوئی بات کہی ہو تو اس نے نہ مانی ہو۔ مگر ایسا تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ میں اس آزمائش میں پڑ جاؤں گا۔ دارا سنگھ نے مجھے عجیب مشکل میں ڈال دیا تھا۔

میں نے یہ بات جب اپنے رشتہ داروں اور عزیز و اقارب کے سامنے رکھی تو انہوں نے اس کی مخالفت میں رائے دی اور کہا کہ رشتے ہمارے گھروں میں موجود ہیں۔ ضرور ایک غیر قوم میں کرنا ہے۔ تعلقات اور مراسم اپنی جگہ لیکن دین مذہب بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ دارا سنگھ کی یہ ضد ٹھیک نہیں۔ پھر حالات ایسے ہیں کہ نئے ملک پاکستان کی جانب وسیع پیمانے پر ہجرت جاری ہے۔ یہ دو الگ الگ ملک ہوں گے پھر پیچھے کون آ جا سکے گا۔ لوگ اپنی جائدادیں اور بھرے پُرے گھر اور کاروبار چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ ایسے میں دارا سنگھ کو نا معلوم کیا سوجھی ہے۔ غرض سب نے اس رشتہ کے خلاف رائے دی۔

میں نے انہیں یہ بھی دلیل دی کہ ضلع گورداسپور پاکستان کے حصہ میں آئے گا ہم کہیں نہیں جائیں گے لیکن اندر سے میرا ضمیر مجھے مان کر نہیں دے رہا تھا۔ پھر جب دارا سنگھ کا اصرار بڑھ جاتا تو میں نے کہا کہ دیکھ دارے، آج کل ملکی حالات بہت خراب ہو رہے ہیں۔ دونوں طرف سے لوگ آ جا رہے ہیں۔ نا معلوم کوئی کہاں ہو گا

لڑکوئی کہاں۔ اس معاملہ پر سوچ بچار کو ہم مؤخر کر دیتے ہیں۔ تاوقتیکہ وقت ہی کوئی فیصلہ کر دے۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ گورداسپور پاکستان بنے گا آپ تو پھر بھی کہیں نہیں جانے والے۔ واہ گورو کی کرپا سے ہم نے بھی خالصہ ماں کا دودھ پیا ہے وقت آیا تو ہم بھی یاروں کی خاطر جان لڑا دیں گے''۔ دارا نے چھاتی پر ہاتھ مار کر یہ بھاشن دیا۔

''دارا ہوش کے ناخن لو تمہیں شاید حالات کی سنگینی کا مکمل ادراک نہیں۔ گورداسپور کا نقشہ ایسا ہے کہ ہندوستان اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ حیدر آباد اور جونا گڑھ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں''۔

''تو میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں''۔ دارا نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ''اچھا چلو ایسا کرتے ہیں کہ ابھی صرف سگائی (منگنی) کر لیتے ہیں اور شادی جب حالات ٹھیک ہوں گے تب کر لیں گے۔ یہ تو نور عالم تمہیں منظور ہوگا نا۔ یا یہ بھی نہیں؟''

''تم میری بات نہیں سمجھے دارا سنگھ!'' میں نے کہا۔ ''یہ موقع بچوں کی منگنی یا شادی بیاہ کا نہیں، نہ جانے ہم کہاں ہوں گے اور آپ کہاں۔ ہر طرف سے بری بری خبریں آ رہی ہیں۔ موقع کی نزاکت کو سمجھو''۔ میں نے اسے قائل کرنے کے سے انداز میں بات کی لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اسے صرف ہاں یا نہ میں جواب چاہیے تھا اور اسے یہ جواب لینے میں بہت جلدی تھی۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے دارا کا اصرار بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ دارا کی بیٹیوں نے بھی ہمارے گھر آ کر نبیب کو بھابو کہنا شروع کر دیا اور پہروں میری بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اس سے اپنا پیار جتاتیں اور اس کے سامنے اپنے بھائی رگھبیر کی تعریفیں کرتی نہ تھکتی تھیں۔ حالات کی نزاکت کے باعث میں دارا کے گھرانے سے اپنے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دارا کے تیور بھانپ لیے تھے اور پھر مجھے اس کی عادات واطوار کا بھی بہ خوبی علم تھا۔ وہ کوئی بات کہتا اور آگے سے کوئی انکار کر دیتا اسے وہ اپنی ہتک سمجھتا اور یہ ہتک اور بے عزتی اس سے برداشت نہ ہوتی۔ اسے انکار سننے کی عادت نہ تھی۔

آخر اسی شش و پنج میں ایک دن یہ روح فرسا خبر ملی کہ ضلع گورداسپور بھارت میں شامل کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہاں کے مسلمان پاکستانی علاقوں میں جائیں گے۔ مسلمان سکتے میں آ گئے ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہر کوئی سہما ہوا نظر آتا تھا۔ البتہ سکھ اور ہندو خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے۔ کہ انہیں کہیں نہیں جانا پڑے گا اور یہ کہ مسلمانوں کے چھوڑے ہوئے مکانات، جائدادیں اور زمینیں ان کے قبضہ میں ہوں گی۔

اس کے ساتھ ہی گورداسپور سے مسلمان آبادی کا انخلاء شروع ہو گیا، لوگ ڈرے ہوئے ہوتے تھے۔ ان تک پہلے ہجرت کرنے والے قافلوں کے حالات و واقعات پہنچ چکے تھے۔ بہر حال مسلمانوں کو یقین دلایا جانے لگا کہ انہیں باقاعدہ فوج کی نگرانی میں اپنی منزل مقصود تک پہنچایا جائے گا لیکن کسی کو بھی اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس سے پہلے اس طرح کے واقعات ہو چکے تھے۔ جب اس طرح کی حفاظت کے باوجود بھی مسلمان قافلوں پر شب خون مارے گئے اور بے دریغ قتل و غارت اور عصمت دری کے واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ حفاظتی فوج نے بھی ان واقعات سے چشم پوشی کی یا سرے سے فوج غائب رہی۔

ادھر شہر میں کئی ایک قبضہ گروپ بن چکے تھے۔ وہ مسلمانوں کے گھروں میں آتے اور انہیں فوری طور پر گھر چھوڑنے پر مجبور کرتے۔ بعض جگہوں پر آتش زنی کی وارداتیں بھی ہوئی تھیں۔ وہ مسلمانوں کے مکان چھوڑنے سے پہلے ہی گھروں پر قبضہ چاہتے تھے باہر کی

محلہ میں بار بار اعلانات ہو رہے تھے کہ مسلمان گورداسپور چھوڑ دیں۔ انہیں بحفاظت اپنی منزل مقصود تک پہنچایا جائے گا۔

ہم بھی اپنا رختِ سفر باندھنے لگے۔ طے یہ پایا کہ سب رشتہ دار مل کر ہمارے گھر آ جائیں گے اور یہاں سے قافلہ کی صورت میں نکلیں گے کیونکہ شہر سے نکلنے کے لئے راستہ ہمارے گھر کے سامنے سے ہو کر گزرتا تھا۔ اچھا خاصا دن چڑھ آیا تھا جب ہمارے رشتہ دار اور عزیز و اقارب ہمارے گھر کے سامنے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ وہ اپنے ساتھ گھریلو سامان سے لدے ریہڑے بھی لاتے تھے جن کے آگے بیل اور گائیں جتی تھیں۔ مویشی چونکہ گھر کے تھے یہی خیال تھا کہ اسی بہانے یہ بھی پاکستان پہنچ جائیں گے اور وہاں کام آئیں گے۔ ہم نے تیاری تو رات ہی سے روع کر دی تھی۔ ہم بچا کھچا ضروری سامان ریہڑوں پر رکھ رہے تھے کہ دارا سنگھ اور اس کے دونوں بیٹے ہمارے گھر کے سامنے آ گئے۔

''جا رہے ہو نور عالم؟'' دارا سنگھ نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں دارے!'' میں دارے کو گلے لگانے کے لئے آگے بڑھا۔

''ٹھہرو نور عالم! ہماری امانت تو دیتے جاؤ''۔

''کون سی امانت..... میں سمجھا نہیں؟''

''اتنے بھولے بھی نہ بنو''۔ دارے نے کہا۔ ''میرا مطلب ہماری بہو زینب سے ہے، وہ میرے بیٹے رگھبیر کی منگ ہے، یہ ادھر ہی رہے گی''۔

''کیا کہہ رہے ہو دارے سیاں؟'' میں نے ٹپٹا کر کہا۔ ''یہ رشتہ کب طے ہوا تھا؟''

''ہوا تھا یا نہیں ہم تو اسے اپنے گھر کی عزت مانتے ہیں اور یہ ہمارے گھر میں رہے گی۔ یہ تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی''۔ دارا دھمکی آمیز لہجے میں گویا ہوا۔

''ضد نہ کرو دارے!'' میں نے اس سے کہا۔ ''ہمارا بڑا اچھا بھائیوں کی طرح وقت گزرا ہے۔ ہمارے ہاں ہمیشہ یگانگت اور بھائی چارے کی فضا قائم رہی ہے ہم اچھی یادیں لے کر ایک دوسرے سے رخصت ہوں۔ یہ یادگار وقت تھا اسے یادگار ہی رہنے دو۔ اسے اپنی ناجائز ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے داغدار نہ کرو''۔

''کچھ بھی ہو زینب کو تم نہیں لے جا سکتے۔ یہ اس گھر کی بہو ہے''۔ دارا تلخ لہجے میں مخاطب تھا۔

''ہاں چاچا! یہ میری منگ ہے اسے چھوڑ دے''۔ یہ دارے کے بڑے بیٹے کی آواز تھی جو بڑھک کے مشابہہ تھی۔

''دیکھو دارے! میں سب کچھ چھوڑے جا رہا ہوں۔ اپنا گھر چھوڑ رہا ہوں، اراضی چھوڑ رہا ہوں اور کیا چاہئے تمہیں اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے جا رہا ماسوائے ان بچیوں کے یہ میری اولاد ہے میرا خون ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟'' میں نے دارے کو سمجھاتے ہوئے بات کی۔ ''ہمیں جانے دو ہمارا وقت برباد نہ کرو، ہمارے راستہ سے ہٹ جاؤ''۔

''تمہیں کون روک رہا ہے، ہم تو صرف اپنی چیز اپنے پاس رکھ رہے ہیں''۔

''بھلا تمہاری چیز کیسے ہو گئی؟ کیا کوئی نسبت طے ہوئی تھی۔ اگر ہو بھی جاتی تو جب تک نکاح نہ ہو جائے اور باپ اجازت نہ دے بیٹیاں یوں گائے بھینسوں کی طرح پکڑائی نہیں جاتیں۔ تم خود بیٹیوں والے ہو دارے! ذرا سوچو تو!''

لیکن دارا اور اس کے بیٹے ہمارے راستے میں تن کے کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے کرپانیں نکال لیں، وہ سمجھنے یا سمجھوتہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ برسوں کے تعلقات اور بھائی چارہ کو انہوں نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا مجمع

ٹک گیا تھا۔ وہ گھر اب ہمارا کب رہا تھا اس کے تو درو دیوار ہمارے دشمن بنے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا ہمیں نکال باہر کرنے کو تیار تھے۔

''دیکھو چاچا! اگر ہم اس فاختہ کو چھوڑ بھی دیں تو راستہ میں خالصہ سرکار کے کتنے باز بیٹھے ہیں وہ اسے نوچ ڈالیں گے۔ یہاں یہ ہماری حفاظت میں رہے گی۔ جب امن ہو جائے گا تو پھر آ کر اپنی امانت لے جانا''۔ دارے کا بیٹا پھر گویا ہوا۔

''احمقوں جیسی باتیں نہ کرو رگھبیر کاکے!'' میرا بڑا بیٹا للکارا۔

''ٹھہر تجھے تو میں دیکھ لیتا ہوں''۔

دونوں اطراف کے بڑے بوڑھے اور بزرگ درمیان میں آن کھڑے ہوئے اور بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگے۔ جو مدتوں سے اکٹھے رہتے آئے تھے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساجھے دار تھے آج ایک دوسرے کی جان کو آ رہے تھے۔ دارا اور اس کے بیٹے تو آپے سے باہر ہو رہے تھے۔

''دارا! پتر ان مُسلوں کا راستہ چھوڑ دے انہیں جانے دے''۔ ایک بزرگ سکھ نے کہا۔ ''اپنے ہاتھ خون سے مت رنگ۔ ان کا پاکستان ان کی پہنچ سے بہت دور ہے۔ یہ وہاں خیریت سے پہنچے تو تب ناں۔ راستے میں ہی ان کے ٹکڑے ہو جائیں گے''۔

''اس لئے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ ہماری امانت ہمیں دے جائیں ہم اس کی اپنی جان سے بڑھ کر حفاظت کریں گے''۔ دارا بولا۔

''نہیں پتر انہیں جانے دے، ان کی منزل کھوٹی نہ کر''۔ ایک بوڑھے سے سکھ نے دارے کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''خواہ مخواہ جانے دیں چاچا جگندرا! واہ گورو کی فتح...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''نہیں پتر کسی کی مان بھی لیتے ہیں...... یہ میری طرف دیکھ میں تیرے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں...... واہ گورو کی جے!''

''اچھا پھر اگر ان کی یہی ضد ہے تو یہ چلے جائیں لیکن اگر راستہ میں کوئی گڑبڑ ہو گئی یا انہیں نقصان پہنچا تو پھر ہمیں الزام نہ دینا''۔

''راستہ کی یہ جانیں اور ان کے مقدر، یہاں سے تو انہیں جانے دے''۔ بوڑھے سکھ نے اپنی بات مکمل کی۔ دارا نے راستہ چھوڑ دیا اور بیٹوں کو بھی پیچھے ہٹا لیا۔

قافلہ چل پڑا۔

مگر نہایت سُست رفتاری سے۔ کوئی فوج وغیرہ نہ آئی۔ جلد ہی رات چھا گئی سڑک سے ہٹ کر ایک جگہ پڑاؤ ڈالا گیا۔ خواتین اور بچوں کو مردوں اور جوانوں نے اپنے حصار میں لے لیا اور ان پر پہرہ دینے لگے۔ رات خیریت سے گزر گئی قافلہ صبح پھر روانہ ہوا۔ اپنے محبوب وطن پاکستان کی ایک جھلک دیکھنے کا مشتاق ان دیکھی منزل کا قافلہ دن بھر چلتا رہا۔ دوسری رات آ گئی۔

گزشتہ رات کی طرح مردوں نے عورتوں اور بچوں کو اپنے حصار میں لے لیا اور پہرہ شروع ہو گیا۔ قریب دو بجے رات زبردست شور کے ساتھ قافلہ پر دو اطراف سے حملہ ہو گیا۔ حملہ آور پوری طرح مسلح تھے جن میں اکثریت سکھوں کی تھی۔ سکھوں نے اکثر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے اور چہرے چھپائے ہوئے تھے۔ مسلمان جوانوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ان کے پاس چاقو، بھالے اور چھویاں (کلہاڑیاں) تھیں۔ انہوں نے بھی حملہ آوروں کا خاصا نقصان کیا لیکن ان کا حملہ بڑا منظم تھا اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ آسمان صاف تھا اور چاند بھی خوب چمک رہا تھا۔ ہر سو چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ حملہ آور تو اپنے ساتھ مشعلیں بھی لائے تھے جن سے کافی روشنی آ رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ یہ دارا سنگھ اور اس کے

بیٹوں اور بعض دوسرے سکھوں کا جتھا تھا جن کو میں پہچانتا تھا۔ اکثر سکھ گھوڑیوں پر سوار تھے۔ وہ گھوڑیاں دوڑاتے اور مسلمانوں کے مجمعے پر چڑھا دیتے اور ساتھ کرپانیں بھی چلاتے۔ جس سے مسلمانوں کے قافلہ کا کافی نقصان ہو رہا تھا۔

دوبدو لڑائی میں نوجوان مسلمان سکھوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے۔ سکھ قافلے میں کسی طرح نوجوانوں کے حصار کو توڑ کر قافلے میں گھری ہوئی خواتین تک پہنچنا چاہتے تھے۔ آخر موقع پا کر وہ خواتین تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ خواتین نے بھی لاٹھیوں وغیرہ سے مزاحمت کی لیکن کہاں تک۔ وہ ایک ایک خاتون کا چہرہ دیکھتے اور اسے پہچاننے کی کوشش کرتے۔ آخر انہوں نے زینب کو پہچان لیا اور اسے پکڑ لیا اسے اٹھا کر گھوڑی پر ڈال کر ایک سکھ نے مجمع کا حصار توڑتے ہوئے گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ میرے بڑے بیٹے نے جب یہ دیکھا تو اس نے ایک گھوڑسوار پر چھوی کا زوردار وار کر کے اسے اپنی گھوڑی سے گرا دیا اور خود کود کر گھوڑی پر سوار ہو گیا اور اپنی بہن کو اٹھا لے جانے والے سوار کے پیچھے گھوڑی لگا دی۔

اس کے بعد میرا بیٹا واپس آیا نہ اس کی بہن اور میں دونوں کا انتظار کرتا رہ گیا۔ میری بیوی، دوسرا بیٹا اور بیٹی مارے گئے۔ ہم باقی ماندہ لٹے پٹے مسافر آگے کے رہے نہ پیچھے کے۔ مجھے اور میری طرح کے بدنصیبوں کو اپنی اولاد کا غم سہنے کے لئے زندہ چھوڑ دیا گیا۔ ہم اپنی جانوں کو گھسیٹتے پاکستان پہنچ گئے لیکن سچ پوچھیں تو میں اپنا جسم تو سلامت لے کر پاکستان پہنچ گیا لیکن میری روح زخموں سے چُور چُور تھی۔ میرے دونوں بیٹے، بیٹیاں اور اہلیہ پاکستان پر قربان ہو گئے۔

پاکستان بننے کے بعد مغویہ خواتین اور بچیوں کی بازیابی کے لئے جو دو طرفہ کمیشن بنائے گئے میں ان کے ساتھ اپنی بیٹی زینب کی بازیابی کے لئے بھارت گیا کہ وہ مجھے مل جائے۔ پولیس اور کمیشن کی معیت میں ہم گورداسپور تھے گھر دیکھا جس کے آنگن میں میرے بچے اور بچیاں پلی بڑھیں اور کھیل کودی تھیں، اب اس گھر میں دارا کا بڑا بیٹا رگھبیر رہتا تھا۔ اس کے نام کی باہر تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے سابقہ گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔
زینب نے دروازہ کھولا، مجھے دیکھ کر اس کی چیخیں نکل گئیں وہ مجھ سے لپٹ کر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

اس کے پیچھے دارا کا بڑا بیٹا رگھبیر کھڑا تھا۔ میں اندر گیا۔ سامنے چارپائی پر دو جڑواں بچے پڑے تھے۔ میری بیٹی مجھ سے منہ چھپانے کو دوڑ گئی۔ میں نے بھائی کا پوچھا تو وہ پھر چیخنے لگی۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ ہمارے پیچھے پہنچ گیا تھا۔ اس نے ہمیں اپنی گھوڑی سے گرا دیا تھا۔ دوبدو لڑائی میں رگھبیر نے اپنی کرپان اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور اس نے وہیں جان دے دی۔ مجھے زبردستی یہاں لایا گیا اور مجھ سے شادی کر لی گئی۔ میرے ہاں یہ جڑواں بچے ہوئے۔ دارا سنگھ تو اس دنیا میں نہیں وہ بھی فسادات میں مارا گیا تھا۔

''کیا وہ میرے ساتھ پاکستان چلے گی؟'' میں نے بیٹی سے کہا۔

''کس منہ سے جاؤں پاکستان ابو جانی! میرے پاس کیا رہا ہے؟'' اس نے سسکتے ہوئے جواب دیا۔
''آپ کا پاکستان آپ کو مبارک ہو''۔

میں بیٹی کو روتے بلکتے چھوڑ کر واپس آ گیا۔ میری اکیلی جان ہے۔ اگست کا مہینہ آتا ہے تو مجھے ہنساتا بھی ہے اور رُلاتا بھی ہے۔ آزادی بہت بڑی نعمت ہے لیکن یہ آزادی اور اپنا آزاد وطن ہم نے بہت قربانیاں دے کر حاصل کیا ہے۔ اس کی قدر کریں۔ یہ کہتے ہوئے ماسٹر نور عالم کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور وہ اپنے رومال سے آنسو صاف کرنے لگ پڑے۔

طب وصحت

دستِ شفاء

اگر آپ کا بچہ بولتا نہیں......

ڈاکٹر رانا محمد اقبال (گولڈ میڈلسٹ)
0321-7612717
ڈی۔ایچ۔ایم ایس (DH.Ms)
ممبر پیرا میڈیکس ایسوسی ایشن پنجاب
ممبر پنجاب ہومیو پیتھک ایسوسی ایشن
شعبۂ طب ونفسیات

رپورٹس اور خطوط پر اپنا موبائل نمبر لازماً لکھیں

اس ماہ کے شمارے میں جو کیس میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں وہ کئی لحاظ سے بہت ہی اہم اور منفرد بھی ہے۔ منفرد اس لحاظ سے کہ اس میں انسانی سوچ کی ایک بہت ہی گھٹیا قسم کا کردار بھی شامل ہے جس کی وجہ سے یہ کیس پایۂ تکمیل کو نہ پہنچتے پہنچتے ایک سازش کا شکار ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے یہ میرے لئے ایک ناقابلِ فراموش کیس ہے۔

یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب آج سے تین سال قبل جب کہ دست شفاء کا ایک دفتر/کلینک اکبر چوک گلستان کالونی نمبر ا فیصل آباد میں بھی تھا اور میں ہفتے میں 4 دن وہاں پر مریضوں کو دیکھا کرتا تھا اور ذاتی رہائش بھی وہاں پر تھی۔ لاہور میں اس سے قبل میں دو عدد گونگے بچوں کے کیس بڑی کامیابی کے ساتھ کر چکا تھا۔ ایک کیس میں خوشاب کی ایک بچی تھی جس کی عمر تقریباً 12 سال تھی جو کہ بالکل ہی بولتی نہ تھی، ڈاکٹروں کو چیک کروایا تو انہوں نے بتایا کہ زبان میں کوئی فالٹ نہیں لیکن زبان سے دماغ تک کے Nerves کام نہیں کر رہے۔ جب اس کی ہسٹری لی گئی تو معلوم ہوا کہ بچپن میں بچی کو ٹائیفائیڈ بخار ہوا تھا جو کہ تقریباً پندرہ بیس دن تک رہا۔ ایلوپیتھک علاج کرایا گیا جس سے بخار تو اتر گیا مگر مذکورہ بچی جو کہ پہلے ''ماما پاپا'' کہتی تھی اب بالکل خاموش گونگی ہو گئی اور ''اوں آں'' کے سوا کوئی آواز نہ نکال سکتی تھی۔ جب کیس میرے پاس آیا اور میں نے چیک کیا تو اندازہ ہوا کہ ابھی تک اندرونی بخار موجود ہے جو کہ ختم

نہیں ہوا۔ سپیشلسٹ ڈاکٹروں کی رائے سے میں نے پورا اتفاق کیا کہ زبان سے دماغ تک جانے والے Nerves بالکل کام نہیں کر رہے لہٰذا اس بات کو بنیاد بنا کر میں نے اس کا علاج شروع کیا۔ عرصہ تین ماہ کے اندر ہی اس میں بہتری کے آثار نمودار ہوئے اور بچی نے چند الفاظ ادا کرنے شروع کر دیئے اور اگلے تین ماہ بھی تواتر کے ساتھ کیس میں ترقی ہوتی رہی تاہم یہ قسمت کی ہی بات ہے کہ سردیوں کے دن تھے جب بچی کو اچانک نمونیہ ہو گیا اور پھر وہ اللہ کو پیاری ہو گئی ورنہ وہ پاکستان میں فرسٹ کیس ہوتا کہ ایک گونگی بچی مکمل بولنے لگی ہوتی۔ تاہم قدرت کو جو منظور ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے اس کے آگے کسی کا زور نہیں۔

دوسرا کیس بھی تقریباً اسی قسم کا تھا مگر وہ لوگ کسی وجہ سے علاج مکمل نہ کرا سکے اور علاج درمیان میں ہی چھوڑ دیا تاہم کسی قدر شفایابی ضرور ہوئی اب میں تیسرے اور اصل کیس کی طرف آتا ہوں۔

یہ کیس فیصل آباد سے تعلق رکھتا ہے۔ مریض لڑکے کی عمر تقریباً 16 سے 18 سال کے درمیان تھی۔ دیکھنے میں ہی نیم پاگل سا لگتا تھا مگر کسی کو نقصان نہیں دیتا۔ اشاروں کی زبان تھوڑی بہت سمجھ لیتا اور بازار سے سودا وغیرہ بھی لے آتا۔ اس کا بھائی جیولری کا کام کرتا ہے اس کے علاوہ ایک مکان اور سرگودھا میں باغات وغیرہ بھی ہیں۔ ایک روز میرے پاس آیا اور کہا کہ یہ بولتا نہیں۔ اس کا علاج کرنا ہے۔ میں نے اس کو بغور چیک کیا۔ دانت اور منہ بھی دیکھے۔ دانت بھی خراب اور منہ سے پانی بہہ رہا تھا۔ جیسا کہ اکثر نیم پاگل لوگوں میں ہوتا ہے۔ میں نے اس کو ایک ماہ کی دوائیاں دیں۔ اس کے بھائی نے جو کہ ہومیو پیتھک سے قدرے واقفیت رکھتا تھا دوا پوچھی مگر میں نے نہ بتائی اور کچھ احتیاطیں بتائیں۔

جب ایک ماہ ہوا تو وہ میرے پاس دوبارہ نہ آیا میں نے اس سے ملاقات کی تو اس کا بھائی کہنے لگا کہ کوئی فرق نہیں لہٰذا علاج نہیں کرانا (حالانکہ میں نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ کم از کم چار سے چھ ماہ تک علاج ضرور کرائیں۔ میرے دل کو اس کی بات سے اطمینان نہ ہوا تو میں نے خود اس کے بھائی مریض سے ملاقات کی۔ اس سے اشاروں میں بات کی تو اندازہ ہوا کہ جیسے وہ ازخود بولنے کی کوشش کر رہا ہے اور جملوں کے Starting الفاظ اس کی زبان سے نکلنے والے ہوں۔ میں نے اس بات کو بہت اچھی طرح نوٹ کیا اور پھر واپس آ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ دوائیاں اپنا کام کر رہی ہیں اور مریض خاصا بہتر ہو رہا ہے۔ مگر اب میں ان کی اجازت کے بنا علاج نہیں کر سکتا تھا تاہم میں نے اس کی وجوہات پر غور کرنا شروع کیا اور کئی دن غور کرتا رہا تو آخر جو بات سمجھ میں آئی خدا معاف کرے کہ انسان اتنا گھٹیا بھی ہو سکتا ہے۔ وجہ صرف یہ سمجھ میں آئی تھی کہ مریض لڑکا سوتیلا تھا۔ بڑا بھائی پہلی بیوی سے تھا جو فوت ہو گئی تھی۔ باپ نے دوسری شادی کر لی۔ چھوٹا بھائی دوسری بیوی سے پیدا ہوا تھا۔ بڑے بھائی کی سوچ یہ تھی کہ آج یہ مجبور اور ذہنی معذور ہے میری ہر بات بے چوں و چرا مان رہا ہے اگر ٹھیک ہو گیا تو نہ صرف میرے ماتحت رہنے سے انکار کر دے گا بلکہ اس کو جائیداد سے حصہ بھی دینا پڑے گا اور جو میری ٹھاٹھ باٹھ ہے وہ ختم ہو جائے گی۔ اس نے اپنے بھائی کے اچھے مستقبل کا نہ سوچا بلکہ اپنی انا اور مطلب کو آگے رکھا۔ اللہ ایسی گھٹیا سوچ سے سب کو بچائے آمین!

یہ باتیں مجھے ان کے ایک رشتے دار کے ذریعے معلوم ہوئی تھیں اور ان کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ بہ حیثیت ایک معالج اور مسیحا یہ بات میرے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی۔ مجھے اللہ کے بھروسے اس بات کا یقین تو کہ یہ لڑکا ٹھیک ہو جائے گا مگر میں زبردستی اس کا علاج

اندھیرے سے اجالے تک

یہ ہونے اور نہ ہونے کو بھی ہم نے اپنی مرضی پر کیوں ڈھال رکھا ہے۔ بس ہمیں وہ ہی ہونا چاہئے جو ہمارا خدا چاہتا ہے

شک اور یقین

☆ رمیز احمد 0331-5178929

انسان اپنے آپ کو جتنا مضبوط سمجھتا ہے اتنا ہو جاتا ہے۔ جتنا دکھی سمجھتا ہے وہ اتنا دکھی ہو جاتا ہے۔ جتنا بیمار سمجھتا ہے وہ اتنا بیمار ہو جاتا ہے۔ اگر بیمار اپنے آپ کو تندرست سمجھے تو تندرست ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ بس سمجھ سمجھ کی بات ہے۔ سمجھ جاؤ تو تم سمجھدار ہو اور سب کچھ پاس ہے تمہارے۔

یہ سب معاملہ یقین کا ہے۔ یقین جانو یقین سے بڑی کوئی دولت نہیں۔ یقین ہی ایک عام انسان کو خاص کرتا ہے اور خاص کو مقرب ہونے میں نسبتاً کم وقت لگتا ہے۔

لیکن یقین نے تو بے جان پتھر کو بھی خدا بنا ڈالا۔ تو یقین جان بر تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ جان لینے کی بھی قابلیت رکھتا ہے؟ تو کیا شک کی اہمیت بھی اپنی جگہ بے تحاشہ ہے؟ ہاں بالکل ہے کیونکہ کچھ پیڑھیاں پہلے اسی شک نے ہی تو ہمارے اجداد کو مسلمان کیا تھا۔

دو مخالف چیزیں اور دونوں کے فوائد ایک سے بڑھ کر ایک۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ پر ایسا ہی ہے۔ خدا یقین ہے، خدا ایمان ہے پر خدا غیر اللہ پر شک بھی تو ہے لیکن خدا تو ہر جائی ہے۔

قرآن وحدیث کے علاوہ ہر چیز پر یقین ہمیشہ شک میں مبتلا رہا ہے پر مبتلا تو ہر شئے ہے۔ ابتلا سے تو کسی کو فرار نہیں۔ کچھ لوگ مبتلا نہیں ہوتے تو وہ اپنے آپ کو مبتلا سمجھتے ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہی نہیں سمجھتے۔ کچھ لوگ جو خود کو سمجھتے ہیں وہ لوگ مبتلا نہیں ہوتے پر لوگ انہیں مبتلا سمجھتے ہیں۔ کوئی اپنے دکھ میں مبتلا ہے، کوئی کسی کے دکھ میں، کوئی چھوٹے دکھ میں مبتلا ہے، کوئی بڑے دکھ میں لیکن دکھ تو بڑا، چھوٹا نہیں ہوا کرتا...... ہاں، اپنا دکھ ہمیشہ بڑا لگتا ہے اور دوسرے کا دکھ ہمیشہ چھوٹا لگتا ہے لیکن لگنے اور ہونے میں دن اور رات سا فرق ہے۔

پھر بھی یہاں بڑا چھوٹا کچھ نہیں ہوا کرتا جس چیز کے بارے میں زیادہ سوچو وہ بڑی ہو جاتی ہے اور جس چیز کے بارے میں تھوڑا سوچو وہ چھوٹی ہو جاتی ہے۔ تو کیا ہمیں سوچنا چھوڑ دینا چاہیے؟ نہیں ہمیں سوچنا سیکھ لینا چاہیے، ہمیں دھیان کو استعمال کرنا آنا چاہیے۔ ہمیں یقین کو استعمال کرنا آنا چاہیے۔ یہ سب معاملہ یقین کا ہے۔ یقین سے بڑا کوئی محافظ نہیں لیکن بہترین محافظ کو اگر سمجھایا نہ جائے سکھایا نہ جائے تو اس سے بڑا کوئی دشمن بھی نہیں بن سکتا۔

ہر پاگل پن ہر نفسیاتی مرض کسی نہ کسی یقین کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں اور اس میں شک شامل کرنا ہی اس کا علاج ہے۔ بس کامیاب[illegible] ...رتو سوچ اور یقین کی سمت درست کر لو کیونکہ سمت غلط ہو تو رفتار کی تیزی بھی خسارہ ہوا کرتی ہے۔

ہر کام سوچ کی یکسوئی اور یقین کامل سے ہو سکتا ہے۔ خدا کو تلاش کرنے والے بھی اکثر یقین کے گھوڑے کو ہی بے نیازی کی خوراک دے کر اسے طاقتور بناتے ہیں اور اس گھوڑے پر بیٹھ کر سفر کا پتہ بھی نہیں چلتا لیکن اگر گھوڑے کو نیازمندی اور شک کا زہر دے کر مار ڈالا جائے تو اپنی عقل کی ناتواں ٹانگوں پر انسان سفر کرتے کرتے تھک جاتا ہے پر منزل نہیں ملتی۔

بُری صحبت کا اثر

وہ دونوں بھائی تالاب کے کنارے بیٹھے بہت دلچسپ کھیل کھیل رہے تھے۔ چھوٹا بھائی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے ایک لکڑی کے ساتھ لوہے کی کچھ چیزیں باندھتا اور اس کو تالاب میں چھوڑ دیتا جو تیرتے ہوئے تالاب کے دوسری طرف بیٹھے اس کے بڑے بھائی تک پہنچ جاتی لیکن اس بار...... اس بار اس سے نہ جانے کیا غلطی ہوئی تھی کہ وہ لکڑی اور لوہے کی چیز دونوں ڈوب گئے۔ وہ رونے لگ گیا۔ اس کے سمجھا[illegible] ''دیکھو۔ دونوں چیزیں مخالف خصوصیات رکھتی ہیں۔ لکڑی پانی پر تیر سکتی

ہے اور لوہا ڈوب جاتا ہے اور اگر دونوں کو اکٹھا باندھ دیا جائے تو ان میں سے اسی کی خصوصیات اثر انداز ہوں گی جس کا وزن اور حجم زیادہ ہوگا۔ اگر لکڑی بڑی ہو تو وہ لوہے کو بھی ڈوبنے نہیں دے گی اور اگر لکڑی چھوٹی ہوئی تو لوہا اس کو بھی ساتھ لے ڈوبے گا اور یہاں ان کے ڈوبنے کی وجہ بھی یہ ہی ہے"۔

میں نے یہ دیکھا اور سنا تو سمجھ میں آیا کہ اچھا تو یہ بات ہے کہ ہمیشہ بڑی چیز ہی اثر انداز ہوتی ہے، ہمیشہ مضبوط کا اثر ہوتا ہے کمزور پر۔ ہم ہمیشہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو تاکید کرتے ہیں کہ برے لوگوں کی صحبت سے بچو۔ اصل میں ہم یہ کہہ رہے ہوتے ہیں کہ تمہاری اچھائی کمزور ہے اور اس کی برائی بہت مضبوط ہے وہ تمہیں لے ڈوبے گا۔ ہم یہ تاکید کیوں نہیں کرتے کہ تم اچھائی کو مضبوط کرو اتنے بڑے ہو جاؤ کہ وہ تمہیں ڈبو نہ سکے اور تم اسے پار لگا دو۔

کیا یہ ہی اصل چیز نہیں ہے؟ کیا ہم اپنے آپ کو اتنا کمزور سمجھتے ہیں؟ کیا ہمیں ڈوبنے کا خطرہ اس لئے نہیں کہ ہم اس کو پار لگانے کی طاقت نہیں رکھتے۔

کیا میں وہ نہیں ہوں جو مجھے ہونا چاہئے؟ یا مجھے وہ ہونے کا خطرہ ہے جو مجھے نہیں ہونا چاہئے۔ تو کیا میں کسی کو وہ نہیں کر سکتا جو اسے ہونا چاہئے؟ اور یہ ہونے اور نہ ہونے کو بھی ہم نے اپنی مرضی پر کیوں ڈھال رکھا ہے۔ بس ہمیں وہ ہی ہونا چاہئے جو ہمارا خدا چاہتا ہے اور اتنی شدت سے وہ ہونا چاہئے کہ اگر کوئی سیلاب بھی ہمارے اندر کی گرمی کو ٹھنڈا کرنے کے لئے آئے تو ہم پانی میں بھی آگ لگا دیں اور یہ اس وقت ہی ہو سکتا ہے جب ہمیں خود پر یقین ہو۔ یقین سے بڑا کوئی ہتھیار نہیں اور یقین سے زیادہ وزن بھی کسی چیز کا نہیں ہے اور اس سے زیادہ حجم بھی کسی چیز کا نہیں ہے۔ جو تم کو بھی پار لگا سکتا ہے اور تمہارے ساتھ لگنے والی ہر کم وزنی چیز کو بھی تو بس یقین کا وزن پیدا کرو اور پار لگا دو ہر ڈوبتی ناؤ کو۔

میں ان والدین کے خلاف بات نہیں کر رہا جو اپنی اولاد کو غلط صحبت سے بچنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ میں بس اتنا کہہ رہا ہوں کہ اپنی اولاد کو کمزور ہونے کا احساس مت دلایئے کہ تم ان کے بیچ جاؤ گے تو وہ تم کو بھی لے ڈوبیں گے، اپنے جیسا بنا لیں گے۔ ان کو کہئے کہ تم کو اس وقت وہاں جانے دیا جائے گا جب تم ہمیں اپنی مضبوطی کا یقین دلا دو گے اس طرح وہ بچ بھی جائیں گے اور دل سے مضبوط ہونے کی کوشش بھی کریں گے۔ مگر زندگی میں کہیں نہ کہیں تو ان کو برے لوگوں کا سامنا کرنا ہی پڑے گا اور اگر ان کو آپ کا یہ سبق یاد رہا تو وہ خود ڈوبنے کی بجائے سب کو پار لگا دے گا اور کسی کو ظلمات سے نور تک لے کر جانا ہی اصل احسان ہے اور والدین کا اپنی اولاد کو اس سے بڑا تحفہ کیا ہوگا کہ وہ انہیں احسان کی ترغیب دیں۔

○●○

تحریک آزادی!

شعراء میدان عمل میں

حالی، آزاد، اکبرالہ آبادی، جوہر برادران، ظفر علی خان اور علامہ اقبالؒ نے اپنے اشعار سے قوم کے تنِ مردہ میں آزادی کی شمع روشن کردی

☆ شازیہ محسن

14 اگست 1947ء قیام پاکستان کی صورت میں مسلمانوں کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہوگئی لیکن دو سو سالہ غلامی کی زنجیر کو توڑنے کے لیے کتنی قیمتی جانوں کی قربانی دینا پڑی، کتنی ماؤں کے لعل کٹ گئے، کتنی بیٹیوں کی عصمت قربان ہوگئی، کتنے نوجوان خون میں نہا گئے، کتنے بزرگ تہہ خاک ہوئے ان کی آہیں پایۂ عرش سے ٹکرائیں۔ اس کا اندازہ تو روز محشر ہی ہوگا مگر اس تمام جدوجہد میں بیرونی استبداد کے خلاف ہر طبقے کی کسی نہ کسی شکل میں جنگ جاری رہی۔ اس جدوجہد میں شعراء کرام نے جو کردار ادا کیا وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ ملک میں شرفا اور دانشوروں کا طبقہ ہی عوام الناس کی رہنمائی کرتا ہے لیکن جب وہ خود عضو معطل ہو جائیں تو پورے معاشرے پر جمود طاری ہو جاتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر ایک صاحب طرز شاعر تھے۔ لال قلعہ کی تباہی اور خاندان تیمور کی بربادی کا غم ان سے زیادہ کس کو ہوا ہوگا۔ کوئی اور ہوتا تو سر پھوڑ کر مر جاتا مگر جناب ظفر کا دل بھی بادشاہ تھا کہ رنج الم کے اس پہاڑ کو بھی اٹھا لیا۔ جب حرم شاہی سے نکل کر زنداں فرنگ میں پہنچے تو ایک آہ سرد کھینچ کے کہا۔

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں؟
ہوئے گا سر پہ چرخ بھی جائیں گے ہم کہاں؟
کوئی بلا ہے خانہ زنداں یہ آسماں

چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں
جو آ گیا اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہے وہ قید فرنگ میں

1857ء کے بعد جب انگریز کے پاؤں ہندوستان میں اچھی طرح جم گئے تو اس نے یہاں کے عوام اور خاص کر مسلمانوں سے چن چن کر بدلہ لیا۔ جب اس کی آتش انتقام شہیدوں کے خون سے بھی نہ بجھ سکی تو اس نے لاکھوں معصوموں کو بھی تختۂ دار پر کھینچا اور تنگ و تاریک قید خانوں میں جکڑ کر رکھ دیا۔ ان میں سے بعض کو تو آہ بھرنے کی مہلت بھی نہ ملی لیکن جنہیں زبان کھولنے کا موقع ملا تھا ان کا کلام آج بھی اتنا دردانگیز ہے کہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

انگریز حکومت کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف دار و گیر کا سلسلہ مدتوں جاری رہا۔ اگرچہ سرسید کی تحریک نے بہت سی غلط فہمیاں دور کردی تھیں لیکن بدیشی راج کے خلاف جو جذبہ ابھرا تھا، وہ کبھی سرد نہیں ہوا تھا۔ اس زمانے کے شعراء اگرچہ کھلم کھلا بغاوت کی تلقین نہیں کرتے تھے لیکن حب الوطنی کا ترانہ ہر ایک کے لب پر تھا۔ حالی، آزاد اور نظیر احمد وغیرہ نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے چونکا کر اپنے مستقبل کو سنوارنے کی ترغیب دی اور اکبر الٰہ آبادی نے طنز و مزاح کے کچوکے بھی لگائے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا:

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشین برٹش راج!
ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
طرح طرح کے بنا لو لباس رنگا رنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اور دول بھی ہے
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر!
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ ڈیم فول بھی ہے

لیکن اس زمانے میں بھی مولانا شبلی نعمانی کی نغمہ لَے میں تلخ نوائی کا عنصر نمایاں رہا اور انہوں نے ہر احتیاط کو خیرباد کہہ کے برملا کہا:

کوئی پوچھے تو اے تہذیب انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک؟
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک؟
عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے درخشاں کب تک؟

بیسویں صدی سے پہلے چوتھائی حصے میں اس برصغیر کے افق پر ایسے دو ستارے نمودار ہوئے جن میں سیاسی بصیرت کی روشنی کے ساتھ ساتھ شعلہ نوائی کی گرمی بھی تھی۔ ان میں ایک مولانا حسرت موہانی اور دوسرے مولانا محمد علی جوہر تھے۔ ان بزرگوں نے آزادی کی جدوجہد میں قید و بند کی جو صعوبتیں برداشت کیں وہ اکثر اشعار کے پیکر میں ڈھل جایا کرتی تھیں۔ مولانا حسرت موہانی فرماتے ہیں۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مصیبت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

اور مولانا محمد علی جوہر بدیشی استبداد کو للکارتے ہیں۔

دور حیات آئے گا قاتل سزا کے بعد
ہے ابتداء ہماری، تیری انتہا کے بعد

ستمبر 1917ء میں علی برادران کو باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں دو سال قید کی سزا ملی۔ اس موقع پر ایک نظم مولانا محمد علی جوہر کی والدہ محترمہ ''بی اماں'' کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہوئی لکھی گئی جو نا صرف ''بی اماں'' بلکہ ہر مسلمان کے دل کی آواز تھی۔

بولی اماں محمد علی کی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا
کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
پورے اس امتحان میں اترنا
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ہوتے اگر میرے سات بیٹے
کرتی سب کو خلافت کے صدقے
ہے یہی دین احمدؐ کے رستے
جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر سے حشر برپا کروں گی
پیش حق تم کو لے چلوں گی
اس حکومت پر دعویٰ کروں گی
جان بیٹا خلافت پہ دے دو

بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر 1937ء کا زمانہ اس برصغیر کے مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اہم تھا۔ 1906ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی اور 1937ء میں انڈیا ایکٹ کے مطابق ہندوستان کے پندرہ صوبوں میں سے گیارہ صوبوں میں کانگریسی وزارت قائم ہوئی۔ خودمختاری کا یہ سب سے بڑا اور بھرپور تجربہ تھا جو ہندوستان میں کیا گیا۔ اس تجربے نے ہندوستانی مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے آزادی کی جو شمع جلائی تھی اس نے بہت سے تاریک گوشوں کو منور کر دیا تھا۔ اگرچہ انہیں قید و بند کی بے انتہا صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں لیکن ان کی زبان کو بند نہ کیا جا سکا۔ انہوں نے بدیشی حکمرانوں کو للکارتے ہوئے کہا:

ازل کے روز سے بار امانت کا ہوں میں حامل
خدا کا فضل بے پایاں ہے میرے حال کو شامل
مسلمان ہوں میرا مقصود ہے آزادی کامل
قسم ہے سرور کونینؐ کی جان گرامی کی
کہ اک جھٹکے میں توڑ دوں گا میں زنجیریں غلامی کی
ثریا سے بھی اونچا دین قیم کا علم ہو گا
سرادائے ملت عرصہ تیغ و دوم ہو گا
موحد ہوں میرا سر غیر کے آگے نہ خم ہو گا
قسم ہے اشہب توحید کی محشر خرامی کی
اک جھٹکے میں توڑوں گا میں زنجیریں غلامی کی
نہیں ہے اک فقط معمورہ ہندوستان میرا
بنایا ہے وطن اللہ نے سارا جہان میرا
ہے اونچا ساری قوموں کے نشانوں سے نشان میرا
قسم ہے سطوت صغریٰ کی، یلغار دوامی کی
اک جھٹکے میں توڑ دوں گا میں زنجیریں غلامی کی

ابنائے وطن سے جو کچھ خوش فہمیاں وابستہ تھیں وہ ختم ہو گئیں اور پوری قوم اس بانگ درا پہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ وہ اپنے جادو کے زور سے مستقبل کے دریچے کھول کر لیلائے منزل کا رخ زیبا دکھا رہا تھا۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
تیرے علم و ہنر کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

○

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کی معجزہ نوائی سے ایک درماندہ شاہین کو پھر بال و پر عطا ہوئے اور پھر دنیا نے دیکھا 14 اگست 1947ء کو دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت اسلامی جمہوریہ پاکستان معرض وجود میں آ گئی۔

◆✲◆

داستانِ آزادی

پٹھان کوٹ سے پسرور تک

☆ مسافر

آخری قسط

مسافر اگست 1947ء میں اپنی بیوی اور چھوٹے چھوٹے دو بچوں کی سر کٹی لاشوں کو پٹھانکوٹ کے ایک جلتے ہوئے گاؤں میں چھوڑ کر چلا تھا۔ اس کے اس بھیانک سفر کی ڈائری جولائی میں شائع ہو چکی ہے۔ اب ایک عورت اسے پاکستان کی سرحد میں داخل کرتی ہے۔

کا غم یہی تھا۔ خدا نے تمہیں بچوں کے غم میں وہ سرور میں عطا کی ہے۔"....

میں نے کہنے کی کوشش کی تھی۔ نہیں کہہ سکا۔ مجھے اپنے بچے یاد آ گئے ہیں۔

"میں چل نہیں سکتی"۔ وہ کہہ رہی ہے۔ "مجھے اٹھا کر میرے بچوں کی قبروں کے پاس چھوڑ آؤ"۔ وہ سرگوشیوں میں بول رہی ہے۔ "دونوں میرے پاس سویا کرتے تھے، اکیلے ڈر رہے ہوں گے"۔

"تم خوش قسمت ہو جو بچوں کو دفن کر کے چلی ہو"۔ میں نے اسے کہا ہے۔ "میں اپنے بچوں کی لاشیں گلی میں چھوڑ آیا ہوں"۔

"میرے بچوں کا باپ بھی ....."

"میری بیوی کا سر بھی اپنے بچوں کے ساتھ ہی کٹ گیا تھا"۔ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا ہے۔ "آج ہندوستان میں رسول کی امت کا کوئی بچہ زندہ نہیں رہا۔ سب لٹ گئے ہیں۔ میں بھی اپنے بچوں کنوا آیا ہوں۔ تم بھی اپنے بچوں کنوا آئی ہو۔ اپنے بچوں کو رسول کی اُمت سے الگ نہ کرو۔ آؤ چلیں۔ تم مجھے اپنے بچوں کی باتیں سناتی چلنا، میں تمہیں اپنے بچوں کی باتیں سناتا جاؤں گا پھر پاکستان آ جائے گا"۔

"پاکستان کتنی دور ہے؟ کب آئے گا؟"

"آ ہی جائے گا"۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما ہے تو وہ میری آنکھوں میں یوں ٹکٹکی باندھے اٹھ کھڑی ہوئی ہے جیسے اسے میری آنکھوں میں پاکستان نظر آ رہا ہو۔

وہ میرے ساتھ چل پڑی ہے۔ اسے یقیناً میری آنکھوں میں پاکستان نظر آ گیا ہے۔

***

اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے یا شاید میرا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ میں دیکھ نہیں رہا، محسوس کر رہا ہوں۔ کبھی تو اس کا ہاتھ میرے ایک بچے کا ننھا سا ہاتھ بن جاتا ہے۔ کبھی میرے بچے کی ماں بھی ہوگی۔ وہ بھی شاید میرے ہاتھ کے لمس میں اپنے بچوں اور ان کے باپ کا لمس محسوس کر رہی ہے۔ تصوروں میں عجیب سی طاقت ہوتی ہے۔ یہ عجیب سی طاقت ہمارے جسم میں سرایت کر گئی ہے اور ہم چلے جا رہے ہیں۔ سورج غروب ہو گیا ہے۔

جس طرف سورج غروب ہوا ہے ہم اسی طرف جا رہے ہیں۔ ہر طرف اونچی نیچی ٹیکریاں ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن پر درخت کھڑے ہیں، کچھ بالکل ننگی ہیں۔ درخت بھوت بنتے جا رہے ہیں۔ ٹیکریاں راستہ روکے کھڑی ہیں۔ ہم گھومتے، مڑتے، ٹیکریوں پر چلتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی ڈرتا ہوں کہ گھومتے مڑتے واپس ہی نہ چلے جائیں۔ عقل نے ذرا ساتھ دیا ہے تو میں نے قطبی ستارہ دیکھ لیا ہے۔ اب کسی ٹیکری کے سرے سے مڑتا ہوں تو اس ستارے کو دیکھ لیتا ہوں۔

دور سے ایک بھیڑیے کے بھونکنے کی آواز آئی ہے۔ میری ہمسفر بھی اس آواز کو پہچانتی ہے۔ ڈر کر میرے ساتھ لگ گئی ہے۔

"نہ ڈرو..... کتا ہے"۔

"بھیڑیا ہے"۔ اور وہ اتنی زیادہ میرے قریب آ گئی ہے کہ مجھے مجبوراً اسے اپنے بازو میں لپیٹ لینا پڑا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کا بازو میری کمر کے گرد لپٹ گیا ہے۔

اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں دو قدم بھی نہ چل سکتا۔ جسم سے جان نکل گئی ہے۔ سچ پوچھئے تو میں تھک کر میں ہار گیا تھا۔ جی میں آئی تھی کہ یہیں جان دے دوں۔ اب یہ عورت میری پناہ میں آئی ہے تو خدا نے پھر سے میرے جسم میں جان ڈال دی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں بھیڑیے سے زیادہ خونخوار ہوں اور اسے بھیڑیے سے بچا لوں گا۔

ہاں، میں بھیڑیے سے زیادہ خونخوار ہوں۔ درندہ ہوں۔ اس عورت کے قریب جو بھی آیا اسے چیر پھاڑ دوں گا۔ میں ہندوستان کی کم از کم اس مسلمان عورت کو ہندوؤں، سکھوں اور بھیڑیوں سے صاف بچا کر پاکستان لے جاؤں گا۔ اس عزم کے زور پر میرے اس بازو کا گھیرا اور تنگ ہو گیا ہے جو اس کے دبلے پتلے، مظلوم مجبور اور غمزدہ جسم کے گرد لپٹا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں وہ چاہتی ہے کہ میں اسے اپنے اتنا قریب کر لوں کہ وہ میرے جسم کا حصہ بن جائے۔

میں نے اسے اپنے جسم کا حصہ بنا لیا ہے اور مجھے ایسا قرار سا محسوس ہونے لگا ہے جیسے پاکستان کی آبرو اور اسلام کی عصمت کو اپنے سینے میں سمیٹ لیا ہے۔ روح جاگ اٹھی ہے۔ جسم کا انگ انگ نئی زندگی لے کر ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے بیدار ہو گیا ہے۔

''تمہارا نام تو میں نے پوچھا ہی نہیں''۔

''میرا ایک سال کا جو منا ہے نا، وہ مجھے مم کہا کرتا ہے''۔ اس نے ایسے لہجے میں کہا ہے جیسے اس کا منا صحن میں کھیل رہا ہو۔ ''اور بڑا چار سال کا ہے۔ وہ امی کہتا ہے اور ان کا باپ عاشو کہا کرتا ہے۔ میرا نام عائشہ ہے''۔

وہ ''ہے'' کے صیغے میں بات کر رہی ہے۔ اس کے ذہن نے ابھی قبول نہیں کیا کہ ہمیں امی اور ابو کہنے والے ماضی کے سائے بن گئے ہیں جو دور ہی دور، دور ہی دور ہٹتے جا رہے ہیں۔

مگر میں خود ماضی میں جا پڑا ہوں۔ عائشہ کے بکھرے ہوئے بال میرے گالوں اور ہونٹوں کو چھو رہے ہیں۔ ان بالوں سے مجھے اپنے بچوں کو ماں کی بو آنے لگی ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے جیسے ننھا میرے کندھے پر سر رکھے سو رہا ہو اور اس کے بال میرے گالوں کو چھو رہے ہوں اور کبھی ایسے لگتا ہے جیسے میرے بچوں نے اسی عورت کی چھاتیوں سے دودھ پیا تھا۔

اچانک زمین ہلنے لگی ہے۔ کوئی بھاری بھرکم جانور دوڑا آ رہا ہے۔ اس کی آواز بھینس کی طرح ہے۔ یہ بھینس ہی ہے تو وہ سخت ڈری ہوئی ہے۔ بڑے ڈراؤنے طریقے سے بول رہی ہے۔ اس کے ساتھ جو آوازیں سنائی دینے لگی ہیں انہوں نے میری رگوں میں خون خشک کر دیا ہے۔ یہ بہت سے بھیڑیوں کی آوازیں ہیں۔ وہ غراتے اور بھونکتے ہوئے بھینس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔

شام کے بعد مویشیوں کو کون باہر چھوڑتا ہے۔ یہ کسی مسلمان کی بھینس ہوگی جس کے مالک کٹ گئے ہوں گے یا بھاگ گئے ہوں گے۔

چھپنے کی کوئی جگہ نہیں۔ بھاگنے کی ہمت نہیں۔ درخت پر چڑھنے کی طاقت نہیں۔ عائشہ کے منہ سے دبی دبی چیخ نکل گئی ہے اور معصوم بچے کی طرح ڈر کر میرے ساتھ لپٹ گئی ہے۔

بھینس بہت قریب آ گئی ہے۔ ہم دو ٹیکریوں کے درمیان کھڑے ہیں۔ راستہ اتنا تنگ ہے کہ یا ہم کھڑے رہ سکتے ہیں یا بھینس گزر سکتی ہے۔ اگر کھڑے رہے تو بھینس روند ڈالے گی۔ اس سے بچ گئے تو بھیڑیوں کا ہجوم ہمیں چیر پھاڑ دے گا۔ ٹیکری اونچی ہے۔

میں عائشہ کی کمر کے گرد بازو ڈالے ٹیکری پر چڑھنے لگا ہوں۔ دو تین گز اوپر گیا ہوں گا کہ بھینس بادل کی گرج کی طرح دھاڑتی پہنچ گئی ہے۔ عائشہ گر پڑی ہے اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اوپر جا رہی ہے۔

بھیڑیئے بھینس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ ہم جہاں تک پہنچ سکے ہیں، وہیں لیٹ گئے ہیں۔ رات تاریک ہے۔ بھیڑیئے ہمیں دیکھ نہیں سکتے۔ میں ٹیکری کے ساتھ لگ گیا ہوں اور عائشہ میرے ساتھ چپک گئی ہے۔ تھر تھر کانپ رہی ہے۔ چار پانچ گز نیچے بھیڑیوں نے آگے ہو کر بھینس کو روک لیا ہے۔ مجھے اندھیرے میں ذرا ذرا سا

دکھائی دے رہا ہے۔ بھینس جدھر گھومتی ہے ایک دو بھیڑیے اسے روک لیتے ہیں۔ وہ سر نیچے کر کے ان پر حملہ کرتی ہے تو دو تین بھیڑیے پیچھے سے حملہ کر کے اسے بے بس کر دیتے ہیں۔ بھیڑیے بے شمار ہیں۔ ان کی آوازیں ایسی کہ رات بھی عائشہ کی طرح تھر تھر کانپ رہی ہے اور جب بھینس ڈکارتی ہے تو دل دہل جاتا ہے۔

عائشہ رونے لگی ہے۔ بھیڑیوں نے بھینس کو گھٹنوں کے بل بٹھا لیا ہے۔ تین چار بھیڑیے اس کی پیٹھ پر چڑھ گئے ہیں۔ میں عائشہ کو ساتھ لئے پیٹ کے بل اوپر کو رینگنے لگا ہوں۔ ٹیکری پر نوکیلے پتھر ہیں۔

میں نے عائشہ کو اپنی پیٹھ پر لٹا لیا ہے۔ میں پتھر ہوں، پتھروں پر رینگ سکتا ہوں۔ وہ اتنی زیادہ ڈری ہوئی ہے کہ اس کے دونوں بازو میری گردن کے گرد پھندا بن گئے ہیں۔ اس کے بال میرے منہ پر بکھر گئے ہیں اور میں اپنی ہڈیوں کے ڈھانچے کو اور اس پر لدے ہوئے عائشہ کے جسم کو ایک ایک انچ اوپر کو سرکا رہا ہوں۔

ٹیکری اونچی ہو گئی ہے۔ ایسی ٹیکریوں اور چٹانوں کو میں ہرنوں کی طرح پھلانگا کرتا تھا مگر یہ تو ماؤنٹ ایورسٹ ہے۔

بھینس کی آواز بھیڑیوں کی غراہٹ میں ڈوب گئی ہے۔ بھیڑیوں کی آوازوں سے پتہ چلتا ہے کہ بھینس کو چیر پھاڑ اور بھنبھوڑ رہے ہیں۔

***

میں عائشہ کو پیٹھ پر اٹھائے ٹیکری کی دوسری طرف پہنچ گیا ہوں اور اسے کہا ہے۔ ”ہم دوڑ نہیں سکیں گے۔ آؤ تیز چلیں۔ نہ چل سکو تو میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ“۔

”چلوں گی“۔ اس نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا مگر اس کی آواز اس طرح سنائی دے رہی ہے جیسے دور کہیں پر کوئی بول رہی ہو۔

ہم چل پڑے ہیں اور ساون کی گھٹائیں گرجتی چمکتی بڑھتی آ رہی ہیں۔ افق سے چمک اٹھتی ہے تو گرد و پیش روشن ہو جاتے ہیں۔

”تیز چلو“۔ اس نے کہا ہے۔ ”بھیڑیے آ جائیں گے“۔

”اب نہیں آئیں گے“۔ میں نے اسے تسلی دی ہے۔ ”ہمیں بھیڑیوں سے بچانے کے لئے خدا نے بھینس بھیج دی تھی۔ ذرہمت، خدا ہمارے ساتھ ہے۔ تمہیں بھوک تو لگی ہو گی؟“

”نہیں...... اور تمہیں؟“

”نہیں“۔ میں نے جواب دیا ہے اور سوچ رہا ہوں کہ مجھے بھوک کیوں نہیں لگ رہی؟ کیا دنیا سے میرا دانہ پانی ختم ہو گیا ہے؟ نیند بھی نہیں آ رہی۔ تھکن کا احساس بھی مٹ چکا ہے۔ صرف ایک احساس زندہ ہے کہ مجھے چلتے رہنا چاہئے۔ جہاں ٹانگیں اکڑ کر جسم کو گرا دیں گی وہ پاکستان کی سرحد ہو گی۔

گھٹا سر پر آ گئی ہے۔ بجلی چمک کر راستہ دکھا دیتی ہے اور جب بجلی کڑکتی ہے تو عائشہ بدک کر میرا بازو پکڑ لیتی ہے۔

”بارش برسے گی تو کہاں چھپیں گے؟“

”کہیں بھی نہیں“۔ میں نے اسے کہا ہے۔ ”چلتے جائیں گے“۔

”تمہیں کس طرح یقین ہے کہ ہم جدھر جا رہے ہیں پاکستان ادھر ہی ہے؟“

”میری روح اسی طرف کھنچی جا رہی ہے“۔ میں نے اسے کہا ہے۔ ”جس سرزمین کی خاطر ہم نے بچے ذبح کرائے ہیں وہ ہمیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ ہم بھٹک نہیں سکتے“۔

”میں شاید وہاں تک نہ پہنچ سکوں“۔ اس نے علیل آواز میں کہا ہے۔ ”لیکن میں اس سرزمین کو دیکھے بغیر مرنا نہیں چاہتی جس نے میرے سہاگ اور میرے بچوں کی

قربانی دی ہے۔ تمہیں اپنی بیوی اور بچوں کے مرنے کا کتنا غم ہے؟

"کوئی غم نہیں۔" میں نے مردوں کی طرح کہا ہے اور اس سے پوچھا ہے۔ "اور تمہیں؟"

وہ گہری سوچ میں کھو گئی ہے۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کر کے پھر کہا ہے۔ "بتاؤ نا، تمہیں اپنے خاوند اور بچوں کے مرنے کا کتنا غم ہے؟"

"میں انسان ہوں نا"۔ اس نے کہا ہے۔ "غم تو بہت ہے لیکن پاکستان میں جا کر سارے غم بھول جاؤں گی..... پاکستان اتنا خوبصورت ہوگا نا جو میرے سارے غم دھو ڈالے گا؟"

"بہت خوبصورت"۔ اور ایک بے حد خوبصورت تصور نے ہماری رفتار تیز کر دی ہے۔ میں تصوروں میں دیکھ رہا ہوں کہ لاکھوں انسان ایسے ہی خوبصورت تصور کی طرف بھوکے پیاسے، ہڈیوں کے کھڑ کھڑ کرتے ڈھانچے بنے ہوئے، بڑھے چلے جا رہے ہیں۔

یکبارگی گھٹائیں برس پڑی ہیں۔ ساون کی بارش برس نہیں رہی۔ آسمان سے آبشار کی طرح گر رہی ہے اور ہم اس تصور کی سمت بڑھے چلے جا رہے ہیں جو بہت ہی حسین اور آسمان کے پانیوں سے دھلا ہوا ہے۔

میں بارش کے شور اور زنانوں میں عائشہ کو بتا رہا ہوں کہ پاکستان کتنا حسین ہوگا۔ ہماری رفتار اور تیز ہو گئی ہے اور پاکستان کا تصور عائشہ کے ذہن میں نقش ہوتا چلا جا رہا ہے۔

پانی سر سے بہہ کر منہ میں جانے لگا ہے جس سے پیاس کا احساس بیدار ہو گیا ہے۔ میں نے منہ پورا کھول کر آسمان کی طرف کر دیا ہے۔ عائشہ نے بھی منہ کھول کر آسمان کی طرف کر دیا ہے۔ خدا کا پاک پانی ہمارے جسموں میں داخل ہو رہا ہے۔ روح بھی ہلکی پھلکی ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے روح پر میل جم گئی تھی جسے بارش نے دھو ڈالا ہے۔

اک سا خیال آتا ہے کہ میں اپنے آپ کو اور عائشہ کو فریب تو نہیں دے رہا؟ کیا وہ پاکستان اتنا ہی خوبصورت ہوگا جتنا میں نے عائشہ کو بتایا ہے؟ کیا میں اسے پاکستان کی ہی سمت لے جا رہا ہوں؟ ایسا ایک خیال وہم سا بن کے ذہن میں آتا ہے اور نکل جاتا ہے۔ میں اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا۔ مگر اس وہم سے دل کی ایک دو دھڑکنیں رک ضرور جاتی ہیں۔

چلو خود فریبی ہی سہی، وہم ہی سہی، جو کچھ بھی ہے، ہے اتنا دلکش کہ ہم نواسوں سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ ہڈیوں کے پنجر، میں، پاؤں پہ کھڑے رہنے کی سکت نہیں، چلتے جا رہے ہیں اور ہماری رفتار اسی موسلا دھار بارش اور کیچڑ میں بھی تیز ہوتی جا رہی ہے۔

***

بارش اور تیز ہو گئی ہے۔ ہم چلے جا رہے ہیں۔ پتھریلی زمین پیچھے رہ گئی ہے۔ کیچڑ ہمارے پاؤں جکڑ رہا ہے۔ جیسے ہندو اور سکھ ہمارے پاؤں میں زنجیریں ڈال کر ہمیں پاکستان سے دور ہی دور جان سے مار دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہر قدم ایک ایک من کا ہوتا جا رہا ہے۔ یہ شاید کھیتیاں ہیں۔ اگر کھیتیاں ہیں۔ تو قریب کوئی گاؤں بھی ہوگا۔ اگر گاؤں ہے تو کیا یہ پاکستان کا گاؤں ہوگا؟

پاکستان کا گاؤں..... دل مسرور ہوا تھا پھر ڈوب گیا ہے۔ ڈر گیا ہوں کہ یہ گاؤں ہندوستان کا نہ ہو۔ بجلی چمکتی ہے تو ادھر ادھر دیکھتا ہوں۔ بارش کی چمکتی لکیروں کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا۔

میں نے یہ تو سوچا ہی نہ تھا کہ پیٹ ایک عرصے سے خالی ہے۔ بارش کے پانی سے پیٹ بھر گیا ہے تو پیٹ میں ایسا درد اٹھا ہے جو ساری انتڑیوں میں بجلی کی طرح پھر رہا ہے۔

"عائشہ! تمہارے پیٹ میں بھی درد ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ چلا نہیں جاتا۔۔۔ کسی درخت کے نیچے بیٹھ جائیں؟"

مجھ پر غشی طاری ہونے لگی ہے۔ اپنے آپ سے لڑ جھگڑ رہا ہوں کہ بے ہوش نہ ہو جاؤں۔ اکیلا ہوتا تو اور بات تھی، ایک عورت کو اپنی پناہ میں لے کر میں گرنا نہیں چاہتا۔ مگر بارش کی چمکتی لکیریں چکر میں گھومنے لگی ہیں۔ ایسی ابکائی آئی ہے جیسے انتڑیاں باہر آ جائیں گی۔

قدم آپ ہی آپ ایک درخت تلے لے آئے ہیں اور میں جان مار کر کوشش کے باوجود دھڑام سے گھٹنوں کے بل گر پڑا ہوں۔ عائشہ نے میرے پاس بیٹھ کر میری پیٹھ اپنے سینے سے لگا لی ہے۔ میں عورت کا سہارا قبول نہیں کرنا چاہتا مگر اپنے سہارے بیٹھ بھی نہیں جاتا۔ جوں جوں اپنی ہاری ہوئی قوتوں کو جگانے کی کوشش کرتا ہوں، جسم سن ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ رہے ہیں۔ عائشہ کچھ کہہ رہی ہے۔ اب وہ رو نہیں رہی۔ اس کے لب و لہجے میں مایوسی بھی نہیں، عزم ہے۔ وہ تو مری ہوئی آواز میں بولتی تھی۔ اس کی آواز میں نئی جان کہاں سے آ گئی ہے؟ وہ ذرا بھی گھبرائی ہوئی نہیں لگتی۔

میں نے جسم کو زور سے جھٹکا دے کر اٹھایا ہے۔ عائشہ کی باہوں سے نکل آیا ہوں مگر تیورا کر گر رہا ہوں اور اتنا ہی کہہ سکا ہوں۔ "عائشہ! دعا کرو"۔ اس نے میرے قریب دو زانو بیٹھ کر ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہیں اور میرے کانوں سے دو الفاظ ٹکرائے ہیں۔ "میرے خدا!" اور میرے لئے رات سیاہ کالی اور دنیا خاموش ہو گئی ہے۔

***

ایک سوال پریشان کر رہا ہے۔ "کیا عائشہ سچ بول رہی ہے؟" پھر خیال آتا ہے، وہ جھوٹ کیوں بولے گی؟ میں خود تو چل نہیں سکتا تھا۔ عائشہ اور خدا کے سوا اور کوئی ساتھ نہ تھا

ہوا یوں ہے کہ میں نے آنکھیں کھولیں تو سب سے پہلے اوپر دیکھا۔ مجھے وہ درخت نظر نہ آیا جس کے نیچے میں جا گرا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ بارش نظر آئی نہ کیچڑ۔ عائشہ کی صورت نظر آئی۔ منہ دھلا ہوا اور بال بکھرے ہوئے نہیں تھے۔

میرے اردگرد ویسی ہی دیواریں تھیں جیسی تھیں اس گھر کی، جہاں سے میری بیوی اور بچوں کا آخری سفر اور میری یہ کٹھن مسافت شروع ہوئی تھی۔ دیواروں پر گاچنی مٹی کا صاف ستھرا لیپ تھا۔ عائشہ کو دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر اداس اداس سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میں کسی گھر میں چارپائی پر پڑا تھا۔

عائشہ آئی تو اس کے ساتھ ایک بوڑھا دیہاتی اور دو جوان سال آدمی تھے۔ ان کے پیچھے ایک دیہاتن تھی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

"پاکستان میں۔"

اور جانے کیا ہوا۔ میرے حلق میں کوئی چیز اٹک گئی پھر میری چیخ نکل گئی اور میں زار و قطار رونے لگا۔ میں آنسوؤں کی دھند میں دیکھ رہا تھا کہ کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کسی نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا ہے۔ مجھے بوڑھی سی آواز سنائی دی۔ "رو بیٹا، رو۔ رو لینے دو۔ غبار نکل جانے دو"۔ اس آواز میں اتنا پیار، اتنی اپنائیت اور اتنا درد تھا کہ میں بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

پھر آنسوؤں اور ہچکیوں کا طوفان تھم گیا۔ مجھے ایسا سکون آنے لگا جیسے میں بچہ بن گیا ہوں اور ماں نے مجھے آغوش میں لے لیا ہو۔

وہ میرے منہ میں دودھ ٹپکانے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم میں اٹھنے کی طاقت آ رہی ہے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو کسی کے ہاتھ نے میری پیٹھ سے

مجھے سہارا دیا اور میں بیٹھ گیا۔ دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لے لیا اور سارا دودھ پی لیا۔ گردوپیش کا ذرہ ذرہ نکھر آیا۔

میرے پاس صرف عائشہ بیٹھی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں بارش میں درخت تلے بے ہوش ہو گیا تھا تو اس نے زور زور سے رو رو کر خدا سے مدد مانگی تھی۔ پھر اس نے چیخ چیخ کر خدا کو پاکستان کا واسطہ دے کر پکارا تھا۔ پھر اس نے خدا سے یہ بھی کہا تھا۔ ”اے خدا، اگر تو خدا ہے تو سامنے آ، نہیں تو ہمارے وہ بچے واپس کر دے جو ہم نے تیرے نام پر ذبح کرائے ہیں“۔

عائشہ کہتی ہے کہ بجلی اتنی زور سے چمکی اور ایسی شدت سے کڑکی کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں ڈر تو گئی لیکن یہ یقین بھی ہونے لگا کہ مجھے خدا نے اپنا آپ دکھایا ہے۔ بجلی پھر چمک کر کڑکی تو آسمان سے ایک شعلہ زمین کی طرف آیا جو پچاس ساٹھ گز دور ایک درخت پر گرا۔ میں جانتی تھی کہ درخت پر بجلی گری ہے ایسا دھماکہ ہوا کہ میرا انگ انگ بیدار ہو گیا۔ میرے دل سے خوف نکل گیا اور بجلی میرے جسم میں داخل ہو گئی۔ میں نے تمہیں اٹھانے کی کوشش کی تو ایسے لگا جیسے مجھ میں بہت طاقت آ گئی ہے یا تمہارا کوئی وزن نہیں رہا یا شاید میں خواب میں تمہیں اٹھا رہی ہوں۔ تمہارا دل دھڑک رہا تھا۔ تم زندہ تھے۔

میں نے تمہارے آگے ہو کر تمہیں پیٹھ پر ڈالا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور جب چلی تو بارش جس طرح اچانک شروع ہوئی تھی اسی طرح اچانک رک گئی۔ مجھے معلوم نہیں کہ اندھیرے میں وہ کون تھا جسے میں دیکھ نہ سکی لیکن اس نے میرا ہاتھ تھام کر ایسے راستے پر ڈال دیا جس پر پھسلن ضرور تھی کیچڑ نہیں تھا۔ میں اسی راستے پر چل پڑی۔

پھر مجھے یاد نہیں رہا اور شاید ہوش بھی نہیں رہا کہ میں کتنا کچھ چلی۔ دو بار گری۔ ذرا دم لیا۔ تمہیں اٹھایا اور چل پڑی۔ کئی جگہ تمہیں زمین پر لٹایا۔ سانسوں کو سنبھالا اور تمہیں اٹھا کر چل پڑی۔ میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ یہ طاقت مجھے خدا نے دی تھی۔ خدا نے ہمارے بچوں کی قربانی قبول کر لی ہے ورنہ ہم دونوں وہیں درخت تلے مر جاتے۔

رات بھر چلتی رہی، گرتی اور اٹھتی رہی۔ صبح کی روشنی پھیلنے لگی اور مجھے یہ گاؤں نظر آنے لگا۔ میں نے تمہیں ایک درخت تلے لٹایا اور اس گھر میں آئی۔ یہ گاؤں کا پہلا گھر ہے۔ انہیں بتایا کہ میں پٹھانکوٹ سے آئی ہوں۔ پھر تمہارے متعلق بتایا کہ تم درخت تلے بے ہوش پڑے ہو۔ یہ دو جوان آدمی جو اس بوڑھے کے بیٹے ہیں، چارپائی اٹھا کر باہر کو دوڑ پڑے اور اس طرح تم یہاں تک پہنچے۔

”کب؟“

”پرسوں“۔

”میں اتنے دن بے ہوش پڑا رہا ہوں“۔

”ہاں، کبھی کبھی تم ساجد اور ماجد کو بلاتے تھے۔ ایک بار تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا، ساجد کی ماں، بچے کیوں رو رہے ہیں اور تم انہیں خواہ مخواہ ڈانٹتی جھڑکتی رہتی ہو“۔

عائشہ بڑی سادگی اور معصومیت سے مجھے سنا رہی ہے اور میں سوچ رہا ہوں، کیا عائشہ سچ کہہ رہی ہے؟ دماغ پر زور دیتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ہاں وہ جو کچھ کہہ رہی ہے بالکل سچ ہے۔ ایسا کارنامہ جو عائشہ نے کر دکھایا ہے، خدائی قوت کے زور سے ہوتا ہے۔ اس کو ایمان کی قوت کہتے ہیں اور معجزوں کے پس منظر یہی قوت کارفرما ہوتی ہے۔

پاکستان کا پہلا گھر اور پہلے پاکستانی جنہوں نے ہمیں پناہ دی ہے، پاکستان کے اس تصور سے زیادہ خوبصورت ہیں جو میں نے راستے میں دیکھا تھا اور عائشہ

کے ذہن میں نقش کر دیا تھا۔
"عائشہ! اس گاؤں کا نام کیا ہے؟"
"چونڈہ"۔
"آج تاریخ کیا ہے؟ مہینہ کون سا ہے؟"
"ستمبر کی اکیس تاریخ ہے"۔
میں نے ذہن پر زور دیا ہے تو بڑی مشکل سے یاد آیا ہے کہ میں ۷ اراگست کے روز تھلیال سے چلا تھا۔

29 ستمبر 1947ء

میں اور عائشہ پھر سے جی اٹھے ہیں۔ اس گھر والوں نے ہمیں کئی بار کہا ہے کہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھو۔ وہ سارے گاؤں میں دیکھ چکے ہیں۔ ہندو اور سکھ جو مکان خالی کر گئے ہیں ان میں مہاجرین کے کنبے آباد ہو گئے ہیں۔ چونڈہ سرحد کے قریب تھا اس لئے بہت سارے مہاجرین نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے ہیں۔
ہم نے اپنے مشفق میزبانوں کو بتا دیا ہے کہ میرا اور عائشہ کا خون کا کوئی رشتہ نہیں۔ ہم ایک ہی منزل کے دو بھٹکے ہوئے راہی تھے۔ گھر کے بزرگ نے بلا جھجک اور بلا تامل کہہ دیا ہے۔ خدا نے آسمانوں میں تمہاری روحیں ملا دی ہیں۔ فوراً شادی کر لو اور ان بچوں کو بھول جاؤ جو تم دونوں نے اللہ کے نام پر قربان کر دیئے ہیں۔

18 نومبر 1947ء

آج میزبانوں نے مجھے اور عائشہ کو کلمے پڑھوا کر ابدی رشتے میں باندھ دیا ہے۔ ہنسی بھی آتی ہے، رونا بھی۔ مگر ہنستا ہوں نہ روتا ہوں۔ ہنستا اس لئے نہیں کہ میری شہید بیوی کی روح کو تکلیف نہ ہو اور روتا اس لئے نہیں کہ عائشہ کے دل کو تکلیف نہ ہو۔ رات جو گذر گئی ہے، چونڈہ کی لڑکیوں نے ڈھولک کی تھاپ پر گیت گاتے گزاری ہے۔ میں باہر نکل گیا تھا۔ کھیتوں میں جا کے روتا رہا ہوں۔ شہید بیوی اور اپنے بچوں کی روح سے رو رو کر معافی مانگتا رہا ہوں۔ اگر عائشہ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو میں اسے کبھی قبول نہ کرتا مگر وہ عائشہ ہے اور عائشہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اس نے اپنا سہاگ اور مامتا چونڈہ کے دیس کی مٹی پر قربان کیا ہے۔

19 نومبر 1947ء

عروسی کی رات گزر گئی ہے۔ کیسی گزری ہے؟ لکھنے لگوں تو لکھتا ہی چلا جاؤں۔ ایک ایک لمحہ ایک ایک کہانی جتنا لمبا ہے۔ نہ لکھوں تو بات اتنی سی ہے کہ عروسی کی رات گزر گئی ہے کبھی تو ہم دونوں ہنستے مسکراتے باتیں کرتے تھے، کبھی ایک دوسرے کو چپ چاپ دیکھنے لگتے تھے۔
مجھے عائشہ کے روپ میں اپنے ساجد اور ماجد کی ماں نظر آنے لگتی تھی اور مجھے یقین ہے کہ عائشہ کو میرے روپ میں انور اور اکرم کا باپ نظر آتا ہوگا۔
عائشہ نے کل رات پہلی بار بتایا ہے کہ اس کے انور کی عمر ڈیڑھ سال اور اکرم کی چار سال تھی۔ وہ پٹھانکوٹ

مفید باتیں

* ہم پہلے اپنی عادتیں بناتے ہیں پھر ہماری عادتیں ہمیں بناتی ہیں۔
* گناہ کا ترک کر دینا توبہ کی عطا ہے۔
* جو چاہتا ہے کہ بڑے بڑے کام کرنے والے اور اس میں جان کھپانے والوں سے آگے بڑھ جائے تو اسے چاہئے کہ گناہوں سے بچے۔
* حضرت عمرؓ سے ایک ایسی قوم کے بارے میں پوچھا گیا جو گناہ کا شوق رکھتے ہیں اور ان پر عمل بہت کرتے۔ فرمایا۔ "وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لئے آزما لئے ہیں ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے"۔

سے بیس میل دور سے چلے تھے۔ راستے میں انور بھوک سے مر گیا۔ عائشہ ننھے کی لاش کو سینے سے لگائے چلتی رہی۔ اگلے روز اکرم کو ابکائی آئی اور وہ بھی مر گیا۔ اس کے باپ نے لاش کو اٹھا لیا۔ وہ اپنے بچوں کو پاکستان کی مٹی کے سپرد کرنا چاہتے تھے۔ مگر راستے میں ان پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کر دیا۔ یہ ایک سو سے زیادہ افراد کا قافلہ تھا۔ عائشہ کا خاوند شہید ہو گیا اور بھی کئی مسلمان شہید ہوئے۔ رات آ گئی تھی۔ اندھیرے نے عائشہ کو چھپا لیا اور ہندو سکھ چلے گئے۔

عائشہ دو روز چھپی رہی۔ تیسرے روز اس نے ایک نرم جگہ ہاتھوں سے مٹی ہٹا کر تین گڑھے کھودے اور اپنے سہاگ اور ممتا کو ہندوستان کی مٹی میں دفن کر دیا۔ جب وہ پاکستان کی سمت روانہ ہوئی تو گھوم پھر کر ان تین ڈھیریوں کے پاس جا بیٹھی۔ اسے یاد نہیں کہ کتنی بار وہ چل پڑی مگر راستے سے لوٹ گئی اور قبروں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ جب میں نے اسے دیکھا، اسے وہاں دسواں یا گیارہواں روز تھا۔

میں نے بھی اسے اپنی بیوی اور بچوں کی شہادت کی تفصیل سنائی ہے اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کے زخموں کو سہلانا شروع کر دیا ہے۔

یکم دسمبر 1947ء

تین روز گزرے کسی کے بتانے پر ہم دونوں سیالکوٹ آ گئے ہیں۔ سر چھپانے کو چھوٹا سا مکان مل گیا ہے چونڈہ کے میزبانوں نے ہمیں دو بستر اور کپڑے دیئے تھے۔ ضرورت کے برتن بھی ایک بوری میں باندھ دیئے تھے۔ مگر دو وقت کی روٹی مسئلہ بن گیا ہے۔ چونڈہ والوں نے میری بیوی کو جو ''سلامی'' کے پیسے دیئے تھے۔ وہ بیس روز کے لئے کافی ہیں۔ میں چونڈہ کی مٹی کو ہمیشہ آنکھوں سے لگاؤں گا۔ یہ گاؤں مجھے سارے پاکستان جتنا پیارا لگتا ہے۔

عائشہ کا رنگ روپ نکھر آیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی زیادہ خوبصورت ہے۔

25 اپریل 1948ء

چونڈہ والے پیسے نوکری کی تلاش میں ختم ہو گئے تھے۔ چار روز چولہا ٹھنڈا رہا۔ آخر ایک پرائیویٹ فرم میں چپڑاسی کی جگہ مل گئی۔ پچاس روپے کوئی بڑی تنخواہ نہیں مگر انسان بہت بڑے ملے۔

ہوا یوں کہ پہلی تنخواہ ملنے میں ابھی پورا مہینہ باقی تھا۔ میں نے دفتر کے ایک آدمی سے تین روپے ادھار لے لئے۔ پچھلے پہر گھر آیا تو عائشہ کو ساتھ لے کے بازار چلا گیا۔ راستے میں دفتر کا مالک مل گیا۔ اس نے عائشہ کو دیکھا تو بڑے انس سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ میں نے بتایا تو اس نے کہا ہے۔ ''اگر تمہارا کوئی بچہ نہیں ہے تو بیوی کو میرے گھر بھیج دیا کرو۔ تم مہاجر ہو، میں چاہتا ہوں کہ اس بہانے تمہاری کچھ اور مدد کروں۔ صرف تھوڑا پونچھ کا کام ہوگا''۔

میں عائشہ سے یہ کام تو نہیں لینا چاہتا تھا لیکن عائشہ نے مجھے کہا کہ میں سارا گھر بناتا ہے۔ گھر میں چند ایک برتنوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ پچاس روپوں میں ہم کیا کچھ بنا سکیں گے۔ اس نے ایسے انداز سے بات کی کہ میں مان گیا اور عائشہ میرے آقا کے گھر جانے لگی۔ پہلے روز کام کر کے واپس آئی تو اس نے مجھے بتایا کہ صاحب کے بیوی بچے لاہور گئے ہوئے ہیں اور اس نے یہ بھی بتایا کہ صاحب بہت نیک اور دردمند آدمی ہے۔ مجھے کہتا تھا کہ کام کاج کو چھوڑو، میں تو کسی بہانے تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے پاس بٹھا کر میری بپتا سنتا رہا اور افسوس کرتا رہا۔

عائشہ نے مجھے دس روپے کا نوٹ دے کر کہا۔'' یہ

ماہنامہ حکایت لاہور

ستمبر 2015ء کا شمارہ

قیمت 100 روپے

سالگرہ نمبر

اپنی سابقہ روایات کے ساتھ شائع ہوگا

اپنی پسند کا کوئی مضمون — آپ بیتی — یادگار واقعہ — ناقابل فراموش — پاک بھارت جنگ — جرم و سزا — شکاریات — دین اسلام وغیرہ — کشمیر کی جنگ آزادی — جگ بیتی — سچی کہانی — افسانہ — مہم جوئی

اپنی تحریریں 20 جولائی تک ارسال کردیں۔ صرف وہی تحریریں ناقابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں واپس بھیجی جائیں گی جن کے ساتھ واپسی ڈاک ٹکٹ ہوں گے۔

ماہنامہ حکایت 26- پٹیالہ گراؤنڈ لاہور

صاحب نے دیا ہے“۔

میری نگاہ میں پاکستان فرشتوں کی سرزمین تھی۔ میں اپنے صاحب کو بھی فرشتہ سمجھتا رہا۔ وہ مجھ پر بھی بہت مہربان ہو گیا تھا۔ مگر دس بارہ روز بعد میں دفتر سے گھر آیا تو عائشہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کا سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں لال سرخ تھیں جیسے روتی رہی ہو۔ میں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔”صاحب کی نوکری چھوڑ دی ہے“۔ پوچھا کیوں؟ تو کہنے لگی۔”وہ بہت بُرا آدمی ہے۔ بڑی مشکل سے عزت بچالائی ہوں“۔

میرا خون کھول اٹھا۔ ایک صدمہ یہ کہ اس آدمی نے میری بیوی کی عزت پر ہاتھ ڈالا تھا اور دوسرا صدمہ یہ کہ اس نے یہ گناہ پاکستان میں کیا تھا۔ میں ساری رات سو نہ سکا۔

دوسرے دن دفتر گیا۔ صاحب آیا تو جو منہ میں آیا اسے کہہ دیا مگر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا۔”تم دیہاتی بہت سیدھے ہوتے ہو“۔ اس نے ایسے پیار سے باتیں کیں کہ میں اسے اپنا ہمدرد سمجھ بیٹھا۔ گھر آ کر عائشہ سے کہا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے تو اس نے تفصیل سے سنا دیا کہ اس مردود نے اسے کس طرح باتوں باتوں میں پلنگ پر گرا لیا تھا۔ یہ تو عائشہ کی ہمت تھی کہ اس کے چنگل سے نکل آئی۔

میں نے دوسرے دن اپنے آقا سے کہا کہ جتنے دن نوکری کی ہے وہ تنخواہ دے دو۔ اس نے پس و پیش کیا تو میں نے دانت پیس کر اسے کہا۔”میں ہندوؤں اور سکھوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ یاد رکھو، تمہیں قتل کر دوں گا“۔ گناہگار بزدل ہوا کرتے ہیں۔ وہ ڈر گیا اور مجھے پینتالیس روپے دے کر فارغ کر دیا۔

آج اس واقعہ کو چار مہینے گزر گئے ہیں۔ ایک آڑھتی کے ہاں ساٹھ روپے پر نوکری مل گئی ہے۔ آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔ اسے یہ واقعہ سنایا تو اس کی آنکھیں غم اور غصے سے لال ہو گئیں۔ کہنے لگا۔”اسلامی مملکت میں ایسے آدمی کو سنگسار کر دینا چاہئے۔ یہ قرآن کا حکم ہے“۔

14 اگست 1948ء

پورا ایک سال گزر گیا ہے۔ پٹھانکوٹ کی طرف سے سیاہ گھٹائیں اٹھتی ہیں اور سیالکوٹ پر چھا جاتی ہیں۔ ایک سال پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ دل ڈوبنے لگتا ہے۔ عائشہ بھی گم صم ہو جاتی ہے لیکن کسی مؤذن کی مقدس آواز یا کسی طرف سے حق اللہ ہو کی صدا یا کہیں سے کلمہ شریف کی آواز سنائی دیتی ہے تو دل مسرور ہو جاتا ہے۔ یادیں دھل جاتی ہیں اور گھٹائیں برس کر آگے نکل جاتی ہیں۔

میں اسی آڑھتی کی نوکری کر رہا ہوں اور میٹرک کے امتحان کی تیاری بھی کر رہا ہوں۔ پڑھنے کی عمر تو نہیں لیکن بوڑھا بھی نہیں ہوا۔ پٹھانکوٹ کے ایک سناتن دھرم سکول میں آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں پھر کاشتکاری کرنے لگا۔ زمین بہت تھی۔ اب کہیں زمین ملنے کی توقع نہیں۔ ایک ہی راستہ ہے کہ میٹرک پاس کر کے ایف اے یا پھر بی اے کر لوں۔ میں کر لوں گا۔

11 ستمبر 1948ء

مجھے یاد نہیں کہ میں اور عائشہ اپنے بچے کے لئے کتنے کچھ روئے تھے مگر جتنا آج رو رہے ہیں شاید اتنا بھی نہ روئے ہوں گے۔ دل میں قائداعظمؒ کو دیکھنے کی اتنی خواہش تھی جتنی ہر مسلمان کو حج کی ہوتی ہے۔ آج یہ خواہش دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگی ہے اور قائداعظمؒ اس جہاں سے اٹھ گئے ہیں۔

ہم دونوں رو رہے ہیں۔ بازار بند ہو گئے ہیں۔ پاکستان کا نظام دم بخود ہو کر رک گیا ہے۔ جسے دیکھو رو

ہے۔ آنسوؤں کا سیلاب ہے جو معلوم نہیں کب تھمے گا۔

یکم جنوری 1949ء

قائد اعظمؒ کی وفات کا غم اور حیدر آباد دکن پر ہندوستانیوں کی فوج کشی اور قبضے کا دکھ ابھی تازہ تھا کہ کشمیر ہاتھ آیا نکل گیا۔ کہتے ہیں فائر بندی ہو گئی ہے۔ رات کے وقت اپنی توپوں کے دھماکوں کی جو دبی دبی آوازیں سیالکوٹ میں سنائی دیتی تھیں خاموش ہو گئی ہیں۔ سیالکوٹ کی فضا میں ایک ہی سوال گونج رہا ہے۔ ''کیوں؟ ہماری توپوں کے دہانے کس نے بند کر دیئے ہیں؟ ہمارے مجاہدین جو برف پوش پہاڑوں اور چٹانوں کو روندتے چلے جا رہے تھے، کیوں روک لئے گئے ہیں؟'' کوئی جواب نہیں ملتا ہر کوئی اداس ہے۔

11 فروری 1949ء

میرا اور عائشہ کا پہلا بچہ پیدا ہوا ہے۔ ہم بہت خوش ہیں۔ پٹھانکوٹ کے زخم بھرنے لگے ہیں۔

6 ستمبر 1965ء

میرا اور عائشہ کا پہلا بچہ سوالیہ سال کا ہو گیا ہے۔ ان سولہ سالوں میں خدا نے ہمیں چاروں بچے واپس کر دیئے ہیں۔ دو میرے، دو عائشہ کے۔ ہم نے ان کے وہی نام رکھے ہیں جو پہلے بچوں کے تھے۔ ساجد، ماجد، انور اور اکرم۔

یہ سولہ سال کس طرح گزرے؟ اگر روزمرہ کی کہانی سنانے لگوں تو سننے والے اکتا جائیں گے۔ دس سال گزرے، ہم سیالکوٹ سے پسرور آ گئے ہیں۔ سرحد کے قریب تھوڑی زمین مل گئی ہے۔ میں نے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ زمینیں مزارعوں کے پاس ہیں اور خود نگرانی کرتا ہوں اور کتابیں پڑھتا ہوں۔

ان سولہ سالوں میں وہ پاکستان میری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے جس کی خاطر ہم نے اپنے بچے کٹوائے تھے اور جس کی خاطر ہزاروں اور لاکھوں کلمہ گو لہولہان ہو کر اپنے عزیزوں کی لاشیں پاکستان کے راستے میں بکھیرتے پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تھے۔

میں بھوک اور غربت کی بات نہیں کرتا۔ ہر سچا پاکستانی پاکستان کی خاطر بھوکا اور ننگا رہ سکتا ہے۔

میں فلک بوس عمارتوں کے سائے میں ان جھگیوں کی بات نہیں کرتا جہاں انسان اور انسانوں کے بچے کیڑوں اور مکوڑوں کی طرح رہتے ہیں۔ ہر سچا پاکستانی پاکستان کے نام پر کھلے آسمان تلے مورچے کھود کر ان میں رہ سکتا ہے۔

مجھے اس کا بھی کوئی گلہ نہیں کہ میری بیوی جوان اور میں بے روزگار تھا تو صرف سیالکوٹ والے پاکستانی صاحب نے ہی نہیں جانے کتنے پاکستانیوں نے میری بیوی پر جال پھینکے، اسے ورغلانے کی کوشش کی اور گلیوں میں اس پر آوازے کسے۔ یہ سب پاکستانی تھے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ جس عورت کو پراگندہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں وہ انہی کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لئے اپنا خاوند، اپنے بچے اور اپنی مسرتیں ہندوستان کی مٹی میں دفن کر آئی ہے اور یہ وہ عورت ہے جو پاکستان کے راستے سے بھٹکے ہوئے ایک مرد کو اپنی پیٹھ پر اٹھا لائی تھی۔ جب کہ وہ خود چلنے سے معذور تھی۔ عائشہ کا قصور یہ تھا کہ وہ جوان تھی، خوبصورت تھی، غریب اور پناہ گزین تھی۔

مجھے کوئی گلہ نہیں۔ مجھے گلہ یہ ہے کہ پاکستان کی ہر بیٹی کے ساتھ یہی سلوک ہو رہا ہے۔ بہت سی بیٹیاں شرم و حجاب کو پسماندگی کی علامت سمجھ کر مستور ہونے کے بجائے ننگی ہو گئی ہیں۔ پاکستان کے سپوت اپنی بہنوں سے عشق لڑا رہے ہیں۔ یورپ کی تہذیب نے، پاکستانی فلمیں بنانے والوں نے، ان فلموں کے لئے گیت لکھنے

والے شاعروں نے اور جنسی کہانیاں لکھنے والے ادیبوں اور انہیں شائع کرنے والے ایڈیٹروں نے پاکستان کی بیٹیوں کی عصمت پاکستان کے بیٹوں کے ہاتھوں لٹا دی ہے۔

عریانی...... فحاشی...... بے حیائی...... مذہب سے بیزاری...... چوری...... رشوت خوری...... خویش پروری...... آبرو ریزی اور اغوا کی دلیرانہ وارداتیں...... اخبار ناجائز تعلقات کی خبروں سے بھرے ہوئے...... عورت...... ہر طرف نیم عریاں عورت کی تصویر...... کوئی مجھے یقین دلا دے کہ قرآن کی سرزمین پر جو کچھ ہو رہا ہے، یہی فرمان خداوندی ہے تو میں دل پر سل رکھ کر تمام مہاجرین سے اپیل کروں گا کہ ان بچوں کو بھول جائیں جو انہوں نے پاکستان کے نام پر کفار کے ہاتھوں ذبح کرائے اور زندہ جلائے تھے اور ان بچیوں کو بھول جائیں جو بھیڑیوں کے ہاتھ چڑھ گئی تھیں اور شرمناک اذیتیں سہہ سہہ کر اس سرزمین پر قربان ہو گئیں۔ کیونکہ یہی فرمان خداوندی ہے۔

آج چھ ستمبر 1965ء کا دن ہے۔ پسرور کی زمین لرز رہی ہے۔ سیالکوٹ کی فضا ہندو کی توپوں کے دھوئیں سے سیاہ گھٹا بن گئی ہے۔ ہمارے بچوں کا قاتل پاکستان کی آبرو پر ٹوٹ پڑا ہے۔ سرحد سے دیہاتی اسی طرح بھاگ چلے آ رہے ہیں جس طرح ہم تھلیاں سے بھاگے تھے مگر ہم نے انہیں دور نہیں جانے دیا۔ ہم پسرور والوں نے اپنے دروازے کھول دیئے ہیں۔ سینے کے پٹ کھول دیئے ہیں۔ سرحد سے جو پاکستانی بچہ، بوڑھا، مرد، عورت ڈری سہمی ہوئی آتی ہے۔ ہم اسے اپنے گھر بٹھا کر اپنے سینے میں سمیٹ لیتے ہیں۔

کفار کے لشکر بڑھتے آ رہے ہیں۔ آگ کا طوفان تیزی سے چلا آ رہا ہے۔ ہم نہیں بھاگیں گے۔ پٹھانکوٹ میں ہم نہتے تھے۔ پسرور میں ہم نہتے نہیں۔ آنے دو۔ پاکستان اور اسلام کے ازلی دشمن کو اور آگے آنے دو۔

میں اپنے ساجد اور ماجد کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ ساجد سولہ سال کا ہے اور ماجد اٹھارہ سال کا۔ کسی نے بتایا ہے وہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں لے کر سرحد کی طرف چلے گئے ہیں۔

میں جانتا ہوں سرحد دور ہے۔ وہ وہاں تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ پہنچ بھی گئے تو سوائے مرنے کے کچھ نہ کر سکیں گے۔ کلہاڑیاں اور لاٹھیاں ٹینکوں کا کیا بگاڑ سکتی ہیں لیکن میرا رواں رواں مسرور ہو گیا ہے۔ مسرور اس لئے کہ میرے بچے اور پسرور کے بچے اپنے دشمن کو پہچانتے ہیں۔

میں نے ڈرتے ڈرتے عائشہ کو بتایا ہے کہ ساجد اور ماجد سرحد کی طرف چلے گئے ہیں۔ آخر مجھے توقع تھی کہ بلبلا کر مجھے کہے گی کہ بھاگ کے جاؤ، انہیں گھر لے آؤ۔ گولا باری میں نہ چلے جائیں لیکن اس کی آنکھیں خلاؤں میں کہیں دور دیکھنے لگی ہیں اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جا رہی ہے۔ میں جانتا ہوں عائشہ کی نظریں اٹھارہ برسوں کے پردے چاک کر کے سرحد پار ان تین قبروں کو دیکھ رہی ہیں جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھودی تھیں اور وہ مسکرائی اس لئے ہے کہ اس کے بیٹے اپنے ننھے ننھے شہید بھائیوں کے خون کا انتقام لینے کے قابل ہو گئے ہیں۔

7 ستمبر 1965ء

جنگ ابھی پسرور سے دور ہے۔ جسڑ کے پل پر سنا ہے بڑا خونریز معرکہ لڑا جا رہا ہے اور سرحدوں پر حق اور باطل کی بھیانک جنگ ہو رہی ہے۔ خون تو بہہ رہا ہے۔ ماؤں کے چہیتے بیٹے شہید ہو رہے ہیں لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ مجھے وہ پاکستان نظر آنے لگا جس کی خاطر میں

23 ستمبر 1965ء

سترہ دن اور راتیں پسرور کے در و دیوار اپنی بڑی توپوں سے لرزتے کانپتے رہے ہیں۔ آج فضا خاموش ہے۔ ماحول گہری نیند سو گیا ہے۔ دشمن کا مان ٹوٹ گیا ہے۔ پاکستان کا پرچم بڑی شان سے جھوم رہا ہے۔ چونڈہ جسٹر، ہاناپور، برکی اور قصور، بدر، حنین، احد اور قادسیہ کی لڑی میں پرو دیئے گئے ہیں۔ یہ ہے پاکستان۔ وہ پاکستان جسے قرآن کی سرزمین کہتے ہیں۔ میری کھیتیاں جو میرے بچوں کو اناج دیتی ہیں میری نہیں، میرا گھر میرا نہیں، میرے بچے میرے نہیں۔ سب کچھ پاکستان کا ہے۔ جو شہید ہو گئے ہیں وہ میرے بچے تھے۔ جو شہید ہوں گے وہ میرے بچوں ہوں گے۔

10 جنوری 1966ء

نعرے جو پاکستان کی سرحد پر سنائی دئے تھے، ہمارے بادشاہوں نے تاشقند کی پرائی مٹی میں جا دفن کئے ہیں۔ شعلے جو پاکستان کے دل سے اٹھے تھے، تاشقند کی برف سے بجھا دیئے گئے ہیں۔ پاکستان کی ماؤں کے جن بیٹوں نے پاکستان کی آن پر اپنی ٹانگیں شہید کرائی تھیں وہ آج لنگڑے ہو گئے ہیں۔

ہم مر گئے ہیں۔ نہیں، میرے اندر سے آواز اٹھی ہے۔ کفر نہ بکو۔ ہم مرے نہیں۔ ہمارے گلے دبا لئے گئے ہیں۔ یہ بادشاہوں کا دستور ہے۔ رعایا اٹھے تو اسے بٹھا دو۔ بیٹھے تو اسے لٹا دو۔ لیٹے تو اس پر گھوڑے دوڑا کر روند ڈالو۔ ہم زندہ ہیں بادشاہ آتے ہیں، جاتے ہیں، پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ قومیں زندہ رہتی ہیں۔ تم زندہ ہو۔ اپنے آپ کو زندہ رکھو۔ اپنے بچوں کی آنکھوں پر چونڈہ کی مٹی ملو تا کہ ان کی روحیں روشن رہیں۔

یکم جون 1971ء

جس پاکستان کو ہم نے اپنے بچوں کے خون میں ڈبو کر حاصل کیا تھا وہ آج فحاشی، بے حیائی اور جرم و گناہ میں ڈوب گیا ہے۔ آج سرحد پر آن بیٹھا ہوں۔ کاغذ قلم ساتھ لے آیا ہوں۔ عائشہ سے کہہ آیا ہوں کہ کھیتوں پر جا رہا ہوں۔ طبیعت ہارنے لگی ہے۔ شاید یہ بڑھاپے کے آثار ہیں کہ ذرا سی بے حرکی سے طبیعت پر رقت طاری ہو جاتی ہے۔

آج سرحد پر بیٹھے ہوئے 17 اگست کا ایک ایک لمحہ یاد آ رہا ہے اور لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ ڈائری ساتھ ساتھ لکھتا رہا ہوں۔ نہیں۔ یہ آج لکھ رہا ہوں۔ چوبیس سال بعد۔ میں تو سمجھا تھا کہ بہت سی باتیں بھول گیا ہوں مگر ذہن قدم قدم کی واردات اگلتا جا رہا ہے۔ اور میں لکھتا جا رہا ہوں۔ لکھنے سے میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ مجھ سے ہمدردی کریں اور پڑھ کر یہ کہہ دیں کہ یہ ایک مہاجر کی داستان ہے۔ جو پٹھانکوٹ سے ہجرت کر کے پسرور میں آباد ہوا تھا۔ میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ میری نہیں ہر مہاجر کی آپ بیتی ہے اور یہ بھی کہ ہمیں پاکستان مفت نہیں ملا تھا۔

عزیز پاکستانیو! میں جس پاکستان کو ڈھونڈ رہا ہوں وہ ہمارے قدموں میں پڑا سسک رہا ہے۔ ہم قرآن کی سرزمین کو پاؤں تلے روند رہے ہیں۔ ذرا سر جھکا کے تو دیکھو۔ تمہیں پاکستان نظر آ جائے گا۔ نہ نظر آئے تو پسرور آ جاؤ۔ میں تمہیں چونڈہ لے چلوں گا۔ وہاں سے ساری سرحد پر پھراؤں گا۔ وہاں سے مٹی کے کسی ڈھیلے کو اٹھا کر سونگھنا تمہیں پاکستان پر قربان ہونے والوں کے لہو کی عطر بیز بو آئے گی اور اس بو میں تمہیں پاکستان نظر آئے گا اور یہ ہو گا وہ پاکستان جس کی خاطر ہم سب نے بچے ذبح کروائے تھے۔

●●●

چار دیواری کی دنیا

کبھی ماں جوان ہوئی تھی، آج اس کی بیٹی جوان ہوگئی ہے
جس نے ماں کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے.....

☆ نسیم سکینہ صدف

مسئلہ ہی ایسا آن پڑا تھا کہ میں پریشان ہوگئی۔ مسئلے کا تعلق میری بیٹی سے تھا جو ایم اے میں پڑھ رہی ہے۔ اس مسئلے نے میری نیند حرام کردی۔ بیٹی جوان ہو جائے تو ماں باپ کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔ اگر میرا خاوند زندہ ہوتا تو مجھے اتنی فکر اور پریشانی نہ ہوتی۔ جب سے میری بیٹی جوان ہوئی تھی اس کے رشتے آرہے تھے اور یہ سب امیر خاندانوں کے لڑکوں کے رشتے تھے۔ ان میں سے چند امیدواروں کو میں نے صاف انکار کردیا تھا کیونکہ یہ اوچھے اور شوباز قسم کے لالچی لوگ تھے اور ان کی نظریں ہماری جائیداد پر لگی ہوئی تھیں۔ ایک دو اچھے اور پُروقار گھرانے مجھے پسند تھے اور میری خواہش تھی کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاں بیٹی کو بیاہ دوں۔

میں ایف اے تک پڑھی ہوئی ہوں۔ آج کل ایف اے کوئی خاص تعلیم نہیں سمجھی جاتی لیکن میں نے ان وقتوں میں ایف اے کیا تھا جب میٹرک تک پڑھنا بھی بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ تعلیم کی وجہ سے میرے اندر روشن خیالی پیدا ہوگئی۔ میں مطالعہ اور لکھنے کی شوقین ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی شاعری بھی کرلیتی ہوں لیکن صرف شوق کی حد تک، میں نے شاعری کو جنون نہیں بنایا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تعلیم نے میرے اندر خود اعتمادی اور خیالوں میں پختگی پیدا کردی تھی اور یہی خود اعتمادی میں نے اپنی بیٹی میں بھی پیدا کردی تھی۔

میں نے بیٹی کے ساتھ اس کی شادی کی بات کی اور اس کے رشتے کے امیدوار گھرانوں کے متعلق تفصیل سے بتا کر کہا کہ وہ ان میں سے جہاں پسند کرے وہاں میں ہاں کردوں۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اطمینان سے دو چار

دن سوچ کر مجھے اپنی مرضی بتا دے۔

''سوچنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے''۔ بیٹی نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''مجھے ان میں سے کوئی بھی پسند نہیں..... آپ ان لوگوں سے معذرت کرلیں''۔

بیٹی کے دوٹوک انداز نے مجھے سمجھا دیا کہ وہ اپنی زندگی کا ساتھی پسند کرچکی ہے اور اپنے فیصلے سے ایک انچ اِدھر اُدھر نہیں ہٹے گی۔ میرے پوچھنے پر اس نے ایک لڑکے کے متعلق بتایا جو اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا اور خوشحال گھرانے کی واحد اُمید تھا۔ میں نے لڑکے کے گھر کا پتہ اور اس کے ماں باپ کا نام پوچھا اور اپنے طور پر معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اپنی بیٹی پر غصہ نہیں آیا بلکہ خوشی ہوئی کہ اس نے سب کچھ صاف صاف مجھے بتا دیا ہے۔

میں نے اپنے طور تحقیقات کی تو پتہ لگا کہ لڑکے کی صرف ماں ہی ماں ہے اور باپ نے لڑکے کے بچپن میں ہی اس کی ماں کو طلاق دے دی تھی اور ایک انگریز لڑکی سے شادی کرلی تھی اور مستقل انگلینڈ چلا گیا تھا۔ لڑکے کی ماں کا نام رضیہ بتایا گیا تھا۔ میں نے رضیہ سے ملنے کا فیصلہ کرلیا اور اگلے ہی دن وہاں جا پہنچی۔ یہ بڑی بڑی کوٹھیوں کا علاقہ تھا۔ ہر طرف ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور کشادہ کوٹھی تھی۔ میں اس سے پہلے بھی کئی بار اس علاقے میں آچکی تھی مگر یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں جوان تھی اور یہاں نئی نئی کوٹھیاں بننی شروع ہوئی تھیں۔ اب تو یہ علاقہ پہچانا ہی نہیں جاتا تھا۔

بڑی مشکل سے مطلوبہ کوٹھی کو تلاش کیا۔ گیٹ پر چوکیدار کو کہہ کر اندر اطلاع بھجوائی۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر اطلاع کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جو عورت ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، میں اسے دیکھ کر اور وہ مجھے دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اگرچہ وقت نے ہم دونوں پر اپنے اثرات مرتب کئے تھے لیکن ہم دونوں نے فوراً ایک دوسری کو پہچان لیا۔ وہ میری کالج کے زمانے کی سہیلی رضیہ تھی، اپنے آپ کو رضیہ کی بجائے رضی کہلوانا زیادہ پسند کرتی تھی۔

اسے دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ بڑی خوش ہوکر ملی اور ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگیں۔ میں نے بالکل نہ بتایا کہ میں کس مقصد کے لئے آئی ہوں۔ مجھے دھچکا اس لئے لگا تھا کہ میری بیٹی رضی کے بیٹے کو پسند کرچکی تھی اور میں رضی کے ماضی سے واقف تھی۔ یہی مسئلہ میرے لئے پریشانی کا باعث بنا تھا۔

مجھے اپنی جوانی کے دن یاد آگئے۔ میرے والدین مشرقی پنجاب کے رہنے والے تھے۔ جب وہاں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا تو میرے ابا اور امی خاندان کے لوگوں کے ساتھ ہجرت کرکے لاہور آگئے۔ ابا جان کی کوششوں سے ایک سکھ خاندان کی چھوڑی ہوئی حویلی ہمیں الاٹ ہوگئی۔ ہمارے خاندان والے چونکہ حالات زیادہ خراب ہونے سے پہلے ہی نکل آئے تھے اس لئے اچھی خاصی نقدی اور زیورات ساتھ لے آئے تھے۔ انہوں نے اپنی زمین جائیداد اونے پونے بیچ دی تھی۔ یہاں آکر چھوٹا موٹا کاروبار کرلیا جو چل نکلا۔ ہم زیادہ امیر تو نہ ہوئے لیکن گھر میں خوشحالی تھی اور رہنے کو اچھی خاصی حویلی۔

میٹرک کے بعد جب کالج پہنچی تو وہاں کے رنگ ڈھنگ ہی نرالے تھے۔ سکول کی نسبت آزاد ماحول تھا۔ یہیں میری ملاقات رضیہ سے ہوئی۔ وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی اور بہت امیر گھر سے تعلق رکھتی تھی۔ کار پر کالج آتی جاتی تھی۔ کار کبھی ڈرائیور لے کر آتا کبھی اس کا بھائی۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب کار کسی امیر کبیر فیملی میں ہی ہوتی تھی۔ رضی کو اپنی امارت اور حُسن پر بڑا ناز تھا اور جا بے جا وہ اس کا اظہار کرنے سے چوکتی نہیں تھی۔ بات بات پر ''میری گاڑی، میرا ڈرائیور، ہماری کوٹھی اور

ہمارے نوکر" وغیرہ جیسے الفاظ اس کی زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس میں سنجیدہ اور سادہ رہتی تھی اور میری طبیعت میں شوخی بالکل نہ تھی۔ پھر بھی ہماری دوستی ہوگئی حالانکہ مزاج کے لحاظ سے ہم دونوں الٹ تھیں۔ دوستی بھی ایسی ہوگئی کہ ہم کالج میں ہر جگہ اکٹھی نظر آنے لگیں اور ہماری دوستی کالج میں مشہور ہوگئی۔

چھٹی کے وقت رضی کا ڈرائیور لینے آتا تو وہ مجھے اپنی کار میں بٹھا لیتی اور ہمارے علاقے کے قریب سے گزرنے والی سڑک پر اتار دیتی۔ وہاں سے ہمارا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔ مجھے کالج جاتے چار پانچ ماہ ہوگئے تھے۔ ایک دن چھٹی کے وقت میں رضی کے ساتھ کالج سے باہر نکلی اور حسب معمول اس کے ساتھ اس کی کار کی طرف بڑھنے لگی۔ رضی کی کار سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور سرخ رنگ کی نئی کار کھڑی تھی۔ ہم دونوں رضی کی کار میں بیٹھنے لگی تھیں کہ سرخ کار کا ہارن زور زور سے بجنے لگا۔ ہم دونوں نے اس طرف دیکھا۔ سرخ کار میں ایک خوبصورت نوجوان بیٹھا ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ میں نے پریشان ہو کر رضی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی اور ساتھ ساتھ ہاتھ ہلا کر کچھ اشارہ بھی کر رہی تھی۔

"یہ میرا کزن زبیر ہے"۔ رضی نے مجھے پریشان دیکھ کر نوجوان کا تعارف کرایا اور کہا۔ "یہ میرا دوست بھی ہے اور مجھے لینے آیا ہے۔ تم ایسا کرو میرے ڈرائیور کے ساتھ گھر چلی جاؤ۔ میں زبیر کے ساتھ گھوم پھر آؤں"۔ پھر اس نے اپنے ڈرائیور کو سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ رضی اپنے کزن کے ساتھ چلی گئی اور اس کا ڈرائیور مجھے گھر چھوڑ گیا۔ اس کے بعد اکثر ہی ایسا ہونے لگا۔ اس کا کزن آتا اور وہ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چلی جاتی۔ رضی نے زبیر کے ساتھ میرا بھی تعارف کرا دیا۔ چند ملاقاتوں میں ہی میں نے نوٹ کر لیا کہ رضی جتنی شوباز اور چلبلی لڑکی ہے زبیر اتنا ہی پروقار اور سلجھا ہوا نظر آتا تھا۔ دو تین بار میں بھی ان دونوں کے ساتھ گھومنے پھرنے اور ہوٹل میں کھانا کھانے گئی۔ سچ پوچھئے، میری خاندانی حیثیت ایسی تھی کہ ان دونوں کے ساتھ گھومنا پھرنا، ہوٹل میں کھانے کھانا اور آئس کریم کھانا خواب لگتا تھا۔ یہ دونوں اپر کلاس کے اور میں مڈل کلاس کی لڑکی تھی۔ ایسی عیاشی تو میں صرف خواب میں دیکھ سکتی تھی۔

کبھی کبھی رضی کا بھائی جو کالج میں پڑھتا تھا، اسے لینے آجاتا تھا۔ وہ بھی رضی کی طرح شوباز تھا بلکہ کچھ اوچھا بھی تھا۔ وہ خواہ مخواہ میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا تھا لیکن میں نے اسے کبھی لفٹ نہیں کرائی تھی۔ میں دو چار بار رضی کو اپنے گھر بھی لے کر گئی اور اپنے ابا سے ملوایا۔ ماں تو فوت ہو چکی تھی اس لئے میں اپنے ابا سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔ کسی بات کی اہمیت ہوتی یا نہ ہوتی، میں ان کو ضرور بتاتی۔ اسی طرح کبھی کبھی میں ابا کی اجازت سے رضی کے گھر بھی چلی جاتی۔

رضی نے مجھے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے زبیر کی اور اس کی منگنی ہو جائے کیونکہ دونوں کے گھر والوں کا کچھ ایسا ہی ارادہ ہے۔ دونوں کے گھر امیر طبقے سے تعلق رکھتے تھے بلکہ زبیر کا باپ کچھ زیادہ ہی دولت مند تھا۔ ان کی نظر میں لڑکی لڑکے کا اکٹھے گھومنا پھرنا معیوب نہیں تھا۔

ایک دن رضی کالج نہیں آئی۔ چھٹی کے وقت میں گھر جانے کے لئے نکلی تو زبیر کی گاڑی نظر آئی۔ اس نے ہارن بجا کر مجھے متوجہ کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ آج رضی نہیں آئی اور وہ انتظار نہ کرے۔

"مجھے پتہ ہے وہ آج نہیں آئی"۔ زبیر نے اطمینان سے کہا۔ "اس نے مجھے کل ہی بتا دیا تھا۔ میں آپ کی وجہ سے آیا ہوں"۔

"میری وجہ سے!" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیوں؟"

''آپ سے کچھ ضروری بات کرنا چاہتا ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''براہِ کرم گاڑی میں بیٹھ جائیں، یوں کھڑے رہنا اچھا نہیں لگتا''۔ اس نے میرے لئے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

میں نہ چاہتے ہوئے بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ گاڑی چل پڑی۔ گاڑی کیا چلی، میرے دماغ میں اندیشوں اور وسوسوں نے یلغاری کر دی۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگی کہ میں کیوں ایک غیر آدمی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں اس کشمکش میں تھی کہ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ اس کے ساتھ ہی میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ گاڑی ایک اعلیٰ اور امیرانہ درجے کے ریستوران کے سامنے رکی تھی۔

زبیر مجھے لے کر فیملی کیبن میں بیٹھ گیا اور کھانے کا آرڈر دے دیا۔ کھانا آ گیا اور ہم کھانا کھانے لگے۔ کھانے کے دوران ہی میں نے زبیر سے کہا کہ اس نے جو بھی بات کرنی ہے جلدی سے کرے کیونکہ مجھے گھر بھی پہنچنا ہے۔ مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تو تھی ہی لیکن اصل بات یہ تھی کہ میں یقین کر ہی نہیں سکتی تھی کہ زبیر مجھے خلوصِ نیت اور شرافت سے یہاں لایا ہے۔ میری سوچ یہ تھی کہ یہ اپنے مقابلے میں مجھے غریب اور سادہ لوح لڑکی سمجھ کر ورغلائے گا اور یہ اتنے امیرانہ کھانے سے میرا دماغ خراب کرنا چاہتا ہے۔

''آپ بُرا نہ مانئے''۔ زبیر نے کہا۔ ''میں سیدھا سادہ آدمی ہوں اس لئے بغیر کسی تمہید باندھے بات کروں گا۔ آپ مجھے اچھی لگی ہیں اور میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور اس میں بے حد سنجیدہ ہوں''۔

مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ رضی مجھ سے زیادہ خوبصورت تھی اور امیر بھی اور پھر ان دونوں کی شادی بھی متوقع تھی۔ دونوں ایک ہی خاندان اور طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی شادی میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی ... میرا یہ خدشہ صحیح ثابت ہونے لگا کہ یہ مجھے ورغلائے گا۔ شادی کا خواب دکھا کر میری عصمت کو کھلونا بنائے گا۔

''آپ کو پتہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں!'' میں نے پوچھا۔

''جو کچھ کہا ہے خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے''۔ اب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''شادی آپ ہی سے کروں گا''۔

''لیکن آپ کی اور رضی کی...''

''میں رضی سے شادی نہیں کروں گا''۔ اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ ''میں اسے بیوی کی حیثیت سے برداشت نہیں کر سکوں گا۔ اس کے ساتھ رشتہ داری اور دوستی ایک الگ چیز ہے''۔ اس نے رضی سے بیزاری کا اظہار شروع کر دیا۔

''رضی کیا سوچے گی!'' میں نے کہا۔

''کوئی کیا سوچتا ہے۔ مجھے اس کی پروا نہیں''۔ زبیر نے کہا۔

میں نے اسے بتایا کہ میرے اور اس کے سوشل سٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ رضی مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے اور دولتمند بھی ہے اور اسے وہاں سے جہیز بھی اس کے شایانِ شان ملے گا۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوا ہو۔ اس کے جواب میں اس نے بڑی لمبی بات کی جو مختصراً یوں تھی کہ اسے رضی کا ماڈرن ہونا اور آزادانہ مردوں سے ملنا پسند نہیں تھا۔ اسے شوبازی اور اوچھی حرکتوں سے نفرت تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے جہیز یا دولت کی پروا نہیں ہے۔ اسے میری سنجیدگی اور متانت اچھی لگی تھی۔

زبیر نے مجھے کہا کہ رضی کے گھر میں ضرورت سے زیادہ آزادروی ہے۔ رضی کا بھائی لڑکیوں سے دوستیاں

لگانے میں بدنام ہے اور ان کے گھر میں شادی بیاہ اور دعوتوں وغیرہ میں کھلے عام شراب بھی پی جاتی ہے۔ اسے راہ روی کو یہ لوگ اپنا حق سمجھتے ہیں۔

فطری سا سوال تھا جو میں نے اس سے کیا کہ اسے رضی میں اتنی خامیاں نظر آتی ہیں تو اس کے ساتھ ایسی گہری دوستی کیا مطلب؟

''اپنے والدین کی عزت کی خاطر!'' زبیر نے جواب دیا۔ ''والدین کی خوشی کی خاطر میں نے رضی کو قبول کر لیا تھا اور اسے اپنے ساتھ بے تکلف کر کے حقیقی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن مجھے مایوسی ہونے لگی تھی۔ میں جو اوصاف اس میں پیدا کرنا چاہتا تھا وہ تم میں نظر آ گئے۔ میں نہ اپنا سوشل سٹیٹس دیکھ رہا ہوں نہ تمہارا۔ میں جو چاہتا تھا وہ مجھے مل گیا ہے''۔

میں نے زبیر کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور کشمکش میں پڑ گئی کہ اسے کیا جواب دوں۔ زبیر نے یہ بھی کہا کہ میں ابھی رضی کے ساتھ اس سلسلے میں بات نہ کروں، ہو سکتا ہے وہ میری دشمن ہو جائے۔ زبیر نے مجھے سوچوں میں گم دیکھا تو کہا کہ آرام سے گھر جا کر سوچ لینا اور ہفتے میں دس دن تک مجھے اپنی رائے دے دینا۔ اس کے بعد زبیر نے ایک مناسب جگہ پر مجھے ڈراپ کر دیا اور میں وہاں سے رکشہ لے کر گھر آ گئی۔

پہلی بار ایسا ہوا کہ میں نے اپنے ابا سے کوئی بات چھپائی اور انہیں کچھ نہیں بتایا۔ بتاتی بھی کیسے! زبیر نے رضی کے متعلق اور اس کے گھر والوں کے متعلق جو باتیں بتائی تھیں میرا اباتوں پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ میں شش و پنج میں پڑ گئی کہ رضی سے بات کروں یا نہ کروں۔ وہ جیسی کیسی بھی تھی، میرے ساتھ بہت پیار کرتی تھی اور مخلص تھی۔ میرا دل نہیں مانتا تھا کہ اسے دھوکے میں رکھوں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے کہ یہی بات اسے کسی اور سے پتہ چلے، میں خود اسے سب کچھ بتا دوں گی۔

اگلے دن کالج سے چھٹی تھی۔ میں نے ابا جان سے رضی کے گھر جانے کی اجازت لی اور رکشے میں بیٹھ کر کوٹھیوں کے علاقے میں پہنچ گئی۔ رضی کی کوٹھی میں پہنچی تو اس کا بھائی مل گیا۔ میں نے اس سے رضی کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ ڈرائنگ روم میں بیٹھوں اور وہ رضی کو بھیجتا ہے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گیا اور کہنے لگا رضی سو رہی تھی۔ میں نے اس کو جگایا ہے وہ نہا دھو کر ابھی آ جاتی ہے۔ اتنا کہہ کر وہ میرے ساتھ لگ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بے تکلفی کا اظہار کرنے لگا۔ میں سرک کر ذرا پرے ہٹ گئی۔ وہ ڈھیٹوں کی طرح میرے قریب ہو گیا اور باتوں باتوں میں مجھے دوستی کرنے کی ترغیب دینے لگا۔ دوستی سے اس کی مراد ناجائز تعلقات ہی ہو سکتے تھے۔

میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے میرا وجود تپنے لگا تھا۔ اب مجھے زبیر کی باتیں سچ معلوم ہونے لگی تھیں۔ میں اس گھر میں پہلے بھی کئی بار آ چکی تھی اور رضی کے کمرے سے واقف تھی۔ میں سیدھی رضی کے کمرے کی طرف گئی اور اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور رضی آنکھیں ملتی ہوئی نکلی۔ مجھے دیکھتے ہی لپٹ گئی اور اندر لے گئی۔ ہم دونوں بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

''تم ابھی تک سو رہی تھیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں، کیوں، کیا بات ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''چھٹی والے دن میں دوپہر کو ہی اٹھتی ہوں''۔

''تمہارے بھائی نے تمہیں جگا کر میرے متعلق نہیں بتایا؟''

''نہیں''۔ اس نے حیران ہو کر کہا۔ ''آخر بات کیا ہے؟''

میں نے اسے اس کے بھائی کی حرکت سنائی تو وہ

غصے میں آنے کی بجائے ہنس پڑی اور کہنے لگی کہ وہ کچھ زیادہ ہی شرارتی ہو گیا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔ میرا خون ابھی تک کھول رہا تھا اور وہ بڑے مزے سے اس بے ہودگی کو شرارت کہہ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ پر قابو پایا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے رضی سے کہا کہ میں ایک خاص بات کرنے کے لئے آئی ہوں اور پھر میں نے ساری صورتِ حال اس کے سامنے رکھ دی۔

توقع تو یہ تھی کہ وہ غصے میں آ کر زبیر کو گالیاں بکے گی اور میرے ساتھ بھی ناراض ہو گی لیکن اس کا ردِعمل کچھ اور ہی تھا۔ پہلے تو اسے یوں دھچکا لگا جیسے میں نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیئے ہوں۔ حیرت اور صدمے سے اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں اور منہ کھل گیا۔ میں ڈر گئی کہ اب میری خیر نہیں لیکن ایک آدھ منٹ گزر گیا تو اس نے مجھے یوں حیران کر دیا کہ اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور میری حوصلہ افزائی کی کہ زبیر بہت اچھا لڑکا ہے اور میں ہاں کر دوں۔ میں نے اس سے کہا کہ تمہارا کیا بنے گا کیونکہ تم زبیر کو پسند کرتی ہو اور زبیر کے ساتھ تمہاری دوستی بھی ہے۔

”دوست کی حیثیت سے تو زبیر ٹھیک تھا“۔ رضی نے کہا۔ ”لیکن شوہر کی حیثیت سے وہ مجھے سوٹ نہیں کرتا۔ وہ بڑا شکی مزاج ہے۔ ہر وقت پابندیاں لگاتا رہتا ہے۔ فلاں سے ملو فلاں سے نہ ملو۔ فلاں نے ہنس کر بات کیوں کی وغیرہ۔ میں یہ پابندیاں برداشت نہیں کر سکتی۔ میرے لئے لڑکوں کی کمی نہیں، میں اپنے مطلب کا لڑکا پسند کرلوں گی“۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ اگر زبیر کے والدین میرے گھر رشتہ مانگنے آتے ہیں تو میری پوزیشن خراب ہوتی تھی، ابا جان کو کچھ شک ہو جانا تھا۔ میں نے یہ مشکل رضی کے آگے رکھی تو اس نے کہا کہ یہ رشتہ میں خود کراؤں گی۔ پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ پہلے میرے ابا سے مل کر بات کی پھر زبیر کے ماں باپ کو ہمارے گھر لے آئی۔

ابا جان نے ان کو کہا کہ مجھے اس رشتے سے انکار نہیں لیکن ہم مڈل کلاس لوگ ہیں اور وہ بہت دولتمند ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کل کلاں میری بیٹی کو طعنے سننے پڑیں۔ زبیر کے ماں باپ بہت شریف لوگ تھے۔ انہوں نے کہا کہ امیر غریب سب اللہ نے بنائے ہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے بس آپ ہمیں بیٹی عطا فرما دیں۔ اس مسئلے پر بڑی باتیں ہوئیں اور آخرکار زبیر کے باپ نے میرے ابا کو قائل کر لیا۔

پھر ایک ماہ کے اندر اندر میری شادی زبیر سے ہو گئی۔ زبیر اور اس کے والدین اتنے دولت مند ہونے کے باوجود بہت نیک اور شریف لوگ ثابت ہوئے۔ میری زندگی خوش باش گزرنے لگی۔

میری شادی کے تین ماہ بعد رضی کی بھی شادی ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ لڑکا اس نے خود پسند کیا ہے۔ وہ بہت خوش تھی۔ پھر آہستہ آہستہ ہماری ملاقاتیں کم ہونے لگیں اور کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گئیں۔ میری شادی کو چار سال گزر رہے تھے اور میری ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ جب مجھے کہیں سے پتہ چلا کہ رضی کو طلاق ہو گئی ہے۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔

میں رضی سے افسوس کا اظہار کرنے اس کے گھر جا پہنچی۔ وہ بڑی خوشی سے ملی۔ اس کی حرکتوں سے لگتا ہی نہیں تھا کہ اسے طلاق کا کوئی افسوس ہے بلکہ وہ پہلے سے زیادہ خوش نظر آتی تھی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا تو کہنے لگی دفع کرو اس حرامی کو، میرے لئے لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔ جب دل کرے گا شادی کر لوں گی۔ اس سے پتہ چلا کہ اس کا ایک بیٹا ہے جو اس کا خاوند اس کے پاس چھوڑ گیا ہے۔

اس نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ اس کا خاوند کسی

رشتے دار سے ملنے انگلینڈ گیا تھا، وہاں اس کی ملاقات ایک انگریز لڑکی سے ہوگئی اور وہ اسے ساتھ ہی پاکستان لے آیا اور اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ میں نے اعتراض کیا تو اس نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ میں اس کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاؤں۔ اس کی دیکھا دیکھی میں نے بھی اپنے دوستوں کو گھر بلانا شروع کر دیا۔ اس سے بات بڑھ گئی۔ وہ پہلے ہی انگریز لڑکی سے شادی کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے طلاق دے دی اور انگلینڈ چلا گیا۔

پھر رضی نے دوسری شادی کر لی مگر یہ شادی بھی زیادہ دیر نہ چلی اور صرف ایک سال بعد ہی اسے طلاق ہو گئی۔ اس کا دوسرا شوہر کوئی غیرت مند آدمی تھا جو اس کی بے راہروی کو برداشت نہ کرسکا اور رضی اس کی لگائی ہوئی پابندیاں برداشت نہیں کر سکی۔ اس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا۔

پھر بہت سارا وقت گزر گیا۔ میری بیٹی جوان ہونے لگی۔ جب بیٹی کی عمر پندرہ سال کو پہنچی تو زبیر کا انتقال ہوگیا۔ اسے دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہسپتال تک جانے کی مہلت ہی نہ ملی۔ زبیر کے انتقال پر رضی اور اس کے گھر والے بھی آئے تھے۔ یہ رضی سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس وقت مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میرے لئے بڑا مشکل وقت آپڑا تھا لیکن میرے ساس سسر نے مجھے اور میری بیٹی کو سنبھال لیا۔ روپے پیسے کی فراوانی نے بھی کوئی خاص مسئلہ نہ پیدا ہونے دیا۔ اس کے بعد رضی کا اور میرا رابطہ مکمل طور پر منقطع رہا۔

آج میری بیٹی جوان ہوگئی ہے اور اس نے اپنی زندگی کے سفر کے لئے جس ہم سفر کو پسند کیا ہے وہ میری سہیلی رضی کا بیٹا ہے۔ میں اس کشمکش میں ہوں کہ کیا کروں۔ حالات نے مجھے عجیب دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ میرے سامنے یہ مسئلہ سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔

▲▼▲

* چھتیس بھوجن ہشتر روگ۔ (ہندی کہاوت)
* جسم کی راحت طعام کی کمی میں ہے۔ (فارسی کہاوت)
* کھانے سے غرض یہ ہے کہ تو جیتا ہے اور نیک کام کرے۔ مگر تو خیال کرتا ہے کہ زندگی صرف کھانے کے لیے ہے۔ (زالد کہاوت)
* انسان کا پیٹ اس کا دشمن ہے۔ (عربی کہاوت)
* گر طعام بیگانہ تھا تو منہ تو اپنا تھا۔ (پشتو، افغانی کہاوت)
* بھرا ہوا پیٹ نصیحت نہیں سنتا ہے۔ (روسی کہاوت)
* تھوڑا کھاؤ عیش مناؤ۔ (ہندوستانی کہاوت)
* آدھے امراض جو انسانوں کو لاحق ہوتے ہیں ایسی غذائی غلطیوں سے پیدا ہوتے ہیں جن سے بچنا ممکن ہے۔

(ڈاکٹر سر ونسٹر تھامس)

* مستقبل میں از الۂ مرض کے لیے جو چیز ہم مریضوں کو بتائیں گے وہ دوا نہیں غذا ہوگی، علاج کا تعلق دوا سے نہیں غذا سے ہوگا۔

ڈاکو سے انٹرویو

راجہ مہدی علی خان

انتخاب: حبیب اشرف صبوحی

جی اس بندے کو ویسے تو ابو داؤد کہتے ہیں
بہت سے مہرباں لیکن ابوالردود کہتے ہیں
مرے والد فرید آباد کے مشہور ڈاکو تھے
خدا بخشے انہیں، اپنے زمانے کے ہلاکو تھے
فرنکاباد کا تھانہ مرے نانا نے لوٹا تھا
وہ گیارہ سیر کا تالہ اسی بندے سے ٹوٹا تھا
نہیں تھا چور کوئی شہر میں دادا کے پائے کا
چرا کر گھر میں لے آئے تھے کتا وائسرائے کا
مرے ماموں کے جعلی نوٹ امریکہ میں چلتے تھے
ہزاروں چور ڈاکو ان کی نگرانی میں پلتے تھے
مرے پھوپھا چھٹے "بدمعاش" تھے اپنے زمانے کے
خدا بخشے بہت شوقین تھے وہ جیل خانے کے
مرے خالو کبھی نیویارک میں جیبیں کترتے تھے
لبِ ساحل وہ گیارہ عورتوں سے عشق کرتے تھے
لکڑ نانا ولی اللہ تھے سونا بناتے تھے
حسیں بیواؤں کو رو رو کے سینے سے لگاتے تھے
خسر صاحب سخاوت پور کی رانی بھگا لائے
مرے ہم زلف اس کی تین بہنوں کو اٹھا لائے
چچا میرے بہت مشہور تھے فن رذالت میں
"مقدمہ" ہار کے وہ ننگے ناچے تھے عدالت میں

مرے بھائی نے کی تھی فور ٹونٹی چیف جسٹس سے
وہ جب بگڑا جلا دیں اس کی مونچھیں اپنی ماچس سے
بڑے وہ لوگ تھے لیکن یہ بندہ بھی نہیں کچھ کم
خدا کا فضل ہے مجھ پر نہیں مجھ کو بھی کوئی غم
اجازت ہو تو اب بندہ اشارے ہی اشارے میں
بتا دے آپ کو تفصیل سے کچھ اپنے بارے میں
میں راجوں اور مہاراجوں کی جیبیں بھی کترتا تھا
چرس، کوکین اور افیون کا دھندا بھی کرتا تھا
مرے معمولی شاگردوں نے چودہ بینک لوٹے تھے
مری کوشش سے باعزت بری ہو کر وہ چھوٹے تھے
عدالت مانتی تھی میری قانونی دلیلوں کو
کرایا میں نے اندر شہر کے پندرہ وکیلوں کو
مسافر تین عدد پھینکے تھے ایروپلین سے میں نے
ہوابازوں کو بھی پیٹا تھا جا کر کین سے میں نے
''اٹھارہ'' ڈاکوؤں کی پگڑیاں میں نے اتاری تھیں
کمر سے تھوڑا نیچے ٹھوکریں بھی ان کے ماری تھیں
نہ انکم ٹیکس دیتا تھا نہ سوپر ٹیکس دیتا تھا
میں الٹا اپنی سب انکم پہ ان سے ٹیکس لیتا تھا
جو دن میں نے گزارے، شان و شوکت سے گزارے ہیں
ذرا کچھ ان دنوں ہی میرے گردش میں ستارے ہیں
مجھے کر لیں جو شامل چوریوں میں اور ڈاکوں میں
یقیناً چند دن میں آپ سب کھیلیں گے لاکھوں میں

آیئے، جشنِ آزادی منانے کی بجائے اس بات کا عہد کریں کہ دشمن کی سازشوں کو ناکام بنانا اور اپنی صفوں میں نفاق پیدا نہیں ہونے دینا!

"را" اور سی آئی اے کی پاکستان کے خلاف محاذ آرائی

☆ گلزار اختر کاشمیری 0345-8599944

آرمی چیف جنرل راحیل شریف نے ایک بیان میں کہا کہ پاکستان دوسرے ممالک میں پراکسی وار لڑنے کے خلاف ہے اور کسی کو بھی پاکستان میں پراکسی وار لڑنے کی اجازت نہیں دے گا۔ جنرل راحیل شریف نے نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں خطاب کے دوران کہا کہ مستقبل میں لڑی جانے والی جنگوں کے نقش ونگار بدل گئے ہیں۔ ہمارے دشمن پاکستان میں دہشت گردوں کی حمایت کر کے مسلح تصادم کو ہوا دے رہے ہیں اور پاکستان کو غیر مستحکم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر دشمن کے عزائم کو شکست دینے کے لئے ہمارا پختہ عزم ہے۔

انہوں نے کشمیر پر بات کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر ہندوستان کا نامکمل ایجنڈا ہے۔ پاکستان اور کشمیر کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ہم خطے میں امن اور استحکام چاہتے ہیں لیکن ہم اقوام متحدہ کی قراردادوں کی روشنی میں مسئلہ کشمیر کا حل چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا مسئلہ کشمیر حل کئے بغیر خطے میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ امن کی خواہش کو کمزوری نہ سمجھا جائے۔ دہشت گردوں کے خلاف آخری ضرب لگانے کی ضرورت ہے تاکہ خطے میں پائیدار امن قائم ہو سکے۔

پاکستان کے خلاف بھارتی قیادت آج کل بڑے شرانگیز بیانات جاری کر رہی ہے اور پاکستانی سیاسی قیادت کی طرف سے اسے اس طرح کا منہ توڑ جواب نہیں ملا جس سے اس کے حوصلے بڑھتے جا رہے ہیں۔ آرمی چیف نے اس سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے حالات کا تاریخی تناظر میں درست تجزیہ کرتے ہوئے حقیقت پر مبنی خیالات کا کھل کر اظہار کیا۔

کوئی پس پردہ رہ کر کسی دوسرے ملک کے خلاف خفیہ طریقے سے جنگ کرے اسے پراکسی وار کہتے ہیں۔ اس تناظر میں اپنے خطاب میں آرمی چیف نے ان ہی خفیہ لڑائیوں کا حوالہ دیا ہے۔ بھارت اس بات کو جتنی جلد سمجھ لے یہ اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ آرمی چیف کا یہ بیان سب کے لئے حوصلہ افزاء ہے اور پوری قوم کی امنگوں کا ترجمان ہے۔ افواج پاکستان دشمن کے ناپاک عزائم کو شکست دینے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ پاکستان اور کشمیر لازم و ملزوم ہیں، یہ کسی صورت جدا نہیں ہو سکتے۔

دوسری طرف آرمی چیف نے جو اشارہ کیا ہے پراکسی وار کی طرف تو اس وقت غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنسیاں پاکستان میں دہشت گردی کو ہوا دے رہی ہیں۔ ان میں خصوصی طور پر امریکن سی آئی اے اور بھارت کی ایجنسی ''را'' زیادہ سرگرم ہیں۔

بعض این جی اوز بھی در پردہ پاکستان کی سلامتی کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ ان میں ایک امریکی این جی او سیودی چلڈرن پر وزارت داخلہ نے نامناسب سرگرمیوں کی وجہ سے پابندی لگائی۔ ملک میں اس کے دفاتر بند کر دیئے گئے اور اس کے پندرہ غیر ملکی ملازمین کو ملک چھوڑنے کا حکم ملا۔ مگر امریکہ کی مداخلت کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے دفاتر پھر کھل گئے اور اس کے غیر ملکی ملازمین بھی بدستور ملک میں موجود ہیں۔

راولپنڈی میں اڈیالہ روڈ پر طویل عرصہ سے غیر ملکی امداد سے چلنے والے ایک بڑے جاسوسی سرکز پر چھاپہ مارا گیا۔ سنسنی خیز انکشافات ہوئے کہ پاکستان کی کابینہ اور اہم سرکاری اور خفیہ حساس اداروں کی اہم رازدارانہ بات چیت کا ریکارڈ شدہ مواد باہر بھیجا جاتا تھا، پکڑا گیا۔ پچھلے عرصہ میں امریکہ کی طرف سے جدید ترین فیکس مشینیں حکومت کو تحفے میں ملیں۔ جن میں جاسوسی کی چپ لگی ہوئی تھیں جس سے پاکستان کے راز بیرون ملک منتقل ہو سکتے ہیں، پکڑی گئیں۔ سابق وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے سینٹ کی قائمہ کمیٹی برائے داخلہ میں انکشاف کیا کہ کچھ بیرونی ایجنسیاں اور سفارت خانے وزیر اعظم ہاؤس سمیت پاکستان کے اہم اداروں اور شخصیات کے فون ٹیپ کرتے تھے۔ موبائل کمپنیوں کو موبائل سموں کے بارے میں سختی سے متعلقہ اداروں کی جانب سے پاکستان سے کاروبار بند کر کے واپس جانے کی دھمکی دی گئی تھی گزشتہ دور حکومت میں دو غیر ملکی سفارت خانے ٹیلی فون ٹیپ کرنے میں ملوث رہے۔ کابینہ اجلاسوں کی جاسوسی بھی کی جاتی تھی۔ ایک بار مانیٹرنگ اتنی سخت تھی کہ کابینہ کا اجلاس ہی مؤخر کرنا پڑا۔ رحمٰن ملک کا کہنا تھا کہ ان کے اپنے فون کے ساتھ ساتھ صدر آصف زرداری اور میاں نواز شریف کے فون بھی ٹیپ ہوتے رہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ سابق وزیر داخلہ کو اپنے اقتدار میں ان سفارت خانوں کے بارے میں معلومات تھیں تو ان ممالک کے ساتھ سفارتی سطح پر صدر ور وزیر اعظم نے بات کر کے یہ معاملہ کیوں نہیں اٹھایا۔ گزشتہ حکومت کے دور میں بیرون ممالک سے سفارتی سامان کی آڑ میں کون کون سے جاسوسی آلات لائے گئے اور کن کن مقامات پر نصب کیا گیا۔ ہمارے ملک کی ایجنسیوں کو بھی باخبر رہنے کی ضرورت ہے اور حکومت کو چاہئے کہ وہ ایسا نظام وضع کرے تاکہ ملکی مفادات اور معاملات میں غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کی یہ کھلی مداخلت رک سکے۔ امریکہ میں داخلے کے وقت ائرپورٹ پر پاکستانی اہم شخصیات حتیٰ کہ وزراء تک کی تلاشی لی جاتی ہے اور ہمارے ملک میں سفارتی سامان کی آڑ میں جاسوسی کے آلات درآمد کئے جاتے ہیں مگر ہم ان کو چیک ہی نہیں کر سکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے غیر ملکی سفارت خانوں کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھی جائے۔

ذیل میں بھارت ایجنسی ''را'' جو پاکستان میں

دہشت گردی میں ملوث ہے، اس کے کچھ حقائق رکھ رہے ہیں جو اخبارات میں بھی آ چکے ہیں۔

سانحہ گیاری میں بھارتی ہاتھ

تین سال کے بعد حقائق سامنے آئے کہ سانحہ گیاری میں بھارت کا خفیہ ہاتھ تھا۔ پاکستان کے مختلف علاقوں میں دہشت گردی کی وارداتوں کی طرح گیاری میں بھی بھارت ملوث تھا۔ اس کا انکشاف بھارت کے بابا اٹامک ریسرچ سینٹر کے ایک اہلکار نے کیا کہ بابا اٹامک اینڈ ریسرچ سینٹر کے زیر اہتمام ''آپریشن وائٹ واش'' نامی ایک ہتھیار کا تجربہ سیاچین میں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے گلیشیر نیچے تک پھٹ گیا اور ایک بہت بڑا تودہ سلائیڈ کر کے پاکستانی فوجی کیمپ پر گرا جس میں 135 فوجی جوانوں سمیت 139 افراد کی شہادت ہوئی تھی۔ بھارتی میڈیا کی رپورٹ کے مطابق 2012ء کے اوائل میں بھارت نے دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ سیاچین گلیشیر میں ایک منصوبہ بندی کے تحت اس خفیہ ہتھیار کا تجربہ ایسی جگہ پر کیا جہاں پاکستانی فوجی کیمپ اس کی زد میں آ سکتا تھا۔

سانحہ صفورہ کراچی

کراچی میں دہشت گردی کے افسوسناک واقعے میں 45 سے زائد لوگ مارے گئے۔ دہشت گردوں نے صفورہ چورنگی پر اسماعیلی کمیونٹی کی بس میں گھس کر اندھا دھند فائرنگ کر دی جس کے نتیجے میں خواتین اور بچوں سمیت 45 بے گناہ لوگ مارے گئے۔ اس میں سب مشین گن اور نائن ایم ایم پستول استعمال ہوئے۔ یہ کارروائی بھی ''را'' نے کی۔ اسماعیلیوں کو مارنے کا مقصد ایک تو کراچی میں کارروائی تھا جبکہ گلگت بلتستان میں اسماعیلی کمیونٹی کے کافی لوگ آباد ہیں۔ ان کو ناراض کر کے پاک چین اقتصادی شاہراہ کے معاملے میں مداخلت ضروری بھی تھی۔ آرمی چیف جنرل راحیل شریف اپنا غیر ملکی دورہ ملتوی کر کے کراچی آئے اور فوری طور پر اجلاس بلا کر ضروری اقدامات کی ہدایات دیں۔ پرنس کریم آغا خان سے فون پر رابطہ کیا اور تعزیت کی اس سانحہ میں ابتدا میں ہی را کے ملوث ہونے کے شواہد مل گئے جس پر تفتیشی اداروں نے دو افراد کو گرفتار کر لیا۔ ''را'' نے اس واردات میں کراچی کے اپنے انتہائی ماہر ٹارگٹ کلر کو استعمال کیا۔ ذرائع نے انکشاف کیا ہے کہ یہ دہشت گرد نائن زیرو پر چھاپے کے بعد زیر زمین چلے گئے تھے۔ انہوں نے اپنی سرگرمیاں روک دی تھیں جس کے سبب وہ گرفتاریوں سے بچ گئے تھے۔ صفورہ گوٹھ میں ''را'' نے پھر ان کو استعمال کر لیا۔

سانحہ مستونگ اور بلوچستان

بلوچستان کے ضلع مستونگ میں دہشت گردوں نے دو بسوں سے مسافروں کو اتارا جن کی تعداد ستر سے زائد تھی۔ ان کے شناختی کارڈ چیک کیے اور ان میں سے 25 افراد کو الگ کر کے باقیوں کو بس پر بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ ان پچیس افراد کو اندر پہاڑی علاقے میں لے گئے۔ ان میں سے 19 افراد کو قتل کر دیا۔ یہ بس پشین سے کوئٹہ کی طرف جا رہی تھی، ان کے ساتھ تیسری بس بھی تھی مگر ڈرائیور نے گاڑی نہیں روکی اور بھاگ کر جان بچائی۔ دہشت گردوں کی تعداد 25 تھی اور انہوں نے سکیورٹی فورسز کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ اس دوران لیویز فورس کو اطلاع مل گئی انہوں نے بروقت کارروائی کی لیویز کی فائرنگ کی وجہ سے دہشت گرد ایک زخمی سمیت چھ مغوی افراد کو چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ صوبائی وزیر سرفراز بگٹی نے پریس کانفرنس میں کہا کہ یہ حملہ بھارت ایجنسی ''را'' نے کیا ہے، اس میں صرف پشتون لوگوں کو الگ کر کے اغوا کرنے کا مطلب یہ تھا کہ بلوچی اور پشتون کی

لڑائی شروع کرائی جائے۔ انہوں نے کہا کہ اس میں "را" کے ملوث ہونے کے شواہد مل گئے ہیں۔ سانحہ تربت کے بعد حساس اداروں کی تحقیق کے مطابق ان سے کارروائیوں میں "را" پوری طرح ملوث ہے۔ جس میں دہشت گردوں سے بڑی تعداد میں کرنسی بھی برآمد ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھاری تعداد میں بھارتی کونسل خانے سے لایا گیا تھا۔ بلوچستان میں بدامنی پھیلانے میں بھارت امریکہ اور اسرائیل تینوں ملوث ہیں۔

بھارت ایک دہشت گرد ملک ہے اس نے اپنے پڑوسی ملک سری لنکا میں 25 سال تک تامل ٹائیگر کو عسکری تربیت دے کر دہشت گردی کرائی تھی اور سری لنکا بری طرح متاثر ہو گیا تھا۔ بالآخر سری لنکا نے پاکستان سے مدد مانگی۔ پاکستانی افواج کے تعاون سے سری لنکا میں تامل ٹائیگر کا صفایا ہوا تھا۔ بھارت کی دہشت گردی کی ایک اور مثال میانمار میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے تمام مظالم کے پیچھے بھی بھارت کا ہاتھ ہے۔ بھارت کو اپنی ان ظالمانہ کارروائیوں پر بڑا فخر ہے۔

بھارت کے موجودہ وزیراعظم مودی نے گجرات میں ٹرین کو آگ لگوا کر سینکڑوں مسلمانوں کو قتل کر دیا تھا۔

بدقسمتی سے پاکستان کے ہمسایہ ملک افغانستان نے بھارت کو کھل کھیلنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ افغانستان میں بڑھتے ہوئے دہشت گردی کے واقعات اور مستونگ کا حالیہ واقعہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ مستونگ میں اس واقعہ کے بعد فورسز نے کارروائی تیز کر دی ہے۔ اس کارروائی میں مستونگ سے دو افراد گرفتار ہو گئے ہیں۔ جو دہشت گرد اس واقعے میں شامل تھے انہیں تفتیشی مرکز منتقل کر دیا گیا ہے، کچھ دہشت گرد فرار ہونے کی کوشش میں مارے گئے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ "را" نے مقبوضہ کشمیر میں پاکستانی پرچم لہرانے کی عوامی تحریک کے جواب میں بلوچستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور بلوچی اور پختون فسادات شروع کرانے کی منصوبہ بندی کی تھی۔ مسافروں کے قتل اور اغوا کے بعد ایف سی نے دہشت گردوں کا تعاقب شروع کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ مستونگ کے پہاڑی علاقوں دیگر چھوٹے موٹے گروپوں کے ساتھ ساتھ بلوچ ریپبلکن آرمی (B.R.A) کے دہشت گرد کمانڈر عبدالنبی بنگلزئی کا کیمپ بھی موجود ہے۔ یہاں سے وہ دائیں بائیں کے علاقوں میں کارروائیاں کر رہے ہیں۔ اس کارروائی میں مستونگ کے پہاڑوں میں روپوش ہونے والے دہشت گردوں کے خلاف فورسز نے آپریشن شروع کر دیا ہے۔ فورسز نے ہیلی کاپٹروں کی امداد بھی حاصل کی جن کی مدد سے پورے علاقے کو گھیرے میں لے کر دہشت گردوں کے ٹھکانوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ فورسز کو ہدایت ملی ہے کہ دہشت گردوں کے خاتمے تک ان کے خلاف آپریشن جاری رہے گا۔ ان علاقوں میں اللہ نذر کی B.L.F اور لشکر بلوچستان کے خلاف کارروائی شروع ہوئی ہے۔ مستونگ میں جو کارروائی پشتونوں کے خلاف ہوئی وہ "را" نے B.R.A کے ذریعے کروائی ہے۔ B.R.A براہمداغ بگٹی کی تنظیم ہے جسے براہمداغ کی غیر موجودگی میں عبدالنبی بنگلزئی نام کا دہشت گرد کمانڈر کر رہا ہے۔ اس کا مرکز مستونگ کی پہاڑیوں میں ہے۔ اس علاقے میں اس سے قبل بی ایل اے کا ایک گروپ اسلم گروپ عرف اچھو اور ازبک گروپ بھی کام کرتے رہے ہیں لیکن "را" کی نئی تقسیم کے مطابق مستونگ کا علاقہ اب بی آر اے کے پاس ہے۔ بی آر اے کا سربراہ براہمداغ اس وقت لندن میں ہے۔ جب سے برطانیہ سے مجرموں کے تبادلے کا معاہدہ ہوا ہے اس وقت سے براہمداغ کا فون بند ہے۔ براہمداغ بھارت میں کئی دفعہ جا چکا ہے۔ وہ کافی عرصہ

افغانستان میں "را" کے مرکز اور بھارتی کونسل خانوں میں بھی جاتا رہا ہے۔ اس کا سارا ریکارڈ ملکی سلامتی کے اداروں میں موجود ہے۔ پاکستانی وزارت داخلہ نے برطانیہ سے بلوچ دہشت گردی میں ملوث لوگوں کی حوالگی کا مطالبہ کیا ہے لیکن عمران فاروق قتل کیس میں پاکستان سے حد درجہ تعاون کا طلبگار برطانیہ اپنے ملک میں بیٹھے علیحدگی پسند بلوچوں کے خلاف کارروائی سے فی الحال گریزاں ہے۔ پاکستانی وزارت داخلہ اسی حوالے سے عمران فاروق قتل کیس میں ملوث معظم علی کو برطانیہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ اس شرط پر کرے گی کہ برطانیہ بھی جبریار مری خان آف قلات اور براہمداغ کو پاکستان کے حوالے کرے۔

پاکستان کو مطمئن کرنے کے لئے برطانوی حکومت کہہ رہی ہے کہ ان تینوں افراد کی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اگر کسی بھی طرح پاکستان کے خلاف کسی دہشت گردوں کارروائی میں شامل ہوئے تو ان کو پاکستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مگر ان دہشت گردوں کی تنظیموں نے اپنی کارروائیاں کم کرنے کے بجائے تیز کر دی ہیں۔ بی ایل اے کا سربراہ براہمداغ مری اور اس کا معاون خیر بیار مری لندن میں لگژری لائف گزار رہا ہے۔ پاکستان نے کافی عرصہ پہلے سے ان تینوں افراد کے بارے میں برطانوی حکومت سے مطالبہ کر رکھا تھا کہ ان کو پاکستان کے حوالے کیا جائے مگر برطانوی حکومت پاکستان کو مشورہ دیتی تھی کہ بلوچستان کا مسئلہ سیاسی طریقے سے حل کریں۔ امریکہ بھی چونکہ بلوچستان میں دہشت گردوں کی مدد کر رہا ہے۔ برطانیہ کو مجرموں کو حوالے کرنے والے معاملے پر امریکہ سے بھی اجازت لینی ہوگی۔

بنگلہ دیش بنانے میں "را" کا کردار

بنگلہ دیش کے دورے پر بھارتی وزیراعظم نریندر مودی گئے۔ وہاں ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بنگلہ دیش کا قیام ہر بھارتی کی خواہش تھی۔ انہوں نے یہ بات اس تقریب میں کہی جس میں سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو بنگلہ دیش کے قیام میں فعال کردار ادا کرنے پر اور دونوں ممالک کے تعلقات مضبوط بنانے پر "بنگلہ دیش لبریشن وار آنر" کا ایوارڈ دیا گیا۔ نریندر مودی نے یہ ایوارڈ بنگلہ دیشی صدر عبدالحمید سے لیا۔ نریندر مودی نے اس موقع پر کہا کہ جب بنگلہ دیش کے لیے لڑائی لڑنے والے بنگلہ دیشی اپنا خون بہا رہے تھے 1971ء میں جب بنگلہ دیش کی حمایت میں بھارت کے اندر "ستیہ گرہ" تحریک چلی نوجوان رضا کار اس میں بھرتی ہونا شروع ہوئے تو میں بھی ذاتی طور پر اس تحریک میں شامل تھا اور بھارت سے عسکری تربیت حاصل کر کے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر جنگ میں شامل رہا ہوں۔ بنگلہ دیش نے پاکستان توڑنے اور غیر مستحکم کرنے کے اعتراف میں سابق بھارتی وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی کو فرینڈ آف بنگلہ دیش لبریشن وار ایوارڈ دیا جو موجودہ بھارتی وزیراعظم نریندر مودی نے ایک تقریب میں وصول کیا۔

اس سے قبل بھی 2012ء میں بنگلہ دیش کی جانب سے پاکستان کو دولخت کرنے کی سازش میں اندرا گاندھی کو فرینڈز آف بنگلہ دیش لبریشن وار ایوارڈ دیا گیا تھا جسے بھارتی کانگریس پارٹی کی رہنما سونیا گاندھی نے وصول کیا تھا۔ بنگلہ دیش کی وزیراعظم حسینہ واجد نے پاکستان توڑنے پر سابق بھارتی فوجی آفیسران کو بھی تاریخی اسناد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ نریندر مودی بار بار پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے بے سرو پا الزامات لگاتے ہیں جبکہ دوسری طرف بھارت اب بھی پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کے لئے "را" کو استعمال کر رہا ہے۔ پاکستان میں ہونے والی پچانوے فیصد وارداتوں میں بھارت ملوث ہوتا ہے۔ جس

نے پاکستان میں کچھ تنگِ وطن اور تنگِ دین لوگوں کو خرید رکھا ہے۔ یہی حال افغانستان کا ہے۔ جہاں سے بھارتی کیمپوں میں تربیت پانے والے وہشت گرد پاکستان میں آ کر تباہی پھیلا رہے ہیں۔

پاکستان میں ایک لابی جو سیاستدانوں میں بھی ہے اور میڈیا میں بھی ہر وقت بھارت کے گیت گاتی ہے اور وہ اہل وطن کی برین واشنگ کرنا چاہتے ہیں اور ان کو بھارت کا ہمنوا بنانا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ کشمیر میں بھارتی فوج کا کشمیری مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم مسلمان خواتین کی عصمت دری کے کھلے واقعات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ حسینہ واجد نے برملا ''را'' کی ایجنٹ ہونے کا اعتراف کیا۔ اس پر فخر کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ کس طرح ماضی میں ''را'' کے لئے کام کیا کرتی تھی اور ''را'' نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں کیا کردار ادا کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ بھارت کے ایجنڈے کو آگے بڑھائیں گی۔

حسینہ واجد نے اقرار کیا کہ حالیہ الیکشن میں ''را'' نے حسینہ واجد کی بھرپور مدد کی۔ حسینہ واجد کی ''را'' نے ویسے ہی مدد نہیں کی بلکہ اس کے بدلے میں بہت کچھ منوایا گیا۔

بعض پاکستان صحافی جنہوں نے 1971ء کے حوالے سے پاکستانی فوج کو بدنام کرنے کے لئے جھوٹی کہانیاں گھڑی تھیں وہی اب بھارت کے حق میں ''امن کی آشا'' کے گیت گا رہے ہیں۔ بھارتی وزیراعظم نے بنگلہ دیش کی تقریب میں خطاب کرتے ہوئے پاکستان کو بھی وارننگ دی کہ پاکستان بھارت کو سلامتی کونسل کا مستقل رکن بننے کی کوششوں میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ اس موقع پر بنگلہ دیشی وزیراعظم نے نریندر مودی کو وہ تصویر بھی پیش کی جس میں پاکستانی فوج کے کمانڈر امیر عبداللہ خان نیازی اور جگجیت سنگھ اروڑا کو دستخط کرتے

ہوئے دکھایا گیا تھا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی بنگلہ دیشی وزیر اعظم نے کھل کر ''را'' کا ایجنٹ ہونے کا اقرار کیا اور تسلیم کیا کہ بنگلہ دیش بھارت اور ''را'' کی کوششوں سے وجود میں آیا۔

اجیت کمار دوول

بھارت کی قومی سلامتی کا مشیر اجیت کمال دوول جسے ڈیول بھی کہا جاتا ہے، نریندر مودی کو پاکستان کے خلاف اور پاکستان کو توڑنے کے حوالے سے مشورے دیتا ہے۔ اجیت کمار عالمی دہشت گرد کی شناخت حاصل کر چکا ہے۔ اس کی دہشت گردی کا دائرہ کار پاکستان، چین، افغانستان اور ایران تک ہے۔ اس کا اعتراف امریکہ کے ڈیفنس سیکرٹری چک ہیگل نے بھی کیا۔ اس نے کہا کہ بھارتی اجیت کمار نے امریکہ کو بھی پاکستان کے خلاف اپنی گھناؤنی سازش میں استعمال کیا۔ افغانستان کو پاکستان کے خلاف کرنے میں اس شخص کا بڑا کردار ہے۔

جنوبی ایشیا میں دہشت گردی پھیلانے والا یہ سابقہ پولیس آفیسر سپائی ماسٹر اور جاسوس اجیت کمار ہی ہے۔ اس خطرناک دہشت گرد نے پاکستان کے خلاف داعش اور طالبان کا مشترکہ محاذ بنانے کی بڑی کوشش کی۔ اس شخص نے اپنی چالاکی سے بعض جگہ سی آئی اے کو بھی استعمال کیا۔ اجیت کمار نے تحریک طالبان پاکستان ٹی ٹی پی اور داعش کی قیادت کی ایک ملاقات قندھار کے بھارتی کونسل خانے میں کرائی اس کے بعد پاکستان میں طالبان لیڈروں نے شاہد اللہ شاہد کی کمان میں داعش میں شامل ہونے کا اعلان کیا تھا مگر ضرب عضب کی وجہ سے طالبان یہاں پر ٹک نہ سکے۔ اس طرح یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اس منصوبے کو ناکام بنانے میں آئی ایس آئی کا بھی بڑا کردار ہے۔ آج بھی داعش کی باقاعدہ شاخ بھارت میں موجود ہے جبکہ پاکستان میں اس کا قلع قمع کر دیا گیا۔

اجیت کمار نے 1990ء میں سرینگر میں غیر ملکی سیاحوں کا ڈرامہ رچایا تھا۔ حضرت بل میں جن لوگوں کو مجاہدین کے روپ میں داخل کر کے سکیورٹی ایجنسیوں نے ڈرامہ کیا تھا۔ وہ سارا پلان اجیت کمار کا تھا۔ اسی اجیت کمار نے تریھو پاٹی کی مدد سے پاکستان میڈیا میں ''امن کی آشا'' اور ''سیفا'' کے منصوبے بنائے جو ابھی بھی چل رہے ہیں۔ یہ اجیت کمار بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی کا سکیورٹی ایڈوائزر ہے۔

اب بھی بلوچستان میں تمام علیحدگی پسند تنظیموں کے لیڈروں سے اس کے بہت قریبی تعلقات ہیں۔ اس نے ستمبر میں بھارتی ایجنسیوں کے افسران سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ بھارتی سکیورٹی اداروں کو چاہیے کہ وہ پاکستان کے خلاف زور و شور سے سرگرم ہو جائیں۔ وہ پاکستان کے خلاف سرگرم قوتوں کو فنڈز اور اسلحہ مہیا کریں، انہیں عسکری تربیت مہیا کریں۔ پاکستانی قوم میں فرقہ وارانہ اور نسلی اختلافات کو ہوا دیں تاکہ پاکستان میں ابتری پیدا ہو اور نفسانفسی پھیل جائے۔ ہر پاکستانی دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھے۔ بھارت اس وقت کامیاب ہوگا جب پاکستان تباہ ہو جائے، چین خاموش ہو جائے اور سکھ قوم مٹ جائے تب بھارت دنیا میں عالمی قوت بن کر ابھرے گا۔

آئیے، آزادی کے جشن منانے کی بجائے اس بات کا عہد کریں کہ ہم نے دشمن کی ان سب تدابیر کو ناکام بنانا ہے۔ آپس میں محبت اور یگانگت پیدا کرنی ہے، فوج کے ساتھ بھرپور تعاون کرنا ہے، وطن دشمن قوتوں پر نظر رکھنی ہے اور بھارتی ایجنٹوں کو پہچان کر ان کو رسوا کر کے پاکستان بچانا ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا، ان شاء اللہ ہمیشہ قائم و دائم رہے گا!

اس خاندان اور قوم کا خدا ہی حافظ ہے جس کے احساسات مرنے لگیں اور احساسِ زیاں ہی جاتا رہے۔ یہی ہماری اس قوم کا المیہ رہا ہے کہ اس نے اپنی اعلیٰ اقدار کھو ڈالی ہیں اور اس کی رہنمائی استحصالی طبقے کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، جس نے قوم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔

ماہِ اگست کے لیے ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی خصوصی تحریر قارئین ''حکایت'' کی نذر

بھٹکے ہوئے راہی

خصوصی تحریر

پہلا باب ... تعارف

برصغیر کی تقسیم سے قبل مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں مسلمانوں کے چار قبائل آباد تھے۔ جو مال و دولت، جاہ و حشمت اور اپنی اپنی برادری کی تعداد کے پیش نظر ایک دوسرے کے مساوی تھے۔ اول، پٹھان جو تعداد کے لحاظ سے تو غالباً دوسروں سے کم تھے مگر اپنی شان و شوکت اور روایتی دلیری میں اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہی سمجھتے تھے۔ دوسرا قبیلہ راجپوتوں کا تھا، جن کی گوت گھوڑے واہ، اس امر کی نشاندہی کرتی تھی کہ ان کے بزرگ شمشیر زنی اور گھڑ سواری کے دھنی تھے۔ تیسرا قبیلہ گجروں کا تھا۔ یہ نہ تو تعداد میں کم تھے اور نہ ہی زمین اور مال مویشی کی ملکیت کے لحاظ سے اپنے آپ کو کسی سے کمتر گردانتے تھے۔ جہاں تک خاندانی وجاہت کا تعلق تھا تو وہ اپنا شجرۂ نسب سلاطین گجرات اور قنوج کے راجاؤں گرجاروں سے جوڑتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس قبیلے کی جزرسی اور محنت کی عادت نے مردانہ وقار اور زنانہ حُسن کے ساتھ مل کر انہیں دوسروں کے مقابلے میں کئی لحاظ سے ممتاز بنا دیا تھا۔ چوتھا قبیلہ ارائیوں کا تھا، جو اچھے اور محنتی کاشتکار ہونے کے باعث دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھے۔ ان میں ایک خوبی اور بھی تھی کہ وہ کبھی کسی سے جھگڑا فساد نہیں کرتے تھے بلکہ خاموشی، سنجیدگی اور دانائی سے اپنی بہتری کی تگ و دو میں مصروف رہتے اور دوسروں کی چھوٹی موٹی زیادتیوں کو بھی نظر انداز کر دیتے، کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی ہوتا۔ آخر میں جیت بھی انہیں کی ہوتی۔

ملک کی تقسیم کا عمل شروع ہوا تو قبائلی شناختیں اور مصلحتیں پس منظر میں چلی گئیں۔ اب تو سوال صرف ہندو مسلمان کا تھا۔ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، گھر لٹ رہے تھے، گاؤں کے گاؤں جلائے جا رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ جالندھر ڈویژن کو پاکستان میں شامل کیا جائے گا مگر جب سرحدی کمیشن کے فیصلے کا اعلان ہوا تو سرحد کی لکیر امرتسر اور لاہور کے درمیان میں کھینچ دی گئی۔ سب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اب سوائے اس کے کوئی چارہ باقی نہ تھا کہ گھر بار چھوڑ کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچا جائے۔ یوں یہاں بھی ہجرت کا عمل جاری ہوا۔

ہوشیار پور کے گاؤں ٹانڈہ سے ہجرت کرنے والوں میں گجروں کا ایک کنبہ بھی شامل تھا جو تیس سالہ میجر یعقوب علی خان، ستائیس سالہ بیگم زبیدہ یعقوب، تین سالہ بچی ماریہ یعقوب اور ایک سالہ شیر خوار مطلوب علی یعقوب پر مشتمل تھا۔ تقسیم برصغیر کے چرچے ہوئے تو میجر یعقوب علی اپنی پلٹن کے ہمراہ منگلا پور میں مقیم تھا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے یہ طے کر رکھا تھا کہ مسلمان فوجیوں کو اس انداز میں مقیم رکھا جائے کہ پاکستان وجود پاتے وقت کمزور اور نہتا رہے۔ میجر یعقوب علی نے دوراندیشی سے کام لیا اور وسط جون میں دو ماہ رخصت کی درخواست دے دی جو تگ و دو کے بعد یکم جولائی 1947ء سے منظور ہو گئی۔ اس طرح وہ جولائی کے پہلے ہفتے میں اپنے گاؤں ٹانڈہ پہنچ گیا۔ اس نازک دور میں اس کی گاؤں میں موجودگی اپنے خاندان، دیگر احباب بلکہ گاؤں کی تمام آبادی کے لئے حوصلہ افزائی کا باعث بنی۔ ہر کوئی یہ خیال کرتا تھا کہ میجر یعقوب علی اپنے اثر و رسوخ کی بناء پر ستم رسیدہ مسلمانوں کی جانیں بچالے گا۔ پھر ہوا بھی اسی طرح۔ اتفاق سے ہوشیار پور چھاؤنی میں مقیم ڈوگرا رجمنٹ کا کرنل آئی، ایف سکاٹ اس کا پرانا رفیق کار نکل آیا۔ دونوں 1943ء کے دور میں چنا گانگ چھاؤنی کے ایک ہی ڈویژن ہیڈ کوارٹر میں سٹاف ڈیوٹی پر متعین رہے تھے۔ اسی طرح ٹانڈہ کے مسلمانوں کے لئے جو الوداعی کیمپ لگا، اس کا انچارج میجر شدگارہ سنگھ

اہلوو الیا، جس کا تعلق پانچویں سکھ بٹالین سے تھا، میجر یعقوب علی کی ڈیرہ دون میں ٹریننگ کا دیرینہ ساتھی نکل آیا۔ اس وقت کی فضا کے پیش نظر کسی سکھ افسر پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا تھا مگر اس کے علاوہ چارہ کار بھی کیا ہو سکتا تھا؟ ادھر میجر اہلوو الیا نے بھی کوئی ایسی حرکت نہ کی جس کے باعث وسوسے اور شکوک جنم پاتے۔

دورانِ سفر معاملات البتہ مختلف رہے۔ اس قافلے سے بھی موت نے اپنا خراج وصول کیا۔ بھوک، بیماری، قدرتی آفات، ہر قسم کی بندوقیں اور سکھوں کی کرپانیں، سبھی اپنا حصہ پاتی رہیں، پھر بھی یہ قافلہ دوسروں کی نسبت خوش نصیب رہا۔ جانی نقصان خاصا کم ہوا۔ گو نقدی اور زیور، جو پاس موجود تھا، راستے میں چھن گیا مگر جوان بچیوں کی حفاظت کامرانی سے ہمکنار ہوئی۔ لاہور پہنچ جانے پر اس قافلے کو والٹن کے مہاجر کیمپ میں جگہ دی گئی۔

اس قیامت خیز دور میں لاہور کی مقامی آبادی نے انصار مدینہ کی روایت تازہ کر دی تھی۔ جتنا کسی سے بن پڑا اس نے کمی نہ کی۔ مہاجرین نے ان خدمات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بھائی چارے کی یہ عظیم مثال تاریخ میں تابناک دکھائی دیتی ہے۔

میجر یعقوب علی کے خاندان کو ایسی مراعات کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے دو بھائی پہلے ہی لاہور میں مقیم تھے۔

بڑا بھائی چوہدری محبوب علی خان محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھا اور ان دنوں کارِ خاص سے وابستہ تھا۔ یہ افسر اپنی کارکردگی اور حسن اخلاق کی وجہ سے مشہور تھا اور وسیع حلقے میں جانا جاتا تھا۔ بعد از اں اعلیٰ عہدوں تک پہنچا۔

چھوٹا بھائی چوہدری مرغوب علی خان اسلامیہ کالج میں ایم اے انگریزی کا طالب علم تھا۔ اس نے بی اے ـ بعد تعلیم کے دو سال مکمل کر لئے تھے اور اب مہاجر کیمپوں میں رضا کارانہ خدمات انجام دے رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی والٹن کیمپ میں لگی ہوئی تھی مگر اسے اتفاق کہئے کہ جس دم ہوشیار پور کا قافلہ والٹن پہنچا، وہ اپنے فرائض مکمل کر کے گھر جا چکا تھا۔

انسپکٹر محبوب علی اپنے خاندان کے بارے میں پریشان رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے مختلف قافلوں کا پتہ لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ کہیں سے معمولی خبر کی بھی آس ہوتی تو وہ اسے حاصل کر کے رہتا۔ بھائی، مرغوب علی سے بھی کیمپوں اور قافلوں کی روئیداد جاننے کی کوشش کرتا مگر کسی مایوسی کو گناہ خیال کیا کرتا تھا۔

اس روز بھی وہ اپنے بھائی سے کیمپ کی روئیداد سن رہا تھا کہ اس کا اردلی دوڑا دوڑا آیا اور اطلاع دی کہ دفتر میں والٹن مہاجر کیمپ کے افسران کا فون آیا ہے۔ اطلاع یہ ہے کہ ”میجر یعقوب علی بچوں سمیت بحفاظت لاہور پہنچ گئے ہیں اور آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ خود وہاں جا کر انہیں لے آئیں یا کسی مناسب سواری کا بندوبست کر دیں، جو انہیں آپ تک پہنچا دے“۔

انسپکٹر محبوب علی کے پاس پولیس کی گاڑی موجود تھی۔ کئی مرتبہ رات کے وقت اسے مہاجرین کے کیمپوں میں جانا پڑتا تھا مگر میجر یعقوب علی کو گھر لانا اس کی سرکاری ڈیوٹی کا حصہ نہیں تھا۔ لہٰذا وہ سڑک پر نکل گیا اور تین تانگے اکٹھے کر لئے، پھر انہیں کچھ پیشگی رقم بھی ادا کر دی۔ مہاجرین اور پولیس کے لئے کام کرنا بڑے تانگے والے اپنا اعزاز سمجھتے تھے۔ مرغوب علی کو تانگوں کے ہمراہ روانہ کر دیا گیا۔

مہمانوں کی آمد کا سننا تھا کہ تمام گھر خوشی سے چہک اٹھا۔ کئی روز سے بے یقینی اور بے اطمینانی کی جو کیفیت طاری تھی، وہ ختم ہوئی۔ یہ خاندانی اتحاد اور یگانگت کی روشن مثال تھا۔

مرغوب علی ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ والدین

اس کی خوشیوں کی تمنا دلوں میں لئے دنیا چھوڑ چکے تھے۔ محبوب علی ہی بڑے بھائی ہونے کے ناطے خاندان کا سربراہ تھا اور اس طور روایتی عزت کا حقدار بھی۔ اس نے ملازمت کے دوران جالندھر کے ایک متمول ارائیں خاندان میں اپنی پسند مگر والدین کی رضامندی سے شادی کر لی تھی۔ ذات پات کے حوالے سے اس کی دلہن دوسرے خاندان سے آئی تھی۔ اب وہ چار بچوں کا والد تھا۔ لڑکے دونوں بڑے تھے جبکہ لڑکیاں چھوٹی۔ دونوں لڑکے عمران اور سلطان ہائی سکول میں پڑھتے تھے جبکہ لڑکیاں عفت اور عصمت پرائمری سکول میں۔ معاشرے میں پردے کا رواج تھا۔ یہ برداشت نہیں کیا جاتا تھا کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک ہی تانگے پر اپنے اپنے مدارس جائیں۔ تمام کزن البتہ ایسی عمروں میں تھے کہ بزرگوں کے سامنے بے دھڑک ایک دوسرے سے مل سکیں۔

مہمانوں کی آمد پر گھر میں مچنے والی ہلچل غیر معمولی تھی۔ محبوب علی تو اپنے بھائی اور بھاوج کا شیدائی تھا ہی، اس کی بیگم سکینہ بھی اپنے دیور اور چھوٹی بھاوج سے کم محبت نہ کرتی تھی۔ جب تک مرغوب علی مہمانوں کو والٹن کیمپ سے لے کر گھر پہنچا، گھر میں بچوں کے جوش نے ایک ہنگامے کی صورت پیدا کر دی تھی۔ دونوں لڑکیاں اپنی اپنی گڑیا میں نکال کر بیٹھ گئیں اور ان میں سے گڑیاں چن کر علیحدہ کرنے لگیں جو انہیں اپنی چچازاد ماریہ کو پیش کرنا تھیں۔ لڑکوں کا مسئلہ البتہ دوسرا تھا۔ ایک سال مطلوب کے لئے کون سے کھلونے مہیا کئے جاتے؟ ان کے اپنے کھیلوں کا سامان مطلوب کے لئے بے معنی تھا۔ آپس میں بحث و مباحثے اور مشورے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ایک بھائی جس کھلونے کا نام لیتا، دوسرا اسے یہ کہہ کر رد کر دیتا کہ یہ بڑی عمر کے بچوں کے لئے ہے۔ دوسرے کی تجویز کو پہلا یہ کہہ کر نامنظور کر دیتا کہ کھلونے کا مقصد دل بہلاوے کے علاوہ تربیت بھی ہوا کرتی ہے۔

یہی اس نے اپنے ماسٹر صاحب سے سنا تھا۔ جھنجھنے اور ربڑ کے خرگوش سے مطلوب کی بھلا کیا تربیت ہوگی؟ بالآخر انہوں نے یہ فیصلہ اپنی امی کی رہنمائی پر چھوڑ دیا، مگر امی تھی کہ باورچی خانے میں اس طرح جتی ہوئی تھی کہ گویا کھانوں کا ڈھیر لگا دے گی۔ نوکر اور زردلی انسپکٹر محبوب علی کے ساتھ کمرہ درست کر رہے تھے اور نوکرانی دوڑ بھاگ اور کام کاج کے ساتھ بیگم صاحب کی جھڑکیوں اور گھرکیوں میں اس طرح دبی ہوئی تھی کہ بے چاری خود ایک کھلونا بنی نظر آتی تھی۔ ان حالات میں عمران اور سلطان کا مشوروں میں کون شریک ہوتا؟ الغرض گھر کا ہر شخص اپنے اپنے کام میں اس طرح منہمک تھا کہ چاند رات کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔

بالآخر مہمان گھر پہنچ گئے۔ خوشی کے اظہار کے ساتھ ساتھ غم کا مظاہرہ بھی ہوا۔ دونوں بھائی گلے ملے تو چیخیں نکل گئیں۔ دیورانی جیٹھانی کا بھی یہی حال تھا۔ ایک دوسری سے لپٹ لپٹ کر رو رہی تھیں۔ جذبات کا طوفان امڈ رہا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ خوشی اور مسرت کے حدود کہاں ختم ہو رہی ہیں اور غم کا سیلاب کہاں سے شروع ہو رہا ہے؟

بارے طوفان تھما اور قدرے سکون ہوا تو میجر مرغوب علی سے راستے کی تکالیف، برادری، رشتہ داروں، دوست احباب اور واقف کاروں کے حالات اور کوائف کے متعلق پوچھا گیا۔ ان حالات پر بھی بات ہوئی جو راستے اور کیمپوں میں پیش آئے تھے۔ یہ گفتگو چائے کے دور پر شروع ہوئی وہاں سے کھانے کی میز پر منتقل ہوئی اور پھر ڈرائنگ روم میں آدھی رات تک جاری رہی۔

جب نصف رات کا گجر بجا تو سب چونک اٹھے، کہا کہ آج اتنا بہت ہے، ہر کوئی آرام کرے، یہ باتیں تو شاید اب باقی عمر میں ختم نہ ہو سکیں۔

دوسرا باب...... خاندانی اقتدار میں رخنہ

مرغوب علی ایم اے انگریزی کے امتحان کی تیاری کررہا تھا کہ مشرقی پنجاب میں مسلم کش فسادات شروع ہوگئے۔ پھر مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے لاہور پہنچنا شروع ہوگئے۔ یہ قافلے دکھی لوگوں کا مجموعہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے ہمراہ مریض بھی ہوتے اور زخمی بھی۔ کئی اعزاہ واقرباء کی روح فرسا اموات پر نڈھال نظر آتے۔ ان کے ذہنوں میں توقعات بڑی ہوتیں اور اس کی چند کرنیں بھی۔ نومولود ریاست کے لئے ان کی حتی الوسع دیکھ بھال انتہائی لازم تھی۔ نوجوان طالب علموں نے ان کی چارہ جوئی کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا تھا۔ مہاجرین کے کھانے پینے اور علاج معالجے کے مراحل ہر روز کوہ پیمائی کے مترادف ہو کرتے تھے۔ سہولیات کی تقسیم بسا اوقات بڑا مسئلہ نظر آتی تھی۔ جن لوگوں کو شمالی اور مغربی اضلاع کی طرف روانہ کیا جاتا، ان کے لئے ٹرانسپورٹ کی بہم رسانی دردسر بن جایا کرتی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے دور میں مقامی نوجوانوں نے اخوت اور درد بٹانے کی لازوال داستانیں رقم کی تھیں۔ مرغوب علی بھی کسی طور دوسروں سے کم نہیں رہا تھا۔

ان دنوں تعلیم اور امتحانات کا ہوش بھلا کسے تھا؟ کارِ ہجرت کا مرحلہ جو جون کے پہلے ہفتے میں شروع ہوا۔ بڑھتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ اکتوبر آ گیا مگر مہاجرین کے قافلوں کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ حکومت نے رضا کار طالب علموں کو یہ رعایت دی کہ جو طلباء وطالبات ایم کا سلیبس ختم کر چکے تھے اور مہاجرین کی دیکھ بھال کے لئے مہاجرین کیمپوں میں خدمات بجا لا رہے تھے، انہیں اعزازی سندات بغیر امتحانات کے جاری کردیں۔ اسی ضمن میں مرغوب علی کو بھی اعزازی سند مل گئی۔

اگر امتحان ہو بھی جاتے تب بھی مرغوب علی ضرور پاس ہو جاتا اور اچھے نمبر حاصل کرتا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جونہی ملک میں سکون رونما ہوا، وہ مقابلے کا امتحان ضرور دے گا۔ اس بیچ وقت گزارنے کے لئے اس نے صحافت کا پیشہ منتخب کیا تھا۔ روزانہ چھ سے آٹھ گھنٹے مہاجر کیمپ میں کام کرتا، پھر وہیں سے سائیکل پر سیدھا ایک روزنامے کے دفتر چلا جاتا اور نصف اللیل تک اخبار کی ترتیب وتزئین میں مدیر کا ہاتھ بٹاتا۔ آدمی ذہین تھا، اس لئے ادارے کے کرتا دھرتا اس کے کام اور متعلقہ فن سے بے حد خوش تھے۔ اخبار کی وساطت ہی سے ریڈیو والوں سے اس کی شناسائی ہوئی تھی۔ اسے ریڈیو پروگرام بھی ملنے لگے۔ کبھی کوئی کہانی لکھتا، کبھی تبصرہ، کبھی کسی ڈرامے میں اداکاری کے جوہر دکھاتا اور کبھی کوئی ادبی پروگرام کرلیتا۔ یہ سارے کام ویسے ہی تھے جیسے اس کی صحافتی ذمہ داریاں۔ حقیقت یہ ہے کہ محنت، ذوق وشوق اور ذہانت کے بل بوتے پر اس نے اخبار اور ریڈیو، دونوں جگہ اپنا مقام بنا لیا تھا۔ یوں اسے شہرت بھی ملی اور ذوق کی تسکین بھی ہوئی۔

ریڈیو میں ان دنوں ایک عیسائی لڑکی مس زیبا زلیا رام کے بڑے چرچے تھے۔ اس نے مشن کے خرچ پر ایف سی کالج لاہور کی معرفت انگریزی میں ایم اے مکمل کیا تھا۔ باپ ایک مشن ہسپتال میں کمپاؤنڈر تھا۔ لاہور کے لوگ اب بھی خوش اخلاق زلیا رام کمپاؤنڈر کو نہ بھولے ہوں گے، جو مریضوں سے ایسا اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ لوگ ڈاکٹروں کی بجائے اس کی طرف رجوع کرنا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ مسٹر زلیا رام کے خاندانی پس منظر سے کوئی واقف نہ تھا۔ کچھ لوگ یہ کہتے تھے کہ 1882ء کے قریب میو ہسپتال کی ایک ہندو جمعدارنی کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا۔ اس کا والد اس کی پیدائش سے پہلے ہی مرگیا تھا، یا لاہور چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ خاتون بے چاری محنت مزدوری سے اپنا پیٹ پالتی تھی، بچے کو کیسے سنبھالتی؟ اس

نے یہ بچہ یونگ صاحب کے حوالے کر دیا، جن کے نام پر مال روڈ پر یونگ ہال ابھی تک موجود ہے۔ پادری یونگ نے بڑی دلچسپی سے بچے کو پالا، پڑھایا اور کمپاؤنڈری کی تربیت دلائی۔ یہ پادری صاحب ہی کی تربیت کا اثر تھا کہ زلیا رام میں انسانی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

زلیا رام کی صاحبزادی مس ثریا، جب کالج سے ایم اے انگریزی کر کے نکلی تو اس کی ذہانت، چال ڈھال اور ادبی ذوق وشوق کی دھوم ہر طرف مچ گئی۔ کسی نے اُسے دیکھ کر شرارتاً یہ شعر کہہ دیا جو پہلے تو کالج کے لڑکوں کی زبان پر چڑھا اور پھر علاقے کے طول وعرض میں پھیل گیا۔

اگر میں ممتحن ہوتا تو نمبر سو کے سو دیتا
لیاقت کے الگ دیتا ذہانت کے الگ دیتا

بعد میں لوگوں نے دوسرے مصرعے میں ذہانت کی بجائے ''نزاکت'' لگا کر شعر میں ترمیم کر لی اور اس طرح اسے جا بجا استعمال کرنے لگے لیکن جہاں تک مس ثریا زلیا رام کا تعلق تھا، نہ تو اُس میں نزاکت کا عنصر تھا اور نہ ہی زنانہ حُسن کی فراوانی تھی۔ بس واجبی سی شکل وصورت تھی، جسے تعلیم اور لباس نے گوارا بنا دیا تھا، مگر چال ڈھال میں ایک خاص انداز ضرور تھا۔ اٹھتے ہوئے شباب، سادگی اور پُرکاری نے مل کر اُس میں ایک مخصوص انفرادیت پیدا کر دی تھی، جسے دیکھ کر اکثر لوگ جوش مرحوم کا یہ شعر پڑھ دیتے۔

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کوئی ہو عالم جوانی، مسکرائے گی ضرور

کچھ دنوں سے مرغوب علی اور ثریا کو باہم دیکھا جا رہا تھا۔ ثریا اب وقت نکال کر مہاجرین کے والٹن کیمپ میں بھی جانے لگی تھی۔ کبھی کبھی مرغوب علی کے ساتھ اُس کے اخبار کے دفتر میں بھی جا بیٹھتی۔ کبھی ریڈیو ڈراموں میں اُس کی نسوانی آواز مرغوب علی کے ساتھ سنائی دینے لگی۔ سچ ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ مرغوب علی ثریا کی طرف پہلے تھوڑا تھوڑا راغب ہوا، پھر مائل ہوا اور بالآخر بات یہاں تک جا پہنچی کہ

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تُو نے اُسے کس آن میں دیکھا

مرغوب علی کوئی سادہ دل نوجوان نہیں تھا کہ ثریا کی چال میں آ گیا۔ اس نے سمجھ کر فیصلہ کیا ہوگا۔ اگرچہ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ تقسیم کے عمل اور خاندانوں کے مختلف جگہوں پر بٹ جانے کے باعث جو عمومی خلا واقع ہوا، اس نے قوم کی مجموعی نفسیات پر یہ اثر ڈالا تھا کہ لوگ جذباتی خلا کو پورا کرنے کے لئے مصنوعی سہارے تلاش کرنے لگے تھے، مگر مرغوب علی ثریا کی محبت میں اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ وہ مصنوعی سہارے کی بجائے مستقل تعلقات اور حقیقی روابط کی واضح شکل وصورت دیکھ رہا تھا۔ اب صرف دو خاندانوں کے سربراہوں کی رضامندی سے چاہنے والوں کا رشتہ ازدواج میں بندھ جانا ہی باقی رہ گیا تھا۔

ثریا نے جب اپنے والد زلیا رام سے اپنے جذبات اور پروگرام کا اظہار کیا، تو بوڑھا کمپاؤنڈر دھک سے رہ گیا۔ وہ مقامی عیسائی معاشرے میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مشن والے بھی اسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ وہ تو یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ اُس کی اکلوتی لڑکی ایک مسلمان سے شادی کر لے، جس کے نتیجے میں ممکن ہے، کہ اُسے اپنے باپ کا مذہب بھی چھوڑنا پڑ جائے۔ اس کی نظر میں اس مسئلے کا صرف یہی حل تھا کہ مرغوب علی عیسائی ہو جائے یا ثریا اُس لڑکے کا خیال چھوڑ دے اور کسی عیسائی لڑکے سے شادی کر لے۔

اُدھر مرغوب علی کو اپنے بڑے بھائیوں سے اپنے جذبات کے اظہار کی جرأت نہ ہو رہی تھی۔ اس کی تربیت ایسے ماحول میں ہوئی تھی، جہاں بڑوں کے سامنے

چھوٹے اس قسم کی بات حل کر نہ کر سکتے تھے۔ اُسے صرف روشنی کی ایک ہی کرن نظر آتی تھی۔ اُس کے بڑے بھائی محبوب علی نے اپنی پسند کی شادی کی تھی اور والدین نے اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تھی۔ چنانچہ ایک دن وہ موقعہ نکال کر سکینہ بھابی کے پاس جا بیٹھا اور اظہار مدعا کے لئے مناسب تمہید سوچنے لگا۔

بڑی بھابی ماں کی جگہ تھی، بیگانی برادری سے تعلق رکھنے کے باوجود اُس نے خاندان میں اپنا وقار مقام بنالیا تھا۔ وہ محبت اور شفقت کی پتلی تھی۔ مرغوب اگرچہ اس کا چھوٹا دیور تھا مگر سکینہ محبوب اسے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح چاہتی تھی۔

اس نے جب دیکھا کہ مرغوب علی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر اُسے جرأت نہیں ہو رہی، تو اُس نے خود بات کا آغاز کرتے ہوئے اُس سے پوچھ لیا کہ وہ متذبذب کیوں ہے؟ مرغوب علی نے بھابی کے رویے اور گفتگو کے انداز سے حوصلہ پایا اور اپنے دل کی بات بیان کر دی، ساتھ ہی بھابی سے مدد کی خواہش کی۔

بھابی، بیگم سکینہ محبوب کو جب صورتِ حال کا علم ہوا تو وہ بہت متفکر ہوئی۔ اس نے مرغوب علی کو پیار سے سمجھایا کہ "تمہیں اپنی خاندانی روایات کا علم ہونا چاہئے۔ میرے خاندان والوں اور تمہارے ماں باپ نے میری اور انسپکٹر محبوب علی کی شادی کی اجازت اس لئے دے دی تھی کہ وہ گجر تھے تو ہم ارائیں۔ دونوں ہی زمیندار خاندانوں کے افراد تھے، مگر اس پر بھی دونوں طرف سے بہت لے دے ہوئی تھی لیکن جو بات تم کہہ رہے ہو، اس میں صرف قوم ہی نہیں بلکہ مذہب کا مسئلہ بھی در پیش ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ لڑکی کے دور یا نزدیک کے رشتہ دار کسی ایسے پیشے سے منسلک ہوں، جنہیں معاشرہ احترام کی نظر سے نہ دیکھتا ہو۔ بہر حال یہ باتیں تو بہت بعد کی ہیں۔ فی الحال تو لڑکی کے اسلام قبول کرنے کا مسئلہ ہے۔

تم اس بارے میں اُس سے پوچھ لو اگر وہ مان گئی تو میں تمہارے بڑے بھائی سے بات کروں گی لیکن ایک بات یاد رکھو کہ اگر تم نے سول میرج کر لی تو خاندان اور قبیلے کے لوگ تمہیں ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے"۔

دوسرے دن مرغوب علی ثریا سے ملا تو اُس نے اپنے اور بھابی کے درمیان ہونے والی بات چیت ثریا کو بتائی اور اسے کہا کہ "اگر وہ عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کر لے، تو شاید وہ دونوں زندگی کے سفر میں ساتھی بن سکیں، ورنہ خاندانی رکاوٹیں انہیں کبھی متحد نہ ہونے دیں گی"۔ ثریا گھر سے نیت کر کے آئی تھی کہ وہ مرغوب علی کو عیسائی ہونے کے لئے کہے گی۔ اس طرح شادی میں کوئی رکاوٹ وارد نہ ہو گی اور باپ بھی راضی رہے گا۔ مرغوب علی کے معاملات میں کچھ اور بھی پیچیدگیاں تھیں۔

اگر وہ اپنے خاندان سے بغاوت کرتا تو وہ اس بے شمار جائداد سے بھی محروم ہو جاتا، جس کے کلیم اب داخل ہونے والے تھے اور مشرقی پنجاب میں چھوڑے ہوئے اثاثوں اور زمین و مکانات کے بدلے میں اُسے ملنے والی تھی۔ مس ثریا ژلیا رام اگرچہ ایک مذہبی عیسائی گھرانے میں پیدا ہوئی تھی لیکن مذہب پر اُس کا اپنا ایمان بڑا کمزور تھا۔ اُسے صرف یہی دھن تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا معاشی اور معاشرتی مقام بلند ہو جائے۔ جس محبت اور یگانگت کا اظہار وہ مرغوب علی سے کر رہی تھی، اُس کی تہہ میں بھی یہ تمام مقاصد پوشیدہ تھے۔ مرغوب علی کے ساتھ اُسے معاشرتی مقام اور معاشی خوش حالی بھی حاصل ہونے کی توقع تھی، اس نے والد کو یہ باور کرا دیا۔ مسٹر رلیا رام کمپاؤنڈر کے پاس سوائے نیک نامی کے اور کچھ نہیں تھا۔ لہٰذا اُس نے جلد ہار مان لی۔ اس طرح ثریا اسلام قبول کرنے پر تیار ہو گئی۔

صبح مرغوب علی سکینہ بھابی کو ناشتے کی میز پر ملا تو بہت خوش نظر آ رہا تھا کیونکہ اس کے خیال میں ثریہ نے

اسلام قبول کر کے کوئی بڑی قربانی دی تھی۔ اُس نے ساری گفتگو بھابی کو سنائی اور اُس کا ردعمل جاننے کی کوشش کی۔

ابھی سکینہ بھابی نے مرغوب علی کو کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سارا خاندان یعنی چوہدری محبوب علی، میجر یعقوب علی، بیگم زبیدہ یعقوب اور محبوب علی کے چاروں بچے ناشتے کی میز پر پہنچ گئے۔ بچے چونکہ چھوٹے تھے، اس لئے ابھی سو کر نہیں اٹھے تھے۔ اس خاندان میں ناشتے کا اہتمام روایتی انداز میں کیا جاتا تھا، جس میں اکثر خاندان کے تمام افراد شرکت کیا کرتے تھے۔

انسپکٹر چوہدری محبوب علی نے اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کو کسی معاملے میں سنجیدہ پایا، تو ہنس کر پوچھا۔ ''آج دیور بھابی کس مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرغوب کے مستقبل کے بارے میں پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔ کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے کہ آیا مرغوب کو کہیں سے مستقل ملازمت کی پیشکش ہوئی ہے؟ یا پھر کسی خاندان سے رشتے کا پیغام آیا ہے؟ آخر دیور بھابی دونوں اتنے سنجیدہ کیوں ہیں؟''

سکینہ نے ہنس کر جواب صادر کیا کہ ''آپ کی تفتیش کرنے کی عادت اتنی پکی ہوگئی ہے کہ آپ گھر کے معاملات میں بھی سوالات کی مسلسل بوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ بہرحال بات اہم ہی ہے۔ سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو لیں تو اطمینان سے اس پر غور کریں گے''۔ میجر یعقوب علی اور اُس کی بیگم نے تقریباً بیک آواز ہو کر کہا کہ ''اگر کوئی اہم بات ہے تو پھر انتظار کیسا؟ معاملہ کہہ دیں۔ ناشتہ ہوتا رہے گا اور گفتگو بھی ساتھ چلتی رہے گی''۔

سکینہ محبوب نے مسکراہٹ کا سہارا لے کر ماحول کی سنجیدگی کم کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ ''آپ کے چھوٹے بھائی نے اپنے لئے دلہن کا انتخاب کر لیا ہے اور اب یہ آپ لوگوں کی رضامندی کا منتظر ہے''۔

میجر یعقوب علی نے فوراً اعتراض کیا، کہا کہ ''یہ کیا بات ہوئی؟ انتخاب خود کر لیا ہے اور اب ہماری رضا بھی پوچھی جا رہی ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ مرغوب علی ہمیں اپنی پسند کی خبر سنانا چاہتا ہے اور ہم سے توقع رکھتا ہے کہ تمام لوگ بغیر دیکھے بھالے اس کی ہاں میں ہاں ملا دیں گے؟''

انسپکٹر محبوب علی، جو بات چھیڑ کر خود خاموشی سے ناشتے میں مشغول ہو گیا تھا، سر اوپر اٹھا کر کہنے لگا کہ ''مرغوب کا کسی خاتون کو پسند کر لینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تمام معاملے میں وہ ہماری رائے کا احترام نہیں کرے گا یا تفتیش و تحقیق کرنے کے حق سے ہمیں دست بردار ہونے کے لئے کہے گا۔ شادی تو اُس کی ہونی ہے اور اُس کی پسند، ناپسند کی اہمیت بھی مسلمہ ہے۔ کیوں نہ اُس کے انتخاب پر سنجیدگی سے غور کر لیا جائے؟''

زبیدہ یعقوب نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ ''آخر وہ محترمہ ہیں کون؟ جنہوں نے ہمارے دیور کا دل لوٹ لیا ہے۔ اُن کا حدود اربعہ ہمیں بھی تو معلوم ہو''۔

سکینہ محبوب پھر ہنسنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ناشتے کی میز کا ماحول خوشگوار رکھنا چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ بات پوری طرح کھلی، تو شاید گفتگو تلخی کا رنگ اختیار کر لے گی۔ وہ اتنا وقت لینا چاہتی تھی کہ سب لوگ ناشتے سے فارغ ہو جائیں۔ پھر ہی اس موضوع کو چھیڑا جائے۔

میجر یعقوب علی نے جب بھابی کو مصنوعی ہنسی ہنستے ہوئے دیکھا تو سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا مرغوب علی نے کوئی بہت بڑا تیر مارا ہے۔ جو آپ غیر معمولی خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔ چلو ناشتے کے بعد ہی سہی، ہمیں پتہ بھی تو چلے کہ آخر معاملہ ہے کیا؟'' سب لوگ چائے کی پیالیاں

ہاتھوں میں لئے ڈرائنگ روم کی طرف ہو لئے۔ محبوب علی جو بظاہر جلدی میں تھا، کہنے لگا۔

''اگر چہ مجھے دفتر جانا ہے کیونکہ آج کئی اہم کیس زیرِ تفتیش ہیں۔ بہر حال یہ معاملہ بھی اہم معلوم ہوتا ہے، اس کی تفصیلات کا ادراک بھی ضروری ہے، ورنہ دن بھر کام میں یکسوئی میسر نہیں آئے گی، دھیان اسی طرف لگا رہے گا''۔

وسوسے دل میں لئے سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ زبیدہ مرکز نگاہ تھی، مگر دل میں سوچ رہی تھی کہ وہ کب سے آس لگائے بیٹھی تھی کہ مرغوب تعلیم ختم کرلے تو وہ اپنی خالہ زاد بہن سلمٰی کے رشتے کی بات چلائے۔ سلمٰی اور مرغوب کا جوڑ کتنا اچھا ہوتا۔ کیا لڑکی ہے سلمٰی، بی اے تک تعلیم، زنانہ حسن میں یکتا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سگھڑ، خالہ نے اُس کی تربیت میں کتنی محنت کی تھی۔ کالج کی تعلیم کے ساتھ ساتھ زنانہ دستکاری سکول میں بھی پڑھایا اور سلائی کڑھائی سکھلائی تھی۔ طرح طرح کے کھانے اُس کے ہاتھ سے پکواتی رہیں۔ میں بھی کتنی کوڑھ مغز ہوں کہ خاموش انتظار کرتی رہی۔ قبل از وقت بات نہ چلائی مگر کیا خبر تھی؟ کہ کوئی ڈائن مرغوب کو یوں اچانک اُچک لے گی۔

نشستوں پر بیٹھتے ہی محبوب علی نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بیگم! کیا بات ہے، ذرا جلدی سے بتاؤ تاکہ دفتر جانے میں تاخیر نہ ہو۔ ابھی مجھے وردی بھی پہننا ہے''۔

بیگم محبوب پھر ہنسنے لگی اور مرغوب کی طرف منہ کر کے کہا۔ ''ہاں بھئی! کہو، میں نے تو بات چلا دی ہے''۔

مرغوب علی نے سر جھکا لیا، جیسے وہ شرما رہا ہو۔ میجر یعقوب علی نے خاموشی کی فضا توڑتے ہوئے کہا۔ ''مرغوب! عشق بازی میں نہیں شرمائے اور اب جبکہ اس عشق کی تکمیل کا موقعہ آیا ہے تو اس انداز کا کیا فائدہ؟''

مرغوب علی نے جب دیکھا کہ سکینہ بھابی اب آگے بڑھ کر ڈھال بننے کے لئے تیار نہیں تو خود ہی آہستہ آہستہ مس ثریا سے اپنی محبت، قول و قرار اور اس کی اسلام قبول کرنے پر آمادگی کی ساری کہانی بیان کر دیا اور پھر یہ بھی کہہ دیا کہ وہ فیصلہ کر چکا ہے کہ ثریا کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑے گا اور یہ بھی کہ وہ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنے میں اپنے آپ کو آزاد اور حق بجانب سمجھتا ہے۔

چوہدری محبوب علی نے جب اپنے چھوٹے بھائی کی گفتگو سنی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے سخت روحانی صدمہ پہنچا ہے مگر اس نے صرف اسی قدر کہا۔ ''کیا تم اپنی گرل فرینڈ کو کچھ وقت کے لئے یہاں لا سکتے ہو؟ اگر ممکن ہو تو مجھے اس کے تمام کوائف بھی بتا دو تا کہ میں اس کے پس منظر، حالات اور چال چلن کے متعلق اپنے طور پر تصدیق کروالوں۔ بہتر ہے کہ اسے آج ہی رات کھانے پر بلوا لو''۔

اس پروگرام میں سنجیدگی کا عنصر بڑھانے کے لئے اس نے اپنی بیگم پر بھی بوجھ ڈالا۔

''بیگم! آج ذرا اپنی باورچی گیری کے پرانے کمالات دکھاؤ، مہمان خاص آرہا ہے''۔

مرغوب علی، جو ہر حال میں اپنے پروگرام کو مکمل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مس ثریا رُلیا رام کو اپنے رشتہ داروں سے ملوانے پر راضی ہو گیا اور اُس کا پتہ بھی دے دیا۔

انسپکٹر محبوب علی جلد ہی تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ اس نے وہاں جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ایک ہوشیار ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل اپنے دفتر میں بلائے اور انہیں حکم دیا کہ تحریر کردہ نام اور پتے پر موجود لڑکی کے پورے کوائف شام ہونے سے پہلے اسے مل جائیں۔ اگر اس کا کوئی سرپرست بھی موجود ہو تو اس کے متعلق بھی پوری

تحقیق کرلیں۔

میجر یعقوب علی اور بیگم یعقوب اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بیگم چھوٹے بچوں کو جگا کر انہیں ناشتہ کرانے اور کپڑے پہنانے لگی جبکہ میجر تیار ہو کر چھاؤنی چلا گیا تاکہ جی ایچ کیو میں فون کر کے یہ پتہ کر لے کہ رخصت کے خاتمے پر اُسے کہاں حاضر ہونا ہے؟ بیگم محبوب نے بچوں کو تیار کر کے سکولوں کی طرف روانہ کیا اور اپنے دن بھر کے کام میں مصروف ہوگئی۔

مرغوب نے سائیکل پکڑی اور اخبار کے دفتر کی طرف چل دیا۔ وہ راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ خدا جانے خاندان کے لوگ اب کیا رویہ اختیار کریں گے؟ اگر انہوں نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ مگر وہ اپنے دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ثریا کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ وہ خاندان والوں سے تعلقات منقطع کرے گا مگر ثریا سے نہیں۔ اگر مناسب ہوا تو شہر بھی چھوڑ دے گا، کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ خاندان کے لوگ مستقل طور پر ناراض نہیں رہ سکتے۔ چند سال گزر جائیں گے تو وقت کا مرہم سب کے زخم بھر دے گا۔ تب یہ بھی ممکن ہوگا کہ یہ لوگ ثریا کو اپنے خاندان کے فرد کی حیثیت سے قبول کرلیں۔ اسی ادھیڑبن میں وہ دفتر پہنچا۔ جاتے ہی اُس نے وسیع القلبی کے حق میں اور خاندانی تعصب کے خلاف ایک بھرپور کالم لکھا اور اسے فخر سے دیکھنے لگا۔

اتنے میں مس ثریا بھی اخبار کے دفتر میں پہنچ گئی۔ اس نے پہلے تو کالم پڑھا، جو ضروری نظرثانی کے بعد کاتب کو جا رہا تھا اور پھر مرغوب علی سے کہنے لگی۔ ”اگر وقت ہو تو آؤ، باہر کسی خوشگوار جگہ چل کر بیٹھیں۔ میں بہت پریشان ہوں“۔

کالم کی کاپی کاتب کو گئی تو مرغوب علی ایڈیٹر سے باقی وقت کی چھٹی لے آیا اور مس ثریا کو ساتھ لے کر آہستہ آہستہ مال روڈ پار کر کے اسمبلی ہال کے لان میں جا بیٹھا۔

دونوں ساتھ بیٹھے ہی تھے کہ ثریا نے رونا شروع کر دیا۔ مرغوب علی بجائے اس کے کہ اپنی بات شروع کرتا، جس کے سنانے کے لئے وہ بہت بے تاب تھا ثریا کی بے وقت اور اچانک آہ و زاری سے پریشان ہو گیا۔ پیار سے بولا۔ ”ثریا! کیا کر رہی ہو؟ حوصلہ کرو اور مجھے بتاؤ کہ تمہاری یوں بڑھتی ہوئی پریشانی کا ماجرا کیا ہے؟“

ثریا نے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو صاف کرتے اور بدستور سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ”آج صبح ناشتے کی میز پر ڈیڈی نے مجھے بتایا کہ انہوں نے رنگ محل مشن ہائی سکول کے ایک ٹیچر کے ساتھ میرا رشتہ طے کر دیا ہے اور اس سلسلے میں پادری عرفان نے اُن کی بہت مدد کی ہے“۔ (پادری عرفان رنگ محل مشن ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، جنہوں نے پاکستان بننے کے چار پانچ سال بعد بونگ ہال سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی) بات سن کر مرغوب علی سناٹے میں آ گیا۔

ثریا جو ابھی تک سسکیاں بھرے جا رہی تھی، مزید بولی۔ ”میں نے ڈیڈی سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں مسلمان ہو رہی ہوں اور اپنی مرضی سے مرغوب علی کے ساتھ شادی کر رہی ہوں۔ اس پر ڈیڈی کہنے لگے کہ بٹی! جب تم صرف پانچ برس کی تھیں تو تمہاری ماں مر گئیں۔ میرا دنیا میں کوئی نہ تھا۔ یہی مشن اور اس کے کارکن میرے رشتہ دار ہیں۔ امریکن پادری اور مقامی عیسائی حلقوں میں میرا بہت بھرم ہے۔ میں چاہتا تو آسانی سے دوسری شادی کر سکتا تھا، مگر میں نے تمہاری خاطر ایسا نہ کیا اور تمام زندگی اسی خیال میں گزار دی کہ بٹی جوان ہو کر کسی بہتر گھرانے میں آباد ہو جائے، میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ میں نے یہ انتظام کیا ہے

۔ تمہاری شادی ہو جائے اور میں تم دونوں میاں بیوی کو امریکہ بھجوا دوں تاکہ تم دونوں وہاں سے پی ایچ ڈی کر لو۔ جی چاہے تو واپس آنا ورنہ وہیں بس جانا۔ میں نے جب سمجھا کہ ڈیڈی کسی طور بھی میرے اور تمہارے اتحاد پر راضی نہ ہوں گے، تو میں نے انہیں صاف صاف کہہ دیا کہ آپ جو بھی چاہیں کر لیں، میں جو پروگرام بنا چکی ہوں، اس سے مجھے کوئی نہیں روک سکتا، خواہ کچھ بھی ہو میں مرغوب علی کو نہیں چھوڑ سکتی۔

اس پر ڈیڈی کہنے لگے کہ تم مرغوب علی سے ایک بار پھر یہ کہہ دیکھو کہ وہ عیسائی ہو جائے تو میں مشن والوں کو کہہ کر تم دونوں کو اعلیٰ تعلیم کے لئے امریکہ بھجوا دوں گا۔

میں نے جواب دیا کہ مجھے امید نہیں کہ مرغوب ایسا کر سکے گا۔ ڈیڈی نے کہا کہ پھر تیسری صورت یہی ہے کہ تم اپنی مرضی کرو اور میں خودکشی کر لوں۔ یہ کہہ کر ڈیڈی رونے لگے اور میں بھی روتی ہوئی تمہاری طرف نکل آئی۔ ''ہائے ڈیڈی آپ کتنے اچھے ہیں مگر کتنے ضدی''۔

مرغوب علی نے بات سنی تو تحمل سے گویا ہوا۔ ''ایسی مشکلات تو بہرحال ہوں گی۔ خودکشی کوئی نہیں کرتا۔ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں، یا ڈرانے کا حربہ، وقت کا مرہم سب زخم بھر دیتا ہے۔ جو باتیں بظاہر ناقابل برداشت معلوم ہوتی ہیں، جب حقیقت کا روپ اختیار کر لیتی ہیں تو سب انہیں برداشت کر لیتے ہیں''۔ مرغوب علی نے تھوڑا سا توقف کیا پھر بولا۔ ''اب میں تمہیں بتاؤں کہ میرے ساتھ کیا گزری۔ میں نے جب اپنا سارا پروگرام اور تمہارے مسلمان ہو جانے پر رضامندی کے متعلق اپنے خاندان والوں کو بتایا تو انہوں نے اپنے چہروں سے کسی بھی تاثر کا اظہار نہ کیا۔ یوں لگا، جیسے یہ سب لوگ پتھر کے بت ہو گئے ہوں اور ان کے چہرے ہر قسم کے جذبات سے عاری ہو چکے ہوں۔ صرف بڑے بھائی جان نے تمہارا پتہ معلوم کیا تاکہ تمہارے متعلق اپنے خفیہ ذرائع سے معلومات حاصل کر سکیں۔ یہ البتہ ضرور کہا گیا کہ محترمہ کا تعارف اپنے خاندان سے کروا دو۔ میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ اس ضمن میں تم سے وقت کا تعین کروں گا۔ کیا تم آج رات کے کھانے پر ہمارے ہاں آ سکتی ہو؟''

ثریا جو بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی، کہنے لگی۔ ''مجھے تم جہاں چاہو، لے جا سکتے ہو۔ کیوں کہ مجھے اب گھر واپسی کا راستہ نظر نہیں آتا۔ اچھا ہوتا کہ تم عیسائی ہو جاتے، خواہ وقتی طور پر ہی سہی۔ ہم ملک سے باہر چلے جاتے، پھر تم اپنی مرضی کرتے''۔

مرغوب علی نے جواباً کہا۔ ''نہ میں کوئی مذہبی آدمی ہوں، نہ ہی تم۔ تم رسمی طور پر اس لئے عیسائی ہو کہ تمہارے والد عیسائی ہیں اور وہ اس لئے عیسائی ہیں کہ اُن کی ماں نے انہیں بچپن ہی میں مشن کے حوالے کر دیا تھا۔ ورنہ وہ کیا ہوتے؟ کوئی نہیں جانتا، رامداسی یا کچھ اور؟ میں اس لئے مسلمان ہوں کہ مسلمانوں کے ہاں پیدا ہوا۔ میرا ایک خاندان ہے، میری جائداد ہے۔ معاشرتی مقام ہے۔ میں اس مقام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ تم مجھے خواہ مخواہ ایک ایسی صورت قبول کرنے کے لئے کہہ رہی ہے، جس میں ہم اپنی معاشرتی حیثیت بالکل کھو دیں گے۔ ہم پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ تم اسلام قبول کر لو گی۔ اب محض اپنے والد کی خودکشی کرنے کی خالی خولی دھمکی سے متاثر ہو کر تم اپنا فیصلہ بدل رہی ہو۔ ایسا نہ کرو اور آگے بڑھو، آج رات کا کھانا ہمارا جیون سنوار سکتا ہے۔ دعا کرو کہ ہم تمام لوگوں کا تعاون حاصل کر سکیں''۔

ثریا نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''اگر ہم ان کا تعاون حاصل نہ کر سکے تو پھر کیا ہو گا؟''

مرغوب علی نے اعتماد جمع کرتے ہوئے معاملہ سلجھایا۔ ''اس صورت میں ہم دونوں آزاد ہوں گے۔ تم اسلام قبول کرو گی اور ہم نکاح کر لیں گے۔ اگر تم اتفاق کر

لو تو آج شام ریڈیو سٹیشن سے میں تمہیں سیدھا اپنے گھر لے چلوں؟''

ثریا کچھ اور پریشان ہو گئی۔ ''مجھے تمہارا یہ پروگرام اچھا نہیں لگا۔ یقین ہے کہ جب میں تمہارے خاندان والوں سے شادی سے پہلے یوں ملوں گی تو وہ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ میرے منہ پر ہی میری مخالفت کا اظہار کریں اور میری بے عزتی بھی کر دیں لیکن تمہارے ساتھ میں اس قدر آگے بڑھ گئی ہوں کہ اب ہر قسم کے حالات برداشت کرنا پڑیں گے۔ تم جو بھی کہو گے میں کروں گی، جہاں لے جاؤ گے چلی جاؤں گی''۔

مرغوب علی نے جواباً اسے باور کرایا۔ ''ہمارے ہاں اچھا نہیں سمجھا جاتا کہ کسی کو اپنے گھر بلا کر اس کی بے عزتی کی جائے۔ ہاں، اگر وہ لوگ ہمیں بطور میاں بیوی دیکھنا پسند نہیں کریں گے تو جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ہم اپنی زندگی کے معاملات میں مختار ہیں۔ اگر تم اپنے والد سے بغاوت کر سکتی ہو تو مجھے بھی اپنے بھائیوں سے بغاوت کرنے اور انہیں کچھ وقت کے لئے چھوڑ دینے میں کوئی جھجک نہ ہو گی۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ ایسی ناراضگیاں دیرپا نہیں ہوتیں۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ خاندانی راویات، بلاوجہ تفاخر اور ذات پات کا غرور زیادہ دیر تک قائم رہنا مشکل ہیں''۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ شام دونوں ریڈیو سٹیشن سے انسپکٹر محبوب علی کے دولت خانے پر تعارف اور کھانے کے لئے اکٹھے جائیں گے، وہ علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ مرغوب علی والٹن کیمپ میں رضا کارانہ خدمات سرانجام دینے چلا گیا اور ثریا ریڈیو سٹیشن پر دن کے پروگرام میں شمولیت کے لئے روانہ ہو گئی۔

کوئی دس بجے کے قریب بیگم زبیدہ یعقوب اور بیگم سکینہ محبوب تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھیں باورچی دن بھر کی ضرورت کا سامان خرید لایا تھا، جس میں دوپہر کے سادہ لنچ اور رات کے پُرتکلف کھانے کی تیاری کی ساری اشیاء شامل تھیں۔ بیگم سکینہ محبوب نے سامان کا سرسری جائزہ لیا اور نوکرانی کو مناسب ہدایات دے کر ساری اشیاء اس کے حوالے کر دیں۔ دونوں دیورانی، جیٹھانی وقت نکال کر گپ شپ میں مشغول ہو گئیں۔

زبیدہ یعقوب نے کہا۔ ''سکینہ بہن! ہمارے خاندان میں پہلے اس روایت کی بڑی پابندی تھی کہ نہ تو باہر سے رشتہ لیا جائے اور نہ ہی دیا جائیں ایک محاورہ مشہور تھا کہ اگر شیر بن کر جینا چاہے ہو تو گجری کا دودھ پیو۔ ہمارے بزرگ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم نے گجری کا دودھ پیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب کانگڑہ کے راجہ نے بغاوت کی تو مغل فوج کا پلہ دبنے لگا تھا۔ مغلوں کی فوج میں گجروں کا دستہ بھی شامل تھا۔ اس وقت کسی نے نعرہ لگایا کہ آج گجری کے دودھ کی آزمائش کا وقت ہے۔ یہ للکار سنتے ہی گجروں کے مختصر دستے نے اس زور سے یلغار کی کہ ڈوگرہ فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔

بہن! جب آپ کی شادی بھائی محبوب سے ہوئی، اس وقت میں اس گھر میں نہیں آئی تھی مگر قرابت داری کی وجہ سے مجھے سب حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ برادری میں بڑا طوفان اٹھا تھا۔ یہ بھی کہا گیا کہ اگر محبوب بھائی نے یہ شادی کر لی تو انہیں برادری سے باہر کر دیا جائے گا۔ مگر کسی نے یہ کہہ کر پانسہ پلٹ دیا کہ ان ارائیوں کے ساتھ ہم مدت سے لڑتے رہے ہیں۔ اگر وہ اب رشتہ دے کر ہار ماننا چاہتے ہیں تو ہمیں کیا اعتراض ہے؟ یہ دلیل خواہ جذباتی، بے معنی اور خلاف واقعہ ہی تھی، کام کر گئی اور ہر کوئی اس رشتے پر راضی ہو گیا مگر اب جو مرغوب اس خاندان میں کرئی کا پیوند لگا رہا ہے اسے کون برداشت کرے گا؟''

سکینہ محبوب خاموشی سے بات سن رہی تھی۔ [illegible]

زبیدہ یعقوب کی بات، جس میں ارائیوں کو نیچا دکھانے والی تعلّی کا ذکر تھا، بالکل اچھی نہ لگی تھی، مگر محض اس لئے چپ ہو گئی کہ زبیدہ یعقوب مہمان تھی۔ اگر اس نے اس کی بے معنی گفتگو کو نظر انداز نہ کیا تو اس کی دل شکنی ہو گی۔ ویسے بھی وہ جب سے اس خاندان میں آئی تھی، یہ بات کئی دفعہ سن چکی تھی۔

دوسرا سوال جو زبیدہ یعقوب نے اٹھایا تھا۔ وہ بہت اہم تھا۔ اسے مرغوب علی سے بہت ہمدردی تھی۔ بڑی بھابی ہونے کے ناطے وہ اپنے آپ کو خاندان کا سربراہ بھی سمجھتی تھی۔ دس بارہ سال سے اس خاندان میں فرائض نبھاہ رہی تھی۔ اسے خاندان کی روایات کا علم تھا اور احترام بھی۔ دوسری طرف وہ یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ مرغوب علی ثریا کی محبت میں بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ اسے باز رکھنا اتنا آسان نہ تھا، جتنا برادری سمجھ رہی تھی۔

اسے وہ وقت یاد آ گیا، جب محبوب علی اُس کے علاقے میں بطور تھانیدار تعینات ہوا تھا۔ گھر میں اس کا تعارف بھائیوں کی وجہ سے ہوا تھا، پھر اس کا وہاں آنا جانا ہوا۔ ایک دن اتفاق سے وہ اس کے سامنے بھی آ گیا۔ اس دم دونوں نے دلوں میں نہ جانے کیا کیا محسوس کیا۔ پھر محبوب علی کا آنا جانا بڑھ گیا۔ بہانے بہانے سے تحفے تحائف بھی آنے لگے۔ وہ بھی دوبارہ اس کے سامنے نہ آئی۔ مگر اسے کسی نہ کسی طرح علم ہوتا رہا کہ محبوب علی نے مختلف ذرائع سے رشتے کی بات چلا دی ہے۔ ہر ایک نے اسے پاگل پن قرار دیا مگر جو اللہ کا لکھا تھا، وہ ہو کر رہا۔

سکینہ محبوب انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ زبیدہ یعقوب نے دوبارہ اسے مخاطب کر لیا۔ ''سکینہ بہن! مرغوب علی کا معاملہ خاندان کے لئے بڑا خطرناک ہے۔ اپنے خاندان میں لڑکیوں کی کیا کمی تھی؟ میری خالہ زاد بہن سلمٰی کیا موزوں نہیں تھی؟ میں بڑی مدت سے سوچ رہی تھی کہ اُسے بیاہ لائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو کتنا اچھا ہوتا''۔

سکینہ جو اب تک صرف سنے جا رہی تھی، کہنے لگی۔ ''زبیدہ! تم اپنے خاندان والوں کی ضد سے تو واقف ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ کسی طرح موجودہ معاملہ خوش اسلوبی سے سلجھ جائے اور اب کوئی بھی بلا جواز ضد نہ کرے۔ جہاں تک سلمٰی کا تعلق ہے تو تم نے یہ بات پہلے کیوں نہ طے کرا لی۔ اگر مرغوب علی کی منگنی ہو چکی ہوتی تو شاید وہ ثریا کے جال میں نہ پھنستا''۔

انسپکٹر چوہدری محبوب علی اپنے ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہیوں کو مس ثریا کے حالات کے متعلق کھوج لگانے کے لئے بھیج کر اپنے معمول کے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ دوپہر کا کھانا بھی اسے قریبی ریسٹوران سے منگوانا پڑا۔ کوئی تین بجے کے قریب اُس کے تینوں اہلکار واپس آئے اور اسے بتایا۔ ''مسٹر زلیا رام کمپاؤنڈر ایک شریف اور محنتی آدمی ہے۔ اس کا اس شہر میں کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ ثریا اُس کی اکلوتی لڑکی ہے۔ لڑکی کی ماں اُس کے بچپن ہی میں فوت ہو گئی تھی، اس لئے ثریا کی صحیح تربیت نہیں ہو سکی۔ وہ بہت زیادہ آزاد خیال اور ضدی ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس کے چال چلن میں کسی برائی کا علم نہیں ہو سکا لیکن اس کی آزاد خیالی اور نوجوانوں کے ساتھ آزادانہ میل جول پر لوگ بالعموم حرف گیری کرتے ہیں۔ مسٹر زلیا رام کے باپ کو کوئی نہیں جانتا، مگر اس کی ماں راداسی ہندو تھی اور اپنے مذہب ہی پر مری۔ زلیا رام کو مشن والوں نے پالا اور اُسے عیسائی بنا لیا۔ اب وہ عیسائی برادری کا ایک معزز رکن ہے۔ اس کا جرائم پیشہ لوگوں کے کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں پایا گیا، تاہم اگر افسران بالا کی خواہش ہو تو اسے رات کو تھانے میں بلا کر پوچھ گچھ کی جا سکتی ہے تاکہ وہ خود ہی بول پڑے''۔

آخری جملوں پر انسپکٹر محبوب علی ہنسے بغیر نہ رہ سکا

اور کہنے لگا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے جس قدر معلومات درکار تھیں، وہ مل گئیں۔ اس تفتیش کی باقاعدہ فائل نہ کھولی جائے۔ یہ کہہ کر وہ گھر کو روانہ ہو گیا۔

میجر یعقوب علی نے کراچی آرمی ہیڈ کوارٹرز میں ٹیلیفون کیا تو اُسے حکم ملا کہ وہ پہلی گاڑی پر کراچی پہنچ جائے۔ اس کی تقرری جی ایچ کیو کی اے جی برانچ میں کر دی گئی ہے۔ اس کے بطور لیفٹیننٹ کرنل پروموشن کا نوٹیفکیشن بھی ایک آدھ دن میں ہونے والا ہے۔ یعقوب علی یہ خوشخبری سنانے بے تابانہ گھر پہنچ گیا۔

شام چار بجے تک انسپکٹر محبوب علی، میجر یعقوب علی اور گھر کے دیگر افراد ڈرائنگ روم میں جمع تھے اور اپنی اپنی دن کی کارگزاری بیان کرنے کے لئے تیار تھے۔ مرغوب علی کے باعث حالات میں کچھ تناؤ پیدا ہو چکا تھا گو گھرداری کے عمومی مشاغل حسب معمول تھے۔ باورچی خانے سے پلاؤ، کبابوں اور روسٹ کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی۔ اب مرغوب علی کا انتظار تھا، جس کی واپسی شام نو بجے سے پہلے متوقع نہ تھی۔

اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زبیدہ یعقوب نے ایک دفعہ پھر اپنے خیالات کا اظہار شروع کر دیا۔ اپنی خاندانی روایات اور سلمٰی کے رشتے کی بات چھیڑ دی۔ انسپکٹر محبوب علی نے سب کچھ سن کر تحمل سے کہا۔ ''آج کی رات گزر جانے دیں۔ اب مرغوب علی کو آہستہ آہستہ ہی راہ پر لایا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی دھن کا بہت پکا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم جلد بازی کر کے کچھ نقصان کر لیں''۔ یہ کہہ کر کچھ بات کا رُخ بدلنے اور بنیادی طور پر یعقوب علی اور زبیدہ یعقوب کا پروگرام جاننے کے لئے اس نے میجر یعقوب علی سے سوال کیا کہ اسے کراچی سے کیا جواب ملا ہے؟ یعقوب علی، جو پہلے ہی سے اپنے پروموشن اور نئی پوسٹنگ کی خوشخبری سنانے کے لئے بے تاب تھا، کہنے لگا۔

''بھائی جان! پاکستان کے قیام نے جہاں ہمیں حفاظت امن اور سلامتی کے لئے بے پناہ امکانات مہیا کئے ہیں، وہاں معاشی ترقی کے بھی بے شمار سامان بخشے ہیں۔ خدا کے فضل سے میری ترقی بطور لیفٹیننٹ کرنل ہو رہی ہے اور میرا تقرر جی ایچ کیو کی اے جی برانچ میں دارالحکومت کراچی کر دیا گیا ہے۔ بس اب ایک دو روز میں جونہی ریل گاڑی میں نشست مل جاتی ہے، چلا جاؤں گا۔ زبیدہ اور بچے فی الحال آپ کے پاس رہیں گے۔ وہاں جا کر مکان کے حصول کی کوشش کروں گا۔ جیسے ہی مکان مل گیا، زبیدہ اور بچوں بھی وہاں بلوا لوں گا''۔

تمام لوگ یعقوب علی کی ترقی کے امکان پر بہت خوش ہوئے۔ گھر میں ہلچل سی مچ گئی۔ سکینہ نے کہا۔ ''چلئے، ایک بہانہ مل گیا۔ مس ثریا کو براہ راست یہ کہنے کی بجائے کہ ہم لوگوں نے تمہیں پسند یا ناپسند کرنے کے لئے بلایا ہے، یہ کہیں گے کہ مرغوب علی سے تمہاری راہ و رسم کی وجہ سے تمہیں یعقوب بھائی کے پروموشن کے جشن میں شامل کر کے اپنے خاندان کی خوشیوں میں شریک کیا گیا ہے۔ یہ بات زیادہ ڈھب کی معلوم ہوتی ہے''۔

میجر یعقوب علی نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا۔ ''ہاں، یہ بات ٹھیک ہے، مگر ثریا بھی جانتی ہے کہ اسے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟ اور غالباً ایسی خاتون کے لئے، جو اپنے آپ کو ایسے حالات میں ڈھال لے کہ خود چل کر ایک اجنبی خاندان میں آ جائے اور بظاہر ناگوار صورت قبول کر لے، ایسے بہانے بیکار ہیں۔ وہ بہکاوے میں نہیں آنے گی''۔

انسپکٹر محبوب علی کہنے لگا۔ ''شلجموں کو بازار میں بھیجنے سے پہلے ان پر سے مٹی دھولی جاتی ہے، ورنہ سب جانتے ہیں کہ شلجم زمین کے اندر پروان چڑھتے ہیں''۔

زبیدہ یعقوب کو مس ثریا کا مرغوب علی سے میل جول بڑھانا اور پھر خاندان کی دعوت میں شریک ہو جانا سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ ابھی تک وہ اس ناگواری یہ

مصنوعی طور پر بھی قابو نہ پاسکی تھی، پھر بول پڑی۔ اس بار اس کا مخاطب انسپکٹر محبوب علی تھا۔ کہنے لگی۔ ''بھائی جان! آپ نے کل اس لڑکی کے متعلق تحقیقات کرنے کے لئے کہا تھا، کیا اس تحقیقات کا کوئی نتیجہ نکلا۔ محبوب علی نے جواب دیا۔

''ہاں، مجھے سب معلومات مل چکی ہیں۔ لڑکی تعلیم یافتہ تو ہے ہی، اس کا چال چلن بھی داغ دار نہیں مگر بات جہاں بیٹھتی ہے وہ اس کا خاندانی پس منظر ہے جو میرے اندازے کے مطابق ہی نکلا لیکن جس مقام پر مرغوب پہنچ چکا ہے وہ اس فارسی شعر کے مصداق ہے کہ اس راستے میں فلاں ابن فلاں کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا (کہ دریں رہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست)''

میجر یعقوب جواب اپنے آپ کو لیفٹیننٹ کرنل ہی سمجھے ہوئے تھا، بات کا رخ بدلنے کے لئے کہنے لگا۔ ''بھائی جان! ہندو افسران کے چلے جانے کے بعد آپ کے محکمے میں بھی بہت سی آسامیاں نکلی ہوں گی۔ آپ کے پروموشن کی توقع کب تک ہے؟''

انسپکٹر محبوب علی نے اپنے فطری دھیمے پن کے مطابق نرمی سے جواب دیا۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے سرفراز فرمایا ہے تو اس کی بے شمار برکتوں کا نزول بھی ہو رہا ہے۔ میرے ڈی ایس پی ہونے کے کاغذات تقسیم سے قبل ہی چل پڑے تھے۔ تقسیم کے ہنگامے نے بہت سے کام ٹھپ کر دیے اور پولیس کے کام میں اچانک بہت سا اضافہ ہو گیا۔ اب متوقع ہے کہ ہفتے دو ہفتے میں وائی مکمل ہو کر ان شاء اللہ تعالیٰ احکام صادر ہو جائیں گے''۔

نو بجنے میں ابھی پانچ دس منٹ باقی تھے کہ باہر تانگہ رکنے کی آواز آئی اور چند لمحوں میں مرغوب علی نرمینہ کو ساتھ لئے ہوئے اندر داخل ہو گیا۔ سب لوگ نرمینہ کے احترام میں رسماً کھڑے ہو گئے۔ سکینہ محبوب اور

زبیدہ یعقوب نے آگے بڑھ کر مہمان سے ہاتھ ملائے۔ سکینہ محبوب کے رویے سے گرمجوشی اور تپاک کا اظہار ہوتا تھا مگر زبیدہ کے چہرے پر بدستور ناگواری کی علامات نمایاں تھیں۔ غالباً وہ کوشش کے باوجود بھی اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ دوسری طرف انسپکٹر محبوب علی نے "خدا خوش رکھے، جیتی رہو" کے دعائیہ کلمات ادا کئے، یوں اس غیر معمولی ملاقات کے ابتدائی مراحل کسی نہ کسی طرح طے ہوئے۔

ثریا پریشان تو تھی ہی مگر ہمت کر کے چلی آئی تھی۔ اب جو اجنبی لوگوں سے یوں آمنا سامنا ہوا تو اس کی پریشانی میں گھبراہٹ کا بھی اضافہ ہو گیا۔ یونیورسٹی یا کالج میں ہم سبق لڑکوں سے ملنا اور ان سے گفتگو کرنا، ان کی بے باک نگاہوں کا سامنا کرنا اور بے ہنگم جملوں کا برداشت کرنا اس صورت حال سے قطعاً مختلف تھا، جو اب پیش آئی تھی۔ بہر حال سکینہ محبوب اور انسپکٹر محبوب علی کے مشفقانہ رویے نے اس کی مدد کی اور وہ جوں توں اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی، ورنہ ممکن تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ گھبراہٹ میں مرغوب ہی کو یہ یاد ہی نہ رہا تھا کہ وہ ثریا کا فرداً فرداً خاندان کے افراد سے تعارف کراتا۔ اب ذرا سکون ہوا تو اس نے اپنی بھابیوں اور بھائیوں کے نام لے لے کر ثریا سے انہیں متعارف کروایا۔ سچ تو یہ ہے کہ مرغوب ثریا سے اپنے خاندان کے افراد کا اس تکرار سے تذکرہ کر چکا تھا کہ اس رسمی تعارف کی قطعاً ضرورت ہی نہ تھی۔

تعارف ختم ہوا تو سب لوگ خاموش کھڑے رہ گئے۔ کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کہا جائے۔ اچانک سکینہ محبوب نے ماحول کی سنجیدگی کو توڑا اور بولی۔ "مس ثریا! آپ کے متعلق مرغوب بہت کچھ بتا چکا ہے۔ آج ہی میجر یعقوب علی کے متوقع پروموشن کی خبر آئی، تو ہم نے آپ کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کرنا ضروری سمجھا"۔ میجر یعقوب علی نے ساتھ کے ساتھ جملہ کسا۔

"بھابی! بھائی جان ڈی ایس پی ہو رہے ہیں، یہ بات بھی تو کریں"۔

محبوب کہنے لگا۔ "بھائی! جو خوشی چھوٹے بھائیوں کی ہوتی ہے اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ والد مرحوم تو سب توقعات دل میں لئے دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے حصے کی خوشیاں بھی میری قسمت ہی میں لکھی تھیں"۔

کھانے کی میز پر صرف کھانوں کی لذت، بھابی سکینہ کے سلیقے اور محبوب بھائی کی دانش مندی ہی کی باتیں ہوتی رہیں۔ جائداد کے کلیم، مکانوں اور زمینوں کی عارضی الاٹمنٹ وغیرہ کا ذکر بھی کسی نہ کسی طرح درمیان میں آ گیا۔ میجر یعقوب علی کے کراچی تبادلے نے خاندان کو دوبارہ دو مختلف مقامات پر تقسیم کر دیا تھا۔ یہ ذکر بھی ہوا اب یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں خاندان کی تقسیم مستقل ہی نہ ہو جائے۔

ثریا کھانے کے دوران خاموش رہی۔ گھر کا ہر فرد بار بار اس کے سامنے کوئی نہ کوئی چیز رکھتا۔ ماحول کو کسی حد تک بے تکلف بنانے کی کوشش کرتا مگر ثریا نہ تو بے تکلف ہوئی اور نہ ہی اس نے جی بھر کر کھانا کھایا۔ بس میز پر بیٹھی ایک فرض ادا کرتی رہی۔ زبیدہ یعقوب نے اسے دو ایک دفعہ چھیڑنے کی کوشش بھی کی مگر ثریا نے اسے ناگواری سے مسکرا کر ٹال دیا۔

کھانا ختم ہوا تو ثریا نے گھر جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انسپکٹر محبوب علی نے اصرار کیا۔ "تھوڑی دیر ڈرائنگ روم میں بیٹھیں، اس دوران چائے کی پیالی پی لیں، میں اردلی سے تانگہ لانے کے لئے کہتا ہوں۔ مرغوب آپ کو چھوڑ آئے گا۔ رات کو اکیلے جانا مناسب نہیں"۔

ثریا نے بظاہر سچ بولا کہ مجھے رات کے کھانے پر

چائے کی عادت نہیں۔ تانگے کا انتظار بہر حال لازمی ہے۔

ملاقات کے آخر میں سب نے ثریا کی حتی الوسع دلجوئی کی۔ اس کے آنے کا شکریہ ادا کیا لیکن کسی نے اشارتاً بھی اس کے مستقبل کے متعلق کچھ نہ کہا۔ سوائے زبیدہ یعقوب کے، جس کی گفتگو میں مزاح کی بجائے استہزا کی کاٹ تھی۔ وہ وقفے وقفے سے جملے کستی رہی لیکن اس خاندان کی اٹھان کچھ ایسی تھی کہ کسی نے بھی نہ تو زبیدہ کے فقرات پر اور نہ ہی ثریا کی خاموشی پر کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار کیا۔

تانگہ آیا تو مس ثریا نے سب سے شب بخیر اور الوداع کے رسمی کلمات کہے، خواتین سے ہاتھ ملائے، میجر یعقوب علی اور انسپکٹر محبوب علی کو سلام کیا اور خاموشی سے جس طرح آئی تھی، اسی طرح باہر نکل گئی۔ مرغوب علی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا باہر کا گیٹ پار کر گیا۔ ابھی مرغوب اور ثریا تانگے میں بیٹھے نہیں تھے کہ زبیدہ یعقوب نے اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر ہانک لگائی۔

''کالی میم! بے شرم کہیں کی، رات کو غیر مردوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے''۔ زبیدہ نے نادانستہ یہ جملے اتنی اونچی آواز میں کہے کہ ثریا اور مرغوب علی نے صاف صاف سن لئے، مگر تانگے والے کی موجودگی کے پیش نظر دونوں خاموش رہے اور کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ تانگے میں بیٹھ کر بھی دونوں نے کوئی بات نہ کی، حالات اور شرافت کا تقاضا یہی تھا۔

گھر کے افراد انسپکٹر چوہدری محبوب علی پیچھے پیچھے واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ سکینہ محبوب نے بڑے پیار سے بات شروع کی۔ ''زبیدہ بہن! ذرا تانگہ چل تو لینے دیتیں، پھر جو چاہے کہہ لیتیں۔ اس معاملے میں [illegible]ے جذبات آپ سے قطعاً مختلف نہیں مگر مہمان نوازی اور مرغوب علی کے جذبات کے پیش نظر خاموش رہنا پڑا، اور ہمیں کبھی کبھی وضعداری سے کام لینا پڑتا ہے''۔

زبیدہ یعقوب ابھی تک شدتِ جذبات کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اسے ثریا بالکل اچھی نہ لگی تھی اور رات و اس کا غیر مرد کے ساتھ اس طرح تنہا سفر کرنا بہت ہی معیوب معلوم ہوا تھا، اب سکینہ محبوب نے اُسے ٹوکا تو وہ مزید رنجیدہ ہو گئی، پھٹ پڑی۔

''بہن! ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے کہ بکری کا دودھ بچوں کو شیر کی طاقت اور جرأت عطا کرتا ہے اور اب نہ جانے اس خاندان کی آئندہ نسلوں کو کس کس کا دودھ پینا پڑے گا اور کس کس کا خون اس خاندان میں شامل ہو گا''۔ وہ جوش جذبات میں یہ بھی بھول گئی کہ اس کی جیٹھانی بھی، جس سے وہ بات کر رہی ہے، اس خاندان میں باہر سے آئی تھی۔ سکینہ کو ظاہر ہے، زبیدہ کی گفتگو کا یہ انداز پسند نہ آیا مگر وہ بڑی متحمل مزاج اور مدبر خاتون تھی، زور سے ہنسی اور نہایت خوشگوار لہجے میں گویا ہوئی۔

''زبیدہ بہن! کاش تمہیں یہ مقولہ یاد رہتا اور تم بھی اپنے بچوں کو ڈبے کا دودھ نہ پلاتیں''۔

انسپکٹر محبوب علی نے یہ محسوس کر لیا کہ گفتگو تلخی کا رخ اختیار کر سکتی ہے، اس لئے اس نے ایسا انداز اختیار کیا کہ لگا جیسے اسے بہت نیند آ رہی ہے۔ کہا کہ اب نیند کا غلبہ ہو رہا ہے، لہٰذا مجلس برخاست۔ سب لوگ بادل نخواستہ اٹھ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔

مرغوب علی نے ثریا کو اس کے گھر کے سامنے اتارا اور اسی تانگے میں واپس چل پڑا۔ دونوں میں سے اب کسی کو یہ کہنے کی ضرورت نہ تھی کہ صبح دوبارہ ملاقات ہو گی کیونکہ ان کی ملاقاتیں روزانہ کا معمول بن چکی تھیں۔

ثریا گھر میں داخل ہوئی تو اس کا باپ اگرچہ جاگ رہا تھا مگر دونوں میں کوئی بات نہ ہوئی۔ بوڑھا کمپاؤنڈر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ حد سے بڑھے ہوئے لاڈ پیار نے ثریا کو اس حد تک خودسر کر دیا تھا۔

ب اس کی اصلاح ممکن نہ تھی۔ وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھتا تھا کہ تربیت کا حق ادا نہ کر سکا تھا اور اب بڑھاپے میں اپنی غفلت کی سزا بھگت رہا تھا۔

ثریا سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زبیدہ کے جملوں کی تلخی اسے ذہن میں محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے سامنے دو صورتیں تھیں، ایک یہ کہ وہ مرغوب علی کا خیال چھوڑ دے اور اپنے باپ کو راضی کر لے۔ یا پھر یہ کہ وہ مرغوب علی کے خاندان کے افراد کی پروا نہ کرے اور اپنے پروگرام کے مطابق آگے بڑھے۔ کیونکہ اس کا تعلق صرف مرغوب علی سے تھا۔ سوچتی کہ باقی افرادِ خانہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ جائیں گے اور کچھ وقت گزرنے کے بعد وہ زبیدہ سے بھی بدلہ لے سکے گی۔ کسی کو معاف کر دینا ثریا کی فطرت میں نہ تھا۔ بچپن ہی سے ماں کے مر جانے کی وجہ سے اس میں بہت زیادہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی تھی اور مختلف کالجوں میں مخلوط تعلیم کے زیرِ اثر اس خود اعتمادی میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ اسے اپنی ذہانت پر بڑا ناز تھا اور وہ اس بات پر بھی مطمئن تھی کہ پہلی ملاقات ہی میں اس نے خاندان کے تمام افراد کا نفسیاتی تجزیہ کر لیا تھا اور ان کی طبیعتوں کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اس نے سب کی اوسط نکالی تو محسوس کیا کہ اوسط اُس کے خلاف نہیں بلکہ حق میں تھی۔

مرغوب گھر پہنچا تو سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ اس نے باہر کا دروازہ بند کیا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ راستہ بھر سوچتا رہا تھا کہ بھابی زبیدہ نے اچھا نہیں کیا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر پہنچ کر وہ گلہ کرے گا مگر اب جو اس نے دیکھا کہ سب لوگ سونے کے لئے جا چکے تھے تو اس نے احتجاج کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

یعقوب علی اور زبیدہ اپنے کمرے میں گئے تو زبیدہ یعقوب نے پھر بات شروع کر دی اور دھیمی آواز میں خاوند سے کہنے لگی۔ ''آپ کو بھی خاندانی روایات کا کوئی خیال نہیں۔ آپ مرغوب علی کو اس کی حرکات سے منع کیوں نہیں کرتے؟ کوئی بات بھی تو ہو لڑکی میں۔ یہ صرف تعلیم ہی شادی کے لئے انتخاب کا معیار رہ گیا ہے؟ کیا مرغوب کو بجائے بیوی کے، استانی کی ضرورت ہے؟'' میجر یعقوب علی نے اکتا کر کہا۔

''مرغوب جوان ہے اور اپنا نفع نقصان بہتر سمجھتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کی صحیح رہنمائی کر دیں۔ اسے فیصلے کے نتائج سے آگاہ کر دیں اور اگر وہ ہماری رائے کو کوئی اہمیت نہ دے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں''۔ زبیدہ یعقوب یہ بات سن کر سوچ میں پڑ گئی۔

بڑا بھائی محبوب علی اور سکینہ اپنے کمرے میں گئے تو وہاں بھی دن کے واقعات کی صدائے بازگشت سنائی دی۔ سکینہ نے محبوب علی سے کہا۔ ''آپ بڑے بھائی ہیں اور والد کی جگہ ہیں مگر آپ نے مرغوب کی قطعاً رہنمائی نہیں کی۔ مجھے یہ لڑکی، جسے وہ آج ساتھ لایا تھا، بہت چالاک معلوم ہوتی ہے۔ ظاہری شکل و شباہت بھی واجبی ہے۔ میں تو اُسے بدصورت ہی کہوں گی۔ اگر آپ بہت زیادہ رعایت بھی کریں تب بھی اسے اوسط درجے کی لڑکی ہی کہہ سکتے ہیں۔ رنگ تو بہت ہی گہرا ہے، جسے آپ حُسنِ ملیح کہا کرتے ہیں، وہ بھی نہیں کیونکہ نقوش بھی موٹے اور بھدے ہیں۔ بس تعلیم ہی تعلیم ہے۔ کیا مرغوب اسے ملازم کرا کے اس کی کمائی کھانا چاہتا ہے؟''

انسپکٹر محبوب علی کہنے لگا۔ ''میں بھی بالکل تمہاری طرح سوچ رہا ہوں۔ میں کھل کر بات اس لئے نہیں کرتا کہ بڑے اور چھوٹے بھائی کے رشتے میں ایک باریک سا پردہ ہوتا ہے۔ زور دے کر اپنی بات کہنے کا نتیجہ یہ بھی نکل سکتا ہے کہ مرغوب گستاخی پر اتر آئے، جس کے نتیجے میں وہ بالکل ہی ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ درحقیقت ہمیں بروقت پتہ نہیں چل سکا۔ اب مرغوب علی ثریا کے ساتھ بہت آگے جا چکا ہے۔ جب میں نے اسے کہا تھا

کہ ثریا کو یہاں لے آؤ یا رات کے کھانے پر بلا لو تو میرا خیال تھا کہ اول تو مرغوب ہی کچھ شرم کرلے گا اور اس پر راضی نہ ہوگا اور اگر وہ یہ دلیری کر بھی گیا تو ثریا رات کو اکیلی اس کے ساتھ نہیں آئے گی مگر میرے دونوں خیال غلط نکلے۔ اب صرف یہ صورت باقی رہ گئی ہے کہ کل صبح ناشتے پر تم پھر بات چھیڑو اور اسے سمجھاؤ کہ وہ اس لڑکی کے خیال سے باز آجائے۔ مجھے یقین ہے کہ زبیدہ اور یعقوب علی بھی تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں گے، پھر میں بھی اسے سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ دعا کرو کہ وہ سمجھ جائے''۔

تیسرا باب...... بغاوت

صبح ناشتے کی میز پر پھر خاندان اکٹھا ہوگیا۔ میجر یعقوب علی کے بچے ابھی تک جاگے نہیں تھے مگر سکینہ نے اپنے بچوں کو سویرے سویرے ناشتہ کرا کے سکول جانے کے لئے تیار کروا دیا تھا۔ اس روز پھر زوردار بحث ہوئی۔ لڑکے اور لڑکیاں گھر سے ایک ہی تانگے پر نکلتے۔ تانگے والا پہلے لڑکیوں کے سکول جاتا، انہیں وہاں اتارتا اور پھر لڑکوں کو ان کے سکول پہنچا دیتا۔ چھٹی کے وقت وہ الٹا چکر لگاتا۔ یعنی پہلے لڑکوں کے سکول جاتا اور پھر واپسی پر لڑکیوں کو اپنے ہمراہ لے لیتا۔ محبوب علی یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اتنی چھوٹی عمر میں بھی لڑکیاں لڑکوں کے سکول کا چکر کاٹ کر آئیں یا اُدھر جائیں۔

مگر یہ روایت پرست خاندان اب ایسے حالات سے دوچار ہو چکا تھا جو اس کی اقدار پر براہ راست حملہ آور ہو رہے تھے۔ انسپکٹر محبوب علی عموماً کم بولتے تھے مگر سوچتے بہت تھے۔ وہ مسلسل سوچ و بچار کر رہے تھے کہ حالات کی تبدیلی صرف مرغوب تک محدود نہیں رہے گی بلکہ مزید پیچیدگی اختیار کرے گی۔ سب برادری ایک ہی علاقے میں رہتی تھی، اس ناطے افراد ایک دوسرے کی شرم وحیات، مروت، برادری کے اصول اور رسم و رواج کی پابندی باہم مل کر کرتے تھے۔ اس طرح اقدار کی حفاظت کا کام سرانجام دیتے تھے۔ تقسیم نے معاشرتی اکائیوں کو اطراف و جوانب میں پھیلا دیا تھا۔ قافلے اکٹھے آئے مگر جب پاکستان پہنچے تو ہر کوئی کلیموں اور الاٹ منٹوں کے چکر میں الجھ کر رہ گیا۔ رشتہ داریاں برادریاں پس منظر میں چلی گئیں اور معاشی منفعت اور دنیاوی اغراض مقدم ہو گئیں جہاں کہیں کسی کو فائدہ نظر آیا وہ وہاں چلا گیا۔ کسی نے اچھی زمین کا انتخاب کیا، کوئی کارخانوں کے پیچھے دوڑا تو کوئی دکانوں کی الاٹمنٹ کے لئے دفتروں کے چکر کاٹنے لگا۔ حرص و ہوا نے قومی اخلاق پر ایسا حملہ کیا کہ ہر کوئی اپنی مالی حیثیت کو بہتر بنانے میں لگ گیا اور اس دوڑ میں مہاجر اور مقامی کی بھی کوئی تفریق باقی نہ رہی۔

خاندان میں نفاق کے خدشے خصوصاً انسپکٹر محبوب علی کو اذیت دیتے تھے۔ ''ہمارا خاندان جس امتحان سے گزر رہا ہے، وہ بہت ہی شدید ہے''۔ محبوب علی سوچتا۔ ''کرنل یعقوب علی کا تبادلہ کراچی ہو گیا ہے۔ انسانی خواہشات کس میں نہیں ہوتیں؟ اسے وہاں بنگلہ الاٹ ہو گیا، تو وہ پنجاب واپس نہیں آئے گا۔ مرغوب علی ایک عیسائی لڑکی کو دل دے بیٹھا تھا، جس میں جوانی اور تعلیم کے سوا کوئی خوبی نہیں تھی۔ یہ صورت حال سنجیدہ سوچ بچار کی متقاضی تھی۔ گھر میں ایسے فرد کا اضافہ ہو رہا تھا، جس کے باعث بچوں پر منفی اثرات پڑنے کا احتمال تھا۔ کیا ہمارے بچے بھی آگے چل کر یہی طرز عمل اختیار کریں گے، جو مرغوب نے کیا؟ کیا ہماری لڑکیاں ثریا کے پیچھے پیچھے چلیں گی؟'' یہ خیال آتے ہی محبوب علی کانپ گیا۔

ناشتہ کی میز پر بیٹھے تو مرغوب علی نے سب سے پہلے بات کا آغاز کیا۔ وہ زبیدہ بھابی کو مخاطب کر کے شکوہ کرنے لگا۔ ''آپ نے تو رات کمال ہی کر دیا۔ تانگہ دو چار قدم آگے گئے تو جا لینے دیتیں، آپ نے اس زور سے اس

بے چاری کو بُرا بھلا کہا کہ ہم دونوں دم بخود رہ گئے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ لڑکی بہت ہی عقل مند ثابت ہوئی، ورنہ تانگے والے کے سامنے میرے ساتھ افسوس کرنا شروع کر دیتی۔ میرے پلے کیا رہ جاتا؟''

زبیدہ یعقوب پہلے ہی جلی ہوئی بیٹھی تھی۔ اسے موقعہ ملا تو اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ کہنے لگی۔ ''مرغوب! تمہارا باپ زندہ نہیں۔ محبوب بھائی گھر میں سب سے بڑے اور تمہارے باپ کی جگہ ہیں۔ اگر تمہیں شرم ہوتی تو ایک غیر عورت کو نکاح سے پہلے ان کے سامنے لے کر نہ آتے۔ جس کی تم بات کرتے ہو اور دنیا جہان سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہو، بھلا کیوں کر بولتی؟ جو عورتیں راتوں کو اپنے دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل پڑتی ہیں، اُن کو ایسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ میں تو بھائی محبوب کی وجہ سے رک گئی، ورنہ سب کے سامنے کہتی کہ ذات کی چھپکلی اور شہتیر پر بسیرا''۔

خاندان کے سب افراد مرغوب علی کو نرمی سے سمجھانا چاہتے تھے اور اسے مزید آگے بڑھنے سے منع کرنے کا ارادہ رکھتے تھے مگر یہ کوئی نہ چاہتا تھا کہ گفتگو ناگوار صورت اختیار کرلے۔ مرغوب علی اور زبیدہ یعقوب نے جلد بازی سے کام لے کر ماحول خراب کر دیا۔

سکینہ نے اس موقعے پر پھر ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی اور کہا۔ ''زبیدہ بہن! مرغوب سے ہم ہی نے کہا تھا کہ وہ ثریا کو رات کے کھانے پر لے آئے کیونکہ وہ اس کے ساتھ ریڈیو میں کام کرتی ہے۔ اس تعلق کی بناء پر آگئی، تو کیا ہوا؟ ہم سب مل کر مرغوب علی کو اونچ نیچ سمجھائیں گے تو یہ اُس کا خیال چھوڑ دے گا۔ ابھی کون سی ان دونوں نے شادی کر لی ہے''۔

کرنل یعقوب علی نے مرغوب کو بات کرنے کا موقعہ نہ دیا اور خود بول پڑا۔ کہنے لگا۔ ''میں اس معاملے کو مستقبل کے احتمالات کی روشنی میں دیکھتا ہوں۔ شادی کا منطقی نتیجہ بچے ہیں۔ نیا خاندان بنتا ہے تو نئے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب لڑکے لڑکیوں کے لئے رشتوں کی تلاش ہوتی ہے۔ اگر اُن کے خون میں ملاوٹ ہو تو کوئی اچھا خاندان اُن کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ مرغوب نے ضرور ان احتمالات کو سوچ لیا ہو گا۔ اگر اب تک نہیں سوچا تو اسے وقت ملنا چاہئے کہ وہ سوچ لے۔ ممکن ہے کہ ثریا ہی خاندان کے ماحول میں اپنے آپ کو نہ ڈھال سکے اور جذبات کا دریا اترتے ہی علیحدگی کا مطالبہ کرنے لگے۔ ایسی صورت میں وہ بچوں کو بھی ساتھ لے جائے گی۔ بچوں میں لڑکے بھی ہو سکتے ہیں اور لڑکیاں بھی۔ مجھے علم ہے کہ مشن والے ایسی خواتین و حضرات پر نظر رکھتے ہیں جو عیسائیت چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرلیں، پھر جب بھی انہیں موقعہ ملتا ہے تو وہ انہیں دوبارہ عیسائی بنا لیتے ہیں۔ میرے ایک دوست ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے دوران تعلیم ایک عیسائی ڈانسر خاتون سے شادی کرلی۔ اس میں سے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ کچھ مدت بعد میاں بیوی میں ناچاقی ہوگئی۔ بیوی اپنی بچیوں کو لے کر واپس مشن میں چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے عدالت سے مدد حاصل کرنی چاہی مگر مقدمہ ہار گئے۔ عدالت نے لڑکیوں کو ماں کی سرپرستی میں دے دیا اور اُن کا خرچہ بھی مقرر کر دیا جو ڈاکٹر صاحب عمر بھر ادا کرتے رہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنی لڑکیوں کو ناچ گھروں میں غیر مردوں کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے دیکھا۔ ماں نے انہیں ذریعہ معاش بنا لیا تھا۔ ستم کی بات یہ تھی کہ وہ لڑکیاں ڈاکٹر صاحب کے نام پر قاضی سسٹرز کہلاتی تھیں۔ ڈاکٹر قاضی پرانے وضع دار شخص تھے، یہ برداشت نہ کر سکے۔ پہلے ان پر فالج گرا، ذرا سنبھلے تو کسی نے پھر یہ المیہ یاد دلا دیا، طعنہ دیا۔ قاضی صاحب کی حرکت قلب اسی دم بند ہوگئی اور رشتہ حیات ٹوٹ گیا۔ میں

ٹوٹ گیا۔ مرغوب! ان احتمالات پر بھی غور کرلو۔ تم اپنے آپ کو بہت بڑی مصیبت میں ڈال رہے ہو''۔

مرغوب علی نے زبیدہ محبوب، سکینہ اور یعقوب کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بڑے بھائی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ''بھائی جان! میں آپ سب کو اس سے قبل بھی آگاہ کر چکا ہوں کہ میں اور ثریا نے پکا ارادہ کرلیا ہے کہ ہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو جائیں گے۔ وہ اسلام قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔ باقی جو کچھ یعقوب بھائی کہہ رہے ہیں، صرف احتمال کی حد تک درست ہے، کیونکہ جہاں تک ڈاکٹر قاضی کی قسم کے واقعات کا تعلق ہے کچھ حالتوں میں ایسا ضرور ہوا ہے مگر کچھ شادیاں کامیاب بھی ہوئی ہیں۔ کامیاب شادیوں کی اوسط زیادہ ہے۔ میں نے آپ سے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اپنے جیون ساتھی کا انتخاب کرنا میرا ذاتی استحقاق ہے اور میں اس میں کسی کا دخل برداشت نہیں کرنے کے لئے تیار نہیں''۔

انسپکٹر محبوب علی جواب تک چپ بیٹھے ہوئے تھے، نرمی سے بولے۔ ''ہمیں یقین ہے کہ تمہیں ہمارے ساتھ، ہمارے بچوں اور دیگر افراد خاندان کے ساتھ اتنی محبت ضرور ہے کہ تم ثریا کے لئے ہم سب کو چھوڑ نہیں سکتے''۔

مرغوب علی سمجھ گیا کہ بڑا بھائی پولیس کا تجربہ کار افسر ہے اور باتوں باتوں میں دھمکی دے رہا ہے کہ تمہیں خاندان اور ثریا میں کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ مگر وہ اپنے دل میں پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ ثریا کے لئے خاندان چھوڑ دے گا۔ اسے یقین تھا کہ مزاحمتیں سب وقتی اور جذباتی باتیں ہیں۔ وقت کا مرہم ان زخموں کو بھر دے گا اور چند سال بعد وہ ثریا کے ہمراہ دوبارہ خاندان میں شامل ہو جائے گا۔ اس لئے اس نے کہہ دیا۔

''میں خود خاندان کو چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا لیکن یہ خاندان کی مرضی ہے کہ وہ مجھے ساتھ رکھے یا چھوڑ دے۔ اگر میں آپ کا بھائی ہوں تو آپ سب کو ثریا بھی قبول کرنا ہوگا۔ اگر آپ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں تو پھر میری طرف سے بھی خدا حافظ۔ کم از کم اس وقت تک کے لئے جب تک آپ میرے ساتھ ثریا کو بھی قبول نہ کرلیں''۔

کسی کو امید نہ تھی کہ مرغوب علی اس حد تک جا سکتا ہے لیکن بعض اوقات زندگی کے حقائق جذبات سے زیادہ سخت اور تلخ ہوتے ہیں۔ پسند، ناپسند کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور صرف صورت حالات کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

ناشتہ ختم ہو چکا تھا۔ مرغوب علی اٹھا اور بغیر کچھ مزید کہے سنے، سائیکل لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ گھر کے تمام افراد ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

مرغوب علی اخبار کے دفتر میں پہنچا۔ صبح کے اخبارات کا بنڈل اٹھا کر اپنی میز پر گیا، تاکہ تازہ کالم لکھنے کے لئے موضوع کا انتخاب کر سکے لیکن اسے نہ تو کوئی ایسی خبر ملی جس پر تبصرہ کر سکے، نہ کسی دوسرے اخبار کا کوئی کالم اُسے موضوعِ بحث بنانے کے قابل نظر آیا۔ تقسیم کے مسائل، انتقال آبادی کشمیر، جوناگڑھ، حیدرآباد، ریاستوں کا الحاق، واجبات اور اثاثہ جات کی تقسیم اور اسی قسم کے روزمرہ کے موضوعات سے اخبارات بھرے پڑے تھے۔

اسے ان موضوعات کی اہمیت کا احساس ضرور تھا لیکن وہ ہر روز ایک ہی بات کہنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے دماغ پر ایک ہی مسئلے نے قبضہ کر رکھا تھا جس کی جڑ وہ فرسودہ روایات، شخصی آزادی اور سماجی اقدار، قدامت اور جدیدیت کے تقاضے، نوجوان طبقے کی نفسیاتی الجھنیں اور معاشرتی پس منظر وغیرہ میں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنا ذاتی مسئلہ پوری قوم کا مسئلہ نظر آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک ہی مسئلے کے دو پہلو تھے اور اس مسئلے کی جڑ خاندانی اور ثقافتی ناہموار اقدار میں

تھی۔ اس نے قلم اٹھایا اور اسی موضوع پر ایک بھرپور کالم لکھ مارا، پھر اُسے چیف ایڈیٹر کی منظوری کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر بعد چپڑاسی نے آکر بتایا کہ چیف ایڈیٹر صاحب یاد فرمارہے ہیں۔ وہ اٹھ کر اندر گیا۔ سلام کیا اور پوچھا۔ ''حکم؟'' چیف ایڈیٹر نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا اور اسے بتایا کہ اس کا گزشتہ روز کا کالم قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ اسے کئی لوگوں نے فون کئے ہیں۔ جن میں وکلاء، اساتذہ، جج صاحبان اور معاشرے کے سرکردہ کئی اصحاب شامل ہیں۔ خواتین میں بالخصوص اس کا کالم بہت پسند کیا گیا ہے۔ بعض سوشل کام کرنے والی خواتین نے اس موضوع پر مزید کالم لکھنے کے لئے درخواست کی ہے اور یہ کہ آج کا کالم جو اسی نہج پر لکھا گیا ہے، اسے امید ہے کہ بہت پسند کیا جائے گا۔ یہ کہہ کر چیف ایڈیٹر نے کالم کا مسودہ مرغوب علی کو دے دیا تا کہ وہ اسے کاتب کے حوالے کر دے مگر مرغوب علی نے اسے نظر ثانی کے بہانے روک لیا۔ دراصل وہ یہ مسودہ ثریا کو دکھائے بغیر کاتب کو نہیں دینا چاہتا تھا۔

ثریا صبح سو کر اٹھی تو اس کا باپ ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ گو بوڑھا کمپاؤنڈر ہار مان چکا تھا لیکن اس کی پدرانہ محبت اور شفقت کے تقاضے اسے اکلوتی اولاد کو ہاتھ سے کھو دینے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ معاشرتی مصلحتیں اس بات کی متقاضی تھیں کہ لڑکی کو ایک دفعہ اور سمجھا کر دیکھ لے مگر لڑکی کی ضد اور ہٹ دھرمی کے پیش نظر وہ اس پر بھی تیار ہو چکا تھا کہ لڑکی اپنی ضد پوری کر لے۔ اگر اس کا تجربہ کامیاب ہو گیا تو موج کرے ورنہ کئی دوسری لڑکیوں کی طرح مشن کے دامن میں دوبارہ پناہ لے لے گی۔

اس نے شفقت اور پیار سے جذبوں کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹی جو قدم تم اٹھا رہی ہو، مجھے یقین ہے ۔ وہ غلط ہے۔ آج جذبات کے جوش میں مرغوب اور تم دونوں حقائق کی طرف سے آنکھ بند رکھے ہوئے ہو۔ عورت جب شباب کی سیڑھی سے اترنے لگتی ہے تو اس میں کوئی کشش باقی نہیں رہ سکتی اور وہ وقت عورت کی زندگی میں بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ دوسری شادی اور پہلی بیوی کو طلاق دینے کے واقعات بالعموم اس دور میں ہوتے ہیں۔ جب عورت اور مرد چالیس اور پچاس سال کی عمر کے درمیان ہوتے ہیں۔ اس دور میں عورت میں جسمانی کشش باقی نہیں رہتی اور مرد ابھی جوان ہوتا ہے۔ عورت مرد کی بجائے بچوں کا خیال زیادہ رکھتی ہے اور مرد اس سے پہلی سی محبت کا متقاضی ہوتا ہے۔ وہ وقت عورت کی زندگی میں بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ وہ نہ تو گھر چھوڑ سکتی ہے اور نہ خاوند کو مطمئن کر سکتی ہے۔ بیٹی! حقائق کا تجزیہ کرو۔ اپنے مستقبل کے متعلق سوچو اور حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرو۔ ابھی وقت ہے، وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر سوائے غم، پریشانی اور دکھ کے کچھ بھی باقی نہ رہے گا''۔

ثریا نے کہا۔ ''ڈیڈی! شادی ایک دو طرفہ معاہدہ ہے۔ ایک فریق اگر معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو دوسرا فریق اسے ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا ہے۔ رہی معاشی ضروریات کی بات تو ڈیڈی! میں آپ کی شکرگزار ہوں کہ آپ نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلائی۔ میں کبھی بھی مرغوب پر بوجھ نہ بنوں گی اور خود کما کر کھاؤں گی۔ آپ میرے لئے دعا کرتے رہیں اور اپنی شفقت سے محروم نہ کریں۔ رہا مسئلہ کہ مشن والوں کا ردعمل کیا ہوگا اور وہ مجھے یا آپ کو کیا کہیں گے؟ تو یہ واضح ہے کہ آپ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ قصور صرف میرا ہے اور میں تو مشن اور اس کے کارکنوں سے اپنا تعلق ہمیشہ کے لئے ختم کر رہی ہوں۔ لہٰذا مجھے اُن کی پروا نہیں اور یہی بات تو یہ ہے کہ مجھے ان لوگوں کی تعلیمات سے بھی کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی''۔

یہ کہہ کر ثریا اٹھی اور حسب سابق ڈیڈی کو سلام ر

کے گھر سے باہر نکل گئی۔ بوڑھا لمبا ڈنڈر چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ گیا۔ گھر سے نکلی تو ثریا کو زبیدہ یعقوب کے فقرات یاد آگئے جو اس نے رات اسے گھر سے الوداع کرتے وقت کہے تھے۔ وہ سمجھتی تھی کہ زبیدہ یعقوب نے جان بوجھ کر اسے سنانے کے لئے سب کچھ کہا تھا۔ اس میں مرغوب کا قصور ہو نہ ہو مگر اسے ان فقرات کے لئے معافی مانگنا ہوگی۔ وہ اسے ایسے گھر میں کیوں لے گیا جہاں یہ کچھ پیش آ سکتا تھا؟ پھر اُسے وہی پرانا خیال آیا کہ اگر ان تلخ الفاظ کا بدلہ لینا ہے تو اسے خاندان کے اندر داخل ہونا ہوگا اور ہمت سے کام لینا ہو گا۔ یہ مخالفت کوئی غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ انہی خیالات میں غرق پیدل چلتی ہوئی مرغوب کے دفتر پہنچ گئی۔

معافی مانگنے پر مرغوب علی پہلے ہی تیار بیٹھا تھا۔ اس نے اتنا انتظار بھی نہ کیا کہ ثریا کوئی شکایت کرتی۔ وہ ابھی بیٹھی بھی نہ تھی کہ مرغوب نے رات کے ناخوشگوار واقعے پر معافی مانگ لی۔ ثریا مسکرا دی۔ مرغوب نے دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے کالم کا مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا۔ ثریا نے دلچسپی سے مواد پڑھا اور تبصرہ کیا۔ ''کالم نگاروں کا یہ عام وطیرہ ہے کہ وہ قارئین کے لئے بہت کچھ لکھتے ہیں مگر اُن کا اپنا عمومی عمل اپنی گزارشات سے قطعی مختلف ہوتا ہے''۔ مرغوب علی ثریا کی بھرپور طنز سمجھ کر مسکرا دیا اور بولا۔ ''یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ میرے عمل اور قول میں کتنی ہم آہنگی رہتی ہے اور کس قدر تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اس موقعے پر میں جو کچھ بھی کہوں گا، وہ تکلف ہی معلوم ہوگا''۔

یہ گلے شکوے ہو چکے تو دونوں نے حسب معمول باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ دونوں آہستہ آہستہ پیدل چلتے ہوئے باغ جناح پہنچ گئے۔ اس دوران انہوں نے ایک دوسرے کو اس طنزیہ لہجوں میں اس گفتگو کا خلاصہ سنایا جو ان سے اپنے اپنے گھر میں ناشتے کی میز پر کی گئی تھی۔ پھر وہ

دلیل: اپنی آواز کی بجائے اپنی دلیل کو بلند کرو کیونکہ پھول بارش کے برسنے سے کھلتے ہیں، بادل کے گرجنے سے نہیں۔ (نسیم سکینہ صدف)

جوابات بھی فخریہ دہرائے گئے جو ان دونوں نے دیئے تھے۔

ثریا نے آئندہ پروگرام کے متعلق دریافت کیا تو مرغوب علی نے فوری جواب دیا۔ ''اب تو سوچنے اور انتظار کرنے کو کچھ باقی نہیں رہا۔ زندگی کے حقائق سامنے آ چکے ہیں، ان سے گریز کا موقعہ نہیں۔ مکان تلاش کیا جائے اسے مناسب سامان سے آراستہ کیا جائے۔ تم اسلام قبول کرو، اس کے ساتھ ہی نکاح کی رسم ادا کی جائے اور نئی زندگی کا آغاز کیا جائے''۔

ثریا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب درست، مگر نئی زندگی کے آغاز پر رقم کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ میرے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ ایک ماہ کا کرایہ مکان اور ضروری خرچ نکال کر کچھ سامان بھی خریدا جا سکتا ہے۔ وہ میں ساتھ لے آئی ہوں۔ تم اسے اپنے پاس رکھ لو''۔ مرغوب علی نے اسے اپنی پونجی بھی بتائی۔ دونوں کا سرمایہ مل کر اتنا بن جاتا تھا کہ وہ نیا گھر چلا سکیں۔

پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ ایم اے انگریزی بلینک چیک کا درجہ رکھتا تھا۔ اتفاق سے دونوں ایم اے انگلش تھے۔ اگر ملازمت کرنا چاہتے تو دونوں کے لئے وسیع میدان تھا۔ مرغوب علی مقابلے کے امتحان میں شامل ہو سکتا تھا۔ ثریا کسی زنانہ کالج میں نوکری کر سکتی تھی۔ اس لئے مالی مشکلات کا کوئی ڈر نہیں تھا۔

دونوں ہوٹل سے اٹھ کر محکمہ بحالیات میں گئے۔ مرغوب علی مہاجر تھا، محکمہ بحالیات میں اس کے جاننے والے موجود تھے۔ معمولی کوشش سے اسے ایسا مکان مل گیا جس میں تھوڑا بہت ساز و سامان بھی موجود تھا۔ جلد

مکان کی چابی بھی مل گئی۔ عارضی الاٹمنٹ ہوئی تھی۔ دو دن بعد جمعہ تھا، جو زندگی کی اگلی منزل اختیار کرنے کے لئے موزوں سمجھا گیا۔

باب چہارم......نکاح کا بندھن

رات کو ریڈیو ڈیوٹی کے بعد مرغوب علی گھر پہنچا تو اس نے اعلان کر دیا کہ وہ مکان الاٹ کروا چکا ہے اور وہ کل سے اس میں منتقل ہو جائے گا۔ انسپکٹر چوہدری محبوب علی نے صرف اسی قدر کہا کہ جان برادر! جہاں رہو خوش رہو۔ یعقوب اور زبیدہ یعقوب نے کچھ نہ کہا۔ سکینہ محبوب نے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ جب کبھی ہم یاد آئیں تو بچوں کو دیکھنے کے لئے آ جایا کرنا۔ کرنل یعقوب علی نے کراچی کے لئے اپنی نشست مخصوص کرالی تھی۔ وہ جمعرات کو شام کی گاڑی سے وہاں جا رہا تھا۔

انسپکٹر محبوب علی اپنے بستر پر لیٹا رات گئے تک سوچ رہا تھا کہ بڑا بھائی ہونے کے ناطے ان کے ذمے چند فرائض تھے۔ مرغوب علی کی شادی کرانا بھی اس کا فرض تھا مگر چھوٹے بھائی نے اس کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ اس کی تعلیم و تربیت بھی اس کا فرض تھا۔ تعلیم کا فرض ادا ہو گیا مگر تربیت کے معاملے میں شاید اس سے کہیں چوک ہوگئی ہے۔ وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا اور بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

اگلی صبح ناشتہ حسب دستور سب نے اکٹھے کیا۔ اس روز خلاف معمول سب خاموش تھے۔ مرغوب علی کا گھر میں یہ آخری دن تھا۔ انسپکٹر محبوب علی کے چہرے پر پریشانی اور بے اطمینانی کی علامات واضح تھیں۔ کرنل یعقوب علی بھی بھائی کے جذبات سے آگاہ تھا اور مرغوب علی کے رویے پر شاکی بھی۔ وہ فوجی افسر تھا، نظم وضبط کے فقدان کے ایسے تصور کو بھی گناہ سمجھتا تھا، جس کا مظاہرہ مرغوب علی نے کیا تھا۔ خاندانی روایات اور اقدار فرسودہ سہی مگر بڑے بھائیوں کا ادب، صلہ رحمی اور ایک دوسرے کی رائے کے احترام کا بھی آخر کوئی مقام تھا۔ مرغوب علی تو انگریزوں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ کیا اعلیٰ تعلیم یہی سکھاتی ہے؟ آئندہ چل کر کیا ہوگا؟ وہ سوچتا رہا۔ ناشتے پر مستورات بھی خلاف معمول خاموش ہی رہیں۔

مرغوب علی نے ناشتہ جلد ختم کر لیا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پاس کوئی خاص سامان نہ تھا۔ دو چار جوڑے کپڑوں کے، جو پہلے ہی سوٹ کیس میں بند تھے، وہ ہمراہ لے کر نکل آیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے رسماً سب کو خدا حافظ کہا۔ پھر سوٹ کیس سائیکل کے پیچھے باندھا اور سوئے منزل چل پڑا۔ احساس تک نہ ہوا کہ جن لوگوں کو چھوڑ کر جا رہا تھا، ان کے اس پر کیا حقوق ہیں اور اس وقت ان کے جذبات و احساسات کیا ہیں۔ اس نے گویا بڑے سکون، اطمینان، حوصلے اور جرأت سے فردا کی طرف قدم آگے بڑھائے تھے۔ درحقیقت اس کی لغت میں پیچھے مڑ کر دیکھنے کا کوئی لفظ موجود نہ تھا۔

وہ پہلے اپنے نئے مکان پر گیا، سوٹ کیس اندر رکھا، پھر اخبار کے دفتر روانہ ہو گیا۔

اس نے کالم نوجوانوں میں خود اعتمادی، عزم و حوصلہ اور مقابلے اور مسابقے کے موضوع پر لکھا۔ عنوان کے طور پر قائداعظمؒ کا مشہور مقولہ "فضا کی وسعتوں میں خالی جگہ کی کمی نہیں" استعمال کیا۔

ثریا آئی تو اس دم اُس کا انداز مختلف تھا۔ صبح اس کے باپ نے نہ تو ناشتے کی میز پر اس کا انتظار کیا تھا اور نہ ہی کچھ سمجھانے کا تکلف کیا تھا۔ البتہ کام پر جاتے ہوئے اس کے قدم ٹھیک طرح سے نہیں پڑ رہے تھے لیکن ثریا کا ذہن مستقبل کے جن سنہرے خوابوں میں منہمک تھا، وہاں بوڑھے باپ کے قدموں کی طرف دھیان دینے کی مطلقاً کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔

ثریا اور مرغوب علی میں جو گفتگو ہوئی اس میں نہ تو اس کا اخباری کالم شامل تھا اور نہ گھر والوں کا ذکر۔ اب وہ ہونے والے میاں بیوی کی طرح گھر چلانے، کھانا پکانے سامان پورا کرنے کی تفصیلات طے کرتے رہے۔ انہوں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ثریا بطور لیکچرر نوکری کرلے گی اور مرغوب یکسوئی سے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرے گا۔ پاکستان بنے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے اور تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے ہر محکمے میں خالی آسامیاں منتظر تھیں۔

ریڈیو کی ڈیوٹی سے فارغ ہونے کے بعد مرغوب نے کہا کہ وہ آج نئے مکان میں رات گزارنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ''ثریا کیا خیال ہے؟'' لیکن ثریا نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جب تک اگلے دن میں ہونے والی رسمی کارروائی پوری نہ ہو جائے وہ اس انداز میں سوچے بھی نہ۔ چنانچہ دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ مرغوب علی اپنے نئے گھر کی طرف چلا اور ثریا اپنے باپ کے گھر کی طرف چل پڑی۔

مرغوب علی کی پہلی رات تھی جو اس نے اپنے خاندان سے باہر اکیلے گزاری۔ گاؤں میں تھا تو ہائی سکول گھر کے پاس تھا، کالج میں داخل ہوا تو بھائی کے ساتھ رہا۔ رات گو مشکل تھی مگر مستقبل اور ثریا کے خیالات نے اسے تنہائی کا زیادہ احساس نہ ہونے دیا۔

صبح ہوئی تو ناشتے کے لئے اسے دکان پر جانا پڑا۔ آج بھابی پاس نہیں تھی کہ اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اس کے لئے گرم گرم پراٹھے تیار کر رکھتی۔ دکان پر ناشتہ کیا تو اس نے سوچا کہ دفتر جانے میں تھوڑا سا وقت باقی ہے۔ کیوں نہ اس سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔ مسجد میں گیا۔ مولوی صاحب بچوں کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ ان سے ثریا کے اسلام قبول کرنے کی خواہش کا اظہار کیا اور مدد کی درخواست کی۔ مولوی صاحب نے کہا۔ ''مجھے کسی غیر مسلم کو دائرۂ اسلام میں داخل کرنے میں خوشی ہوتی مگر مناسب ہوگا کہ آپ لڑکی کے کسی مجسٹریٹ کے سامنے بیان کروالیں''۔ مولوی صاحب نے ایک دو معززین نا۔ کو بلوا کر انہیں مرغوب علی سے متعارف بھی کروادیا تاکہ ضرورت پڑنے پر وہ اس کی مدد کرسکیں۔ ایک وکیل سے بھی ملاقات کروائی، جس نے کہا کہ جمعہ نصف یوم ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہر حال میں دس گیارہ بجے کے درمیان دونوں لڑکی اور لڑکا کچہری پہنچ جائیں، باقی کام وہ کرلے گا۔

اس روز بارہ بجے تک یہ سارا کام ہوگیا اور نماز جمعہ کے بعد نکاح کی رسم بھی ادا ہوگئی۔ ثریا کا اسلامی نام عارفہ خاتون رکھا گیا۔ یہ نام پہلے ہی ثریا اور مرغوب علی کے درمیان طے ہو چکا تھا۔

باب پنجم ...... وقت کا پہیہ

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھومتا رہا اور واقعات تیزی سے رُونما ہوتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کچھ کا کچھ ہوگیا۔

پاکستان کا قیام طالع آزما لوگوں کی جنت ثابت ہوا۔ ابھی شہیدوں کا خون خشک بھی نہ ہوا تھا کہ ان کے وارثوں نے ان کی ہڈیوں کی بنیاد پر اپنے خوابوں کے محل استوار کرنے شروع کر دیئے۔ کسی نے بھی بھول کر بھی یاد نہ کیا کہ کتنی عورتیں اور مرد پاکستان کی خاطر جان کا نذرانہ دے کر خاک و خون کا خمیر بنے، کتنی بیٹیاں اغوا ہوئیں، کتنے بچے ظالموں کی تلواروں کرپانوں اور برچھیوں کی نوکوں کا ہدف بنے اور کتنی مسجدیں، خانقاہیں، مزار، تعلیمی ادارے اور دینی یادگاریں بے حرمتی کا شکار رہیں۔ ہر ایک کو صرف ایک ہی فکر تھی کہ فلاں فلاں کو یہ فائدہ پہنچا ہے اور فلاں فلاں اس فائدے کے حصول کی کوشش میں سرگرداں ہیں اور ہم آگے بڑھ جانے کے باوجود فلاں

در فلاں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ فلاں شہر صنعتی اور تجارتی نقطہ سے مفید رہے گا اور فلاں فلاں ضلعے کی زمین زیادہ زرخیز اور قیمتی ہے۔ یہ ایک وبا تھی جس سے کوئی بھی نہ بچ سکا۔ انسپکٹر محبوب علی بھی اس بارے میں سوچتا رہتا تھا مگر وہ ایک متوازن ذہن، اونچے کردار اور دلکش شخصیت کا مالک تھا۔ اسے اس حقیقت کا بھرپور احساس تھا کہ اس کا خاندان شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا۔ کرنل یعقوب اپنی بیگم کے اثر میں تھا، جبکہ مرغوب علی نے اپنی مرضی سے شادی کر کے خاندان سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ جائداد کے سارے کلیم ابھی تک داخل نہ ہو پائے تھے بلکہ اس سلسلے میں بے انتہا کام باقی تھا۔

یہ خاندان ضلع ہوشیار پور کے معزز خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ ٹانڈہ اگرچہ گاؤں کہلاتا تھا مگر تحصیل ہیڈ کوارٹر ہونے کی وجہ سے قصبات میں شمار ہوتا تھا۔ میونسپل کمیٹی بھی تھی، اس لئے ٹانڈے میں چھوڑی ہوئی جائداد کو شہری جائداد شمار کیا گیا تھا۔ اس خاندان کی وسیع زمینیں تھیں، حویلیاں تھیں، دکانیں تھیں جو کرائے پر لگی ہوئی تھیں، کئی ہزار روپیہ نقد تھا جو بینکوں میں رہ گیا۔ ابھی تک ان سب اثاثہ جات کے حساب اور ثبوت بھی فراہم نہ ہوئے تھے کہ خاندان میں انتشار پیدا ہو گیا۔

انسپکٹر محبوب علی نے سارا درد اپنے دل میں سمیٹا۔ بھائی کی گستاخی کو معاف کرنا ممکن نہ تھا مگر اس نے خاندانی بندھنوں کو اتنا ڈھیلا چھوڑ دینا بھی مناسب نہ سمجھا کہ اہل خاندان لوگوں کے لئے وجہ عبرت اور سامان تماشا بنیں۔ اس نے ایک قابل اعتبار ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور کہا کہ صبح صبح فلاں اخبار کے دفتر میں چلے جاؤ، وہاں مرغوب علی ہوگا، جسے تم پہچانتے ہو، اسے کہو کہ آج شام وہ اپنی بیوی کے ساتھ یا اکیلا، جس طرح مناسب سمجھے، مجھے گھر ملے۔

ہیڈ کانسٹیبل اسی وقت روانہ ہو گیا۔ مرغوب علی ابھی اخبار کے دفتر میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اسے بڑے بھائی کا پیغام مل گیا۔ مرغوب علی نے سر تسلیم خم کیا، کہا کہ وہ ریڈیو سٹیشن جانے سے پہلے گھر سے ہوتا جائے گا۔ اگرچہ وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ شاید بھائی جان اسے برا بھلا کہنے کے لئے اور عارفہ کو چھوڑ دینے کے لئے کہیں گے۔ مگر اس نے خیال کیا کہ چلے جانے میں کیا حرج ہے؟ اس نے البتہ عارفہ کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا کہ کہیں بات بڑھ ہی نہ جائے۔

شام چار بجے کے قریب مرغوب علی بڑے بھائی محبوب علی کے گھر پہنچ گیا جو اسی دم دفتر سے گھر لوٹا تھا اور ڈی ایس پی کی وردی میں ملبوس تھا۔ مرغوب علی نے بے ساختہ بغلگیر ہو کر بھائی کو مبارکباد دی۔

بھائی سے سلام دعا ہوئی، ڈی ایس پی محبوب کہنے لگا۔ ''مرغوب! جو کچھ تم نے کیا ہے اس سے خاندان کے افراد کو صدمہ پہنچا ہے۔ مگر پھر بھی وہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے، ہم تمہیں اس معاملے کے منطقی نتائج سے آگاہ کرتے رہے مگر جوانی کے جذبات نے تمہیں سوچنے کا موقعہ نہ دیا۔ خیر اب وقت گزر گیا ہے، مستقبل میں کیا ہو گا؟ یہ صرف خدا کو معلوم ہے لیکن ناخنوں سے ماس جدا نہیں ہو سکتا۔ ہم ایک دوسرے سے ملیں یا نہ ملیں، باپ دادا کا نام مشترک ہی رہے گا۔

تمہیں معلوم ہے کہ ہم مشرقی پنجاب میں بہت سی جائداد چھوڑ کر آئے ہیں، جو زرعی بھی ہے اور سکنی بھی۔ اب اس جائداد کے کلیم داخل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ تمہیں یقیناً معلوم ہے کہ بہت سی جائدادیں، جو والد مرحوم نے اور تایا جی نے میرے نام کروا دی تھیں، سب برابر کے حصہ دار ہیں۔ تایا مرحوم کے ہاں کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے انہوں نے مصلحتاً اپنی سب جائداد میرے نام ہبہ کر دی تھی۔ مختصر یہ کہ اب تم بھی اپنے حصے کے کلیم کا مختارنامہ مجھے لکھ دو، تاکہ جائداد کے کلیم داخل کر دیئے

جائیں۔ اسی قسم کے مختارنامے کے لئے میں یعقوب سے بھی کہہ رہا ہوں۔ اس کا خط آیا ہے کہ ایک دو روز میں وہ بھی بھیج دے گا۔ تصفیہ ہو جائے تو جائداد تقسیم کر دی جائے گی''۔

مرغوب علی کو اپنے بڑے بھائی کے خلوص اور نیک نیتی پر کبھی بھی شبہ نہیں تھا، اس لئے اس نے بغیر چوں و چراں کے کہا۔ ''کل شام تک میری طرف سے بیان حلفی اور مختارنامہ مجسٹریٹ درجہ اوّل اور ادھر کمشنر سے تصدیق شدہ، آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا بلکہ کسی وقت آ کر خود دے جاؤں گا۔ جہاں تک جائداد کی تقسیم کا سوال ہے تو امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی، کیوں کہ میں بھی کما رہا ہوں، عارفہ نے بھی کالج میں ملازمت کر لی ہے اور ہم اپنا وقت بڑی خوش اسلوبی سے گزار رہے ہیں۔ موروثی جائداد اکٹھی ہی رہے تو مجھے خوشی ہو گی''۔ یہ کہہ کر وہ ریڈیو سٹیشن چلا گیا۔

رات اس نے بھائی کے ساتھ ملاقات کا حال عارفہ سے بیان کیا تو عارفہ نے کہا۔ ''اگر تم سمجھتے ہو کہ فی الحال جائداد تقسیم نہ ہو تو مضائقہ نہیں۔ مگر ایک بات سوچ لینا کہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا''۔ مرغوب علی دوسرے دن حسب وعدہ کاغذات بعد از تکمیل بھائی کے گھر پہنچا آیا۔ دو چار روز میں کرنل یعقوب نے بھی مختارنامہ مصدقہ معہ بیان حلفی بڑے بھائی کو بذریعہ رجسٹری ارسال کر دیا۔ اس طرح خاندانی جائداد کا مسئلہ وقتی طور پر طے ہو گیا۔

مرغوب علی نے جلد ہی مقابلے کا امتحان دیا اور سی ایس پی میں منتخب ہو گیا۔ تربیت کے بعد اس کی خدمات بطور سب ڈویژنل مجسٹریٹ، حکومت مشرقی پاکستان کے حوالے کر دی گئیں، جہاں پر وہ چھ سات سال بعد ڈپٹی کمشنر ہو گیا۔ 1960ء کے قریب وہ ترقی پا کر بطور جائنٹ سیکرٹری مرکزی حکومت میں آ گیا۔ یہاں پہلے تو اسے وزارت صنعت میں لگایا گیا مگر کچھ عرصے بعد اسے وزارت تجارت میں تبدیل کر دیا گیا۔

چوہدری محبوب علی جلد ہی ایس پی ہو گیا۔ مغربی پاکستان کی وحدت وجود میں تو وہ ڈی آئی جی ہو کر بلوچستان چلا گیا۔ اس کو نیک نامی، فرض شناسی اور ذاتی کردار کی بلندی کی وجہ سے مرکزی حکومت نے نشان امتیاز بھی دیا مگر مرغوب علی کی ملازمت اس طرح بے داغ نہ تھی۔ مشرقی پاکستان میں بھی اس کی شہرت اچھی نہ تھی۔ وہ ان افسران میں سے تھا جو خریدے جا سکتے ہیں اور ان کی قیمت مقرر ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسے افسر بہت جابر، کارکن اور محنتی نظر آتے ہیں مگر یہ صفات ان کی حرص و آز اور جلب زر کی خواہشات کے تابع ہوتی ہیں۔ مرکزی حکومت میں آیا تو یہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان مرحوم کی صدارت کا زمانہ تھا۔ غیر ملکی امداد افراط سے آ رہی تھی۔ تعمیر و ترقی اور صنعت و تجارت زوروں پر تھی۔ مرغوب علی کو ہاتھ رنگنے کا موقعہ جو ملا تو اس نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہ رہنے دی۔

عارفہ کا کردار پہلے پر دہلا تھا۔ معاشرے میں اہمیت ملنے پر وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ شروع میں اسی نے مرغوب علی کو ناجائز دولت کمانے پر ابھارا۔ اس نے لیکچررشپ چھوڑ دی اور پس پردہ خاوند کی ذمہ داریوں میں شریک ہو گئی۔ اپنی مخصوص عادات کی وجہ سے اس نے اعلیٰ بیوروکریسی کے حلقوں میں رسم و راہ پیدا کر لی اور کسی حد تک اثر و رسوخ بھی حاصل کر لیا۔ وہ پارٹیوں کی جان سمجھی جانے لگی اور ایسی پارٹیوں میں بھی شریک ہوتی جن میں مرغوب علی موجود نہ ہوتا۔ وہ خاوند سے کہیں زیادہ شراب کی رسیا تھی۔ بیوی کی رہنمائی تھی اور کچھ اس کی اپنی افتاد طبع، مرغوب علی نے عوام الناس اور قومی خزانے کو جی بھر کر لوٹا۔ اس افسر کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ زمانہ شباب میں یہ شخص مہاجر کیمپوں میں خدمات سرانجام دیا

کرتا تھا اور حد درجہ تمنا رکھتا تھا کہ نوزائیدہ مملکت جلد از جلد اپنا وجود مستحکم کرلے۔

کوئی نہ سمجھ پایا کہ قوم کی اخلاقی گراوٹ میں یہ منفی تبدیلی کیونکر شروع ہوئی اور وہ دل جو قیام پاکستان کے وقت مملکت کے ساتھ دھڑکتے تھے، بعدازاں کیونکر پتھر بنتے گئے۔

فاطمہ جناح نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ کرپشن آسمانی برفباری کی طرح ہوتی ہے۔ یہ برف پہلے پہاڑی چوٹیوں پر گرتی ہے، پھر پہاڑوں کے دامن تک جا پہنچتی ہے اور ارض کو حدِ نظر تک اپنے رنگ میں ڈھال لیتی ہے۔

مرغوب علی کی شہرت بُری طرح داغدار ہوئی۔ جہاں دھواں اٹھے وہاں نار ضرور موجود ہوتی ہے۔ انگلیاں اس کی جانب اٹھنے لگیں۔ چند بار تحقیقات تک بھی نوبت آئی مگر حکومتی وقار آڑے آ گیا۔ کچھ اس کی ذہانت اور طریق کار میں ہوشیاری تھی جو وہ بچ نکلا۔ اسے رشوت دینے کا سلیقہ بھی آ گیا تھا۔ عارفہ اپنے اطوار سے اس کی مدد کر دیتی۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کے ساتھی اسے شائی لاک، یہودی، میر جعفر اور میر صادق کے القاب سے یاد کرنے لگے۔ کہتے ہیں کہ سو دن چور کے پھر ایک دن شاہ کا۔ آخر ایک روز وہ ایسا نرغے میں آیا کہ اس کی ملازمت ختم ہوگئی اور پنشن بھی جاتی رہی۔ اسی دور میں عارفہ ایک شب کسی ہوٹل میں شراب پیتی ہوئی ساتھیوں سمیت پکڑی گئی۔ پولیس کا اچانک چھاپہ نیو ایئر نائٹ کے موقعہ پر پڑا تھا۔ تمام احوال اخباروں میں چھپ گیا۔

ان دنوں مرغوب علی کے اپنے دونوں بھائیوں سے رابطہ ہوئے مگر شرمندگی کے مارے وہ کسی سے نہ مل سکا۔ ہمیشہ ملاقاتوں سے پہلوتہی کرتا رہا۔ پھر کچھ وقت کے لئے ملک سے باہر چلا گیا۔ بیوی کی بدنامی کے باعث بھی وہ منظر سے غائب رہنا چاہتا تھا۔ اسی مدت کے دوران دو المناک واقعات ہوئے جن کی وجہ سے خاندان لرز کر رہ گیا۔

بڑے بھائی محبوب علی پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ بستر کی زینت بن گیا جبکہ منجھلا بھائی بریگیڈیئر یعقوب علی ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہوگیا۔ اس کی کار کسی ٹرک سے ٹکرا گئی تھی۔ اس المیے میں زبیدہ یعقوب بھی انتقال کر گئی۔ بیٹا کچھ عرصہ ہسپتال میں پڑا رہا مگر جاں بر نہ ہو سکا۔ بھرے خاندان میں صرف ایک بیٹی زندہ بچ سکی، جسے تایا نے اپنی پناہ میں لے لیا۔

مرغوب علی کو اپنی برطرفی کا زیادہ غم نہیں تھا، نہ ہی اس بات کا کوئی قلق تھا کہ اس نے اپنے اس وطن سے غداری کی تھی جس کے چاہنے والوں کا لہو اس نے اپنی آنکھوں سے بہتے دیکھا تھا اور جن کے بدن سے نکلتے ہوئے لہو پر اس نے حب الوطنی کے پھاہے رکھنے کی قسم کھائی تھی۔

اس کے پاس حرام کا پیسہ بے شمار تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس قسم کے مال و زر میں برکت نہیں ہوتی اور یہ اولاد میں نفاق اور فساد کا باعث بھی بنتا ہے۔ کبھی یہ دگنی رفتار سے نکل جاتا ہے۔ مرغوب علی جلد ہی مالی خدشات میں گھر گیا۔ اس نے اپنے خفیہ بینک اکاؤنٹ کا جائزہ لیا جس میں اس کا بھائی چوہدری محبوب علی مشترکہ جائداد پر منافع بصورت زر منتقل کیا کرتا تھا۔ اکاؤنٹ میں خاصی رقم موجود تھی مگر خدشات کے پہلو بھی کم نہیں تھے۔ جب سے اس کے بھائی پر فالج کا حملہ ہوا تھا، اکاؤنٹ میں مزید منافع جمع نہیں کرایا گیا تھا۔ ایسے میں مرغوب علی کا ماتھا ٹھنکنا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے معاملہ ذہن میں رکھ لیا اور موجود پیسے کے مصرف میں مشغول ہوگیا۔

اس نے ایک پوش علاقے میں مکان خریدا اور بیوی بچوں کے ساتھ اس میں منتقل ہوگیا۔ اب وہ نئی

کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ صنعت کار اور تاجر جو بھی اس کے گن گاتے تھے، اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور سرمایہ بھی بہتیرا میسر آ جائے گا مگر یہ دنیا تو چڑھتے سورج کی پوجا کرتی ہے۔ وہ چاہنے والوں کا انتظار کرتا رہا مگر جان پہچان والے اکثر لوگوں نے اس سے آنکھیں پھیر لیں۔

مرغوب علی اولاد نرینہ سے محروم رہا تھا۔ اس کے ہاں تین بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔ والدین کی اشکال اور نقوش برے نہیں تھے مگر تینوں بیٹیاں کالی بجنگ تھیں۔ ان کے ماتھے چھوٹے اور ناکیں چپٹی تھیں۔ چہرے بھی قد وقامت کے حساب سے غیر متوازن تھے۔ حرام کے پیسے سے اولاد کی مناسب تربیت نہیں ہوتی۔ وہ تعلیم میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکیں۔ رقص و موسیقی میں البتہ انہوں نے سوجھ بوجھ پیدا کر لی۔

ثریا کا ارادہ تھا کہ ٹی وی ڈرامہ پروڈکشنز کے لئے کمپنی بنالی جائے اور اس کا نظم ونسق وہ خود سنبھال لے۔ مرغوب علی شروع میں تو منصوبے کی مخالفت کرتا رہا مگر بعد میں اس پر قائل ہوگیا۔ اب وہ خاندانی اقدار پر زیادہ نہیں سوچتا تھا۔

خاندانی جائداد میں سے اپنا حصہ وصول کرنے وہ چوہدری محبوب علی کے گھر پہنچا تو وہاں کے معاملات دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔

چوہدری محبوب علی جو صاحب فراش تھا، ایک الگ تھلگ کمرے میں پڑا تھا۔ گو اس کی دیکھ بھال پر گھریلو ملازم مامور تھے مگر وہ بہت ناتواں ہو چکا تھا بلکہ زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔ نہ تو وہ بول سکتا تھا اور نہ ہی جسمانی حرکت کرسکتا تھا۔ مرغوب علی نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا تو اسے وہاں فقط مایوسی ڈیرے ڈالے نظر آئی۔

بڑے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اسے شدید دھچکا لگا۔

معلوم ہوا کہ تمام خاندانی جائداد پر چوہدری محبوب علی کا بڑا صاحبزادہ جواد علی قابض ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں وہ متعلقہ کاغذات میں بھی ہیرا پھیری کر چکا تھا۔ کئی ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو چکی تھیں جن سے نبرد آزما ہونا کار دشوار دکھائی دیتا تھا۔ مرغوب علی کے پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ واحد شخص تھا جو یوں متاثر ہوا تھا کیونکہ بریگیڈیئر مرحوم یعقوب علی کی بیٹی اب جواد علی کی بیوی تھی اور اس طور وہاں جائداد کا جھگڑا نمٹ چکا تھا۔

جلد ہی ایک ایسے خاندان کے بیچ عدالتی جنگ کا آغاز ہوگیا جو کبھی باہمی بھروسوں پر فخر کیا کرتا تھا اور جس کے افراد ایک دوسرے کے درد آشنا سمجھے جایا کرتے تھے۔ تب معاشرے میں نفسانفسی کا عالم نہیں تھا اور انسانی اقدار کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔

ثریا کی پروڈکشن کمپنی تو چل نکلی مگر اس کی بیٹیوں کی تربیت کا معیار کھل کر سامنے آ گیا۔ کئی ایسے واقعات ہوئے جن کے باعث خاندان پر بدنامی کے داغ لگتے گئے۔

مرغوب علی نے لاء کالج میں داخلہ لے لیا اور قانون کی تعلیم میں ڈگری لینے کی جستجو شروع کر دی مگر اس کی یہ تمنا تکمیل کے مراحل سے ہمکنار ہو سکی۔ آخرکار وہ اولاد اور بیوی کا دست نگر بن کر رہ گیا۔ کبھی کسی ڈرامے میں اداکاری کے جوہر دکھانے کی کوشش کرتا تو اس کا ماضی اسے ستانے لگتا۔

اس خاندان اور قوم کا خدا ہی حافظ ہے جس کے احساسات مرنے لگیں اور احساس زیاں ہی جاتا رہے۔ یہی ہماری اس قوم کا المیہ رہا ہے کہ اس نے اپنی اعلیٰ اقدار کھو ڈالی ہیں اور اس کی رہنمائی استحصالی طبقے کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے، جس نے قوم کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔

***

... مسلم دشمنی اور اس کے انجام کا قصہ

جگن ناتھ اپنے ماتحتوں خصوصاً مسلمانوں کے معاملے میں اتنا سخت تھا کہ عملے نے اس کا نام لال بخار رکھ دیا تھا۔

لال بخار

ساجد کی اور میری دوست بہت پرانی تھی۔ کالج سے نکلنے کے بعد ہماری راہیں جدا ہو گئیں لیکن دوستی اور خط و کتابت برقرار رہی۔ ساجد ریلوے میں ملازم ہو گیا۔ اپرنٹس شپ کا کورس کرنے کے بعد سب انسپکٹر بن گیا جس کی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ ریلوے لائن کی دیکھ بھال کرے، اس کو درست حالت میں رکھے اور جب ضرورت ہو مرمت کرواتا رہے۔ اس کو ٹرالی ملی ہوئی تھی اور چار ٹرالی مین جو ریل کی ڈھائی تین انچ چوڑی پٹڑی پر دوڑ کر دھکیلنے کے بعد ٹرالی کے پچھلے حصے میں مختصر سے ایک آہنی ڈنڈے پر چڑھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ ساجد کے زیرِ نگیں طویل علاقے کی نسبت سے مزدوروں کی خاصی بڑی تعداد اس کے ماتحت تھی۔ یہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا۔

دس سال کی ملازمت کے بعد وہ سب سے سینئر ہو گیا تھا اور اکثر اپنے ڈویژن میں کسی انسپکٹر کے بیمار ہو جانے یا رخصت پر جانے پر اُس کی جگہ کام کرنے بھیجا جاتا تھا۔ سنیارٹی کی بناء پر اس کو ایک بڑے سٹیشن پر تعینات کر دیا گیا تھا جہاں وہ دیانتداری سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ اس سٹیشن پر لوکو ورکشاپ تھا جہاں انجنوں کی دیکھ بھال اور مرمت وغیرہ ہوتی تھی۔ اس محکمے کے تمام اعلیٰ افسر اینگلو انڈین تھے جن کے لئے ایک علیحدہ کالونی بنی ہوئی تھی۔ اس میں خوبصورت بنگلے اور پختہ سڑکیں تھیں جو ہمیشہ صاف ستھری رکھی جاتی تھیں۔

اس ڈویژن کا اسسٹنٹ انجینئر ایک کٹو، متعصب اور سخت گیر ہندو جگن ناتھ تھا جو چیف انجینئر کا منہ چڑھا اس لئے تھا کہ بے حد محنتی تھا اور ضرورت پڑنے پر دو افسروں کا کام اکیلا نمٹا لیتا تھا۔ وہ خود کہتا تھا کہ اس کی ہابی ہی کام ہے اور صرف کام۔ ہر بات پر نکتہ چینی اور ہر کام میں کیڑے نکالنا اُس کا شعار تھا۔ لوگ جات حتی جانفشانی سے کام کرتے مگر وہ ایک لفظ تعریف کا منہ سے

نہ نکلتا۔ ماتحت کی ذرا سی کوتاہی پر اُس کی تنزلی کرا دیتا۔ بعض اوقات کسی بہانے کی آڑ لے کر سزا بھی دے دیتا۔ کبھی کوئی مفروضہ قائم کر کے زیرِ عتاب لے آتا۔ غرض اس نے ظلم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ لوگ اس سے خوفزدہ رہتے تھے اور اس کا نام لال بخار رکھ دیا تھا۔ جب بھی وہ انسپکشن پر آ جاتا تو لوگ ایک دوسرے کو خبردار کر دیتے کہ لال بخار آیا ہوا ہے محتاط رہیں۔

ایک مرتبہ کوئی انسپکٹر ایک ماہ کی رخصت پر گیا تو اس کی جگہ ساجد کو بھیجا گیا۔ اتفاق سے جگن ناتھ بھی وہاں آیا ہوا تھا۔ ساجد کے گھر سے اطلاع آئی کہ رات کو اُس باڑے میں آگ لگ گئی تھی جس میں اُس کی بھینس بندھی رہتی تھی۔ کسی نے شاید لاپرواہی سے جلتا ہوا سگریٹ پھونس کے چھپر پر پھینک دیا تھا جو بھڑک اٹھا۔ بھینس چونکہ لوہے کی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اس لئے اس کو نہ توڑ سکی اور جل کر مرگئی۔ شعلے اتنے اونچے اٹھ رہے تھے کہ خدشہ پیدا ہوگیا تھا کہ مکان کو لپیٹ میں لے لیں گے۔ ساجد کے گھر والے صدر درجہ دہشت زدہ تھے۔

اس اطلاع پر ساجد نے جگن ناتھ سے ایک دن کی رخصت کی درخواست کی تاکہ گھر والوں کو دلاسہ دے آئے مگر جگن ناتھ نے اس کو جھڑک دیا۔ ساجد نے محسوس تو بہت کیا مگر مجبور تھا۔ جب وہ چلا گیا تو ساجد بیماری کی رپورٹ کر کے گھر چلا آیا۔ اس کی یہ حرکت جگن ناتھ کو مشتعل کرنے کے لئے کافی تھی اور وہ ناراض ہوگیا۔ فوری طور پر تو کچھ اس لئے نہ کر سکا کہ کارروائی قانون کے مطابق تھی مگر ساجد کے خلاف اس کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ روزانہ کام سرانجام دینے کی ڈائری جو ہر ماہ ساجد کی جاتی اس پر سخت نکتہ چینی کرتا اور خواہ مخواہ کی دھمکیاں دیتا۔

ایک دفعہ غلط الزام لگا کر اس کی تنخواہ کی سالانہ ترقی چھ ماہ کے لئے رکوا دی۔ ساجد نے چیف انجینئر سے اس حکم کے خلاف براہ راست اپیل کی تو جگن ناتھ اور آتش زیر پا ہوگیا۔ اپیل کا تو کچھ نتیجہ نہ نکلا مگر اس کے بعد جب جگن ناتھ دورے پر آیا تو وہ ساجد کی جان کو آ گیا کہ وہ براہ راست چیف انجینئر تک کیوں پہنچا اور طعنہ دیا کہ تم اتنے بڑے آدمی ہو کہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کو نظرانداز کر کے اعلیٰ افسروں سے بات کرتے ہو۔ تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اس ہندو نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا کر ہی چھوڑا۔ ہوا یہ کہ ساجد کے ایک ٹرالی مین اور ایک مزدور میں معمولی بات پر اَن بن ہوگئی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ جگن ناتھ نے یہ الزام عائد کر کے کہ ساجد کے اکسانے پر ٹرالی مینوں نے مزدور کو پیٹا ہے، ساجد کو معطل کر دیا۔ جب باقاعدہ انکوائری ہوئی تو یہ الزام ثابت نہ ہو سکا اور ساجد کو بغیر کسی سزا کے بحال کر دیا گیا۔ اس سے جگن ناتھ کی مخالفت دشمنی میں تبدیل ہوگئی اور وہ اس ٹوہ میں لگ گیا کہ کوئی بڑا الزام لگا کر ساجد کو برطرف کرا دے۔ خود تو ابھی اس عہدے پر تھا نہ کُلی اختیارات اس کے ہاتھ میں تھے اس لئے مجبور تھا۔ صرف سفارش ہی کر سکتا تھا۔ اگر بااختیار ہوتا تو شاید کبھی کا ساجد کو ٹھکانے لگا چکا ہوتا۔

ساجد احتیاط، محنت اور جانفشانی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ ریلوے کے عملے میں سے بھی اس کو ہم صحبت مل گئے تھے اور شہر کے بھی کئی شرفا سے اس کی شناسائی ہوگئی تھی۔ شہر میں ایک بزرگ کا مزار تھا جہاں وہ جمعرات کو فاتحہ پڑھنے چلا جاتا اور وہیں مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتا تھا۔ اس طرح شہر میں بھی کئی ایک سے اس کی دوستی ہوگئی تھی۔ ساجد سے میری خط و کتابت برابر جاری رہی۔ ہم دونوں کوئی تاریخ مقرر کر لیتے اور اکٹھے خواجہ غریب نواز کے عرس میں شرکت کرتے تھے۔ ہم نے متواتر سات سال خواجہ غریب نواز کے عرسوں میں

عام طور پر [illegible] سے [illegible] عرس پر امیر شریف [illegible] تیار رہتے
تھے۔ ان کے لئے بڑا قیام [illegible] کرتے تھے۔ [illegible] نماز ادا کرتے
تھے۔ [illegible] مسجد میں [illegible] ادا کرنا [illegible] ساجد [illegible] تعلق نہ تھا
تمام حاضرین [illegible] نماز عصر کے وقت سے [illegible] کی نماز
ادا کرنے کے بعد فاتحہ پڑھ کر قیام گاہ واپس آ جاتے۔ [illegible]
ہاتھ وضو [illegible] کرتے اور پھر سو [illegible] نیند [illegible]
جاتے۔ مگر [illegible] وظیفہ [illegible] پڑھتا [illegible] کہ سوال ہی
پیدا نہ ہوتا۔ ساجد [illegible] دن اور رات [illegible] تقریباً ہو گئے [illegible]
گزر جاتیں مگر کوئی گرانی محسوس نہ ہوتی اور پھر عصر کے
بعد [illegible] نماز فجر ادا کرنا بھی ہمارے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔

آخری دفعہ عرس سے واپسی پر ساجد نے مجھ سے ایک دن کے لئے ٹھہرنے کو کہا۔ میرے پاس ایک دن کی مہلت باقی تھی۔ میں نے اس کا کہا مان لیا۔ دوسرے روز جانے کے لئے ساجد کے ہمراہ جس وقت سٹیشن پہنچا تو گاڑی جو ایکسپریس تھی حرکت میں آ چکی تھی۔ میں سیکنڈ کلاس کا ڈنڈا پکڑ کر چڑھنے لگا تو ایک صاحب نے دروازے پر آ کر مجھے چڑھنے سے روکا۔ اس زمانے میں امیر کبیر لوگ ہی سیکنڈ کلاس میں سفر کرتے تھے۔ میں نے ان کو بتایا کہ میرے پاس ٹکٹ ہے اور مجھے اس میں سوار ہونے کا حق ہے مگر وہ نہ مانے اور میرا ہاتھ چھڑانے کی کوشش شروع کر دی۔ میرے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس تھا اور دوسرے ہاتھ سے ڈنڈا پکڑ رکھا تھا۔ گاڑی کی رفتار لحظہ بہ لحظہ تیز ہو رہی تھی مگر وہ مجھے اندر نہ جانے دیتے تھے اور میرا ہاتھ ڈنڈے سے چھڑانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ میری رخصت چونکہ ختم ہو رہی تھی اس لئے میں جانے پر مصر تھا۔ اس اثنا میں گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ پلیٹ فارم بھی گزر چکا تھا۔

ساجد گاڑی کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ جب اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ شخص مجھے ہرگز داخل ہونے نہ دے گا تو اس نے خدا کا واسطہ دے کر کہا کہ اٹیچی کیس پھینک کر پیچھے آ رہا ہوں۔ میں نے [illegible] کہ اس شخص کے دل میں رحم کا [illegible] شاید [illegible] نہیں [illegible] اتر پڑا۔ وہ چا[illegible]
[illegible] پاس [illegible] پڑیں [illegible] آنکھیں [illegible]
کر دیا [illegible] نہیں [illegible] ہوتا ہے [illegible] باقی
اللہ والے ہیں [illegible] سب تعلیم یافتہ اور [illegible] لوگ تھے جو
عرس میں شرکت [illegible] گھروں کو [illegible] جاتے [illegible] تھے
[illegible] صاحب کی [illegible] عجب [illegible] کی بجائے [illegible] اپنے
سینوں میں [illegible] اور [illegible] لئے [illegible] ان کے دل
گداز ہونے کی بجائے اور سخت ہو گئے تھے۔ سنا ہے جو
لوگ حج پر جاتے ہیں ان میں بعض [illegible] مستوں میں حاجی
بن کر لوٹتے ہیں اور بعض کچھ اور۔

ساجد کے چاروں ٹرالی مین ہندو تھے۔ ایک دن حسب معمول وہ دورے پر گیا ہوا تھا کہ راستے میں ٹرالی کو دھکیلنے کے بعد چڑھتے ایک ٹرالی مین کی ٹانگ پہیے میں پھنس گئی اور اس کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ساجد نے اس کو ہسپتال میں جو قریب ہی سٹیشن پر تھا، داخل کرا دیا اور متعلقہ افسروں اور عملے کو بذریعہ تار اس سانحہ کی اطلاع دے دی۔ جہاں جہاں یہ خبر پہنچی وہاں کھلبلی مچ گئی اور ہندوؤں میں یہ افواہ اڑ گئی کہ ایک مسلمان نے ہندو کی ٹانگ توڑ دی ہے۔ حالانکہ تار میں پوری وضاحت کر دی گئی تھی کہ کس طرح یہ سانحہ وقوع پذیر ہوا ہے۔

چیف انجینئر کے دفتر سے تار آیا کہ ساجد معہ ٹرالی مینوں کے اس کے ہیڈ کوارٹر پر حاضر ہو۔ اس کی تعمیل کی گئی۔ ساجد کو خدشہ ہوا کہ رائی کا پہاڑ نہ بنا دیا جائے کیونکہ 1947ء کا زمانہ تھا۔ معاملہ ہندو اور مسلمان کا آ پڑا تھا۔ مزید یہ کہ جگن ناتھ جس کو لوگ لال بخار کے نام سے یاد کرتے تھے وہ بھی ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔ دو باتوں سے ساجد کی ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔ ایک یہ کہ چیف انجینئر انگریز تھا اور دوسری یہ کہ ساجد کی کسی کوتاہی یا غلطی کا اس میں دخل نہ تھا۔ بہرکیف ساجد نے ٹرالی سٹیشن پر چھوڑی

ہور چیف انجینئر کے دفتر پہنچ کر اپنے آنے کی اطلاع ہیڈ کلرک کو دی جو ہندو تھا۔ اس ہندو نے چھوٹتے ہی کہا کہ تم نے ٹرالی مین کی ٹانگ توڑ دی ہے۔ چیف انجینئر کو مطلع کیا گیا جس نے ساجد کو سٹیشن پر ٹرالی کے پاس ملنے کا حکم دیا۔

ساجد واپس آیا اور مین گیٹ پر اس کا منتظر رہا۔

چیف انجینئر اور جگن ناتھ کار سے وہاں پہنچے۔ چیف انجینئر نے دریافت کیا کہ ٹرالی کس جگہ ہے۔ ساجد نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا اور خود بڑی مستعدی اور لانبے لانبے ہموار قدم رکھتے ہوئے ان کی رہبری کے لئے آگے آگے چلنے لگا۔ جگن ناتھ کو تو یقیناً یہ بڑی گستاخی معلوم ہوئی کہ ان کا ماتحت ان سے آگے آگے چل رہا ہے مگر ساجد کو اندازہ تھا کہ انگریز تو مستعدی، محنت اور حقیقت پسندی اور چاق و چوبند رہنے کا قائل ہے۔ اس نے ساجد کی چال ہی سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ قصوروار نہیں ہے۔ اس نے دو تین سوال کئے۔ چلتی ٹرالی پر بیٹھنے کا عملی مظاہرہ دیکھ کر ساجد کو واپس جانے کی اجازت دے دی۔ جگن ناتھ کی زک پہنچانے کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی لیکن وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ اُس نے چیف انجینئر پر زور دے کر ساجد کا تبادلہ دوسرے ڈویژن میں کرا دیا۔

اب ستم ظریفی دیکھئے کہ جگن ناتھ بھی ترقی پا کر بطور ایگزیکٹو انجینئر اسی ڈویژن میں آ گیا۔ یہاں چونکہ وہ بااختیار تھا اس لئے اس کو انتقام لینے کی سوجھی۔ اس نے ساجد کا تبادلہ اپنے ہیڈ کوارٹر سٹیشن پر کر دیا مگر تنزلی کے ساتھ تنزلی اس معنی میں کہ پہلے وہ اونچے گریڈ کے لوگوں کی جگہ کام کرنے بھیجا جاتا تھا مگر اس کو اب اپنے گریڈ کے لوگوں کی جگہ کام کرنے کے احکام جاری کر دیئے اور یہ قید بھی لگا دی کہ جب وہ باہر نہ جائے تو اس کے دفتر میں حاضر رہے۔ مکان جس کا وہ حقدار تھا اس پر ہیڈ کلرک نے پہلے ہی سے قبضہ جما رکھا تھا۔ انجام یہ ہوا کہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا مکان اس کو رہنے کو ملا۔ اس نے اس کو ہی غنیمت جانا۔ قریب میں ایک مسلمان اوور سیئر رہتے تھے۔ جگن ناتھ نے تو بطور سزا ساجد کو اپنے ہیڈ کوارٹر پر رکھا تھا مگر اس کے حق میں یہ بات بہت مفید ثابت ہوئی کیونکہ دو ماہ بعد ہی پاکستان قائم ہونے کا اعلان ہو گیا۔ ہندو مسلمان کی مخاصمت کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہندو تو ہمیشہ ہی مسلمان کا دشمن رہا ہے۔ متعدد مقامات سے کشت و خون کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ ریل گاڑیوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کی مرضی معلوم کی جا رہی تھی کہ وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں یا وہیں رہنا چاہتے ہیں۔ اسی اثناء میں ہیڈ کوارٹر سے ساجد کی ترقی یعنی انسپکٹر بنا دیئے جانے کے احکام ہیڈ آفس میں جس کا سربراہ جگن ناتھ تھا، موصول ہوئے اور یہ بھی کہ اس کو اسی سٹیشن پر تعینات کیا گیا ہے۔ جاننے والے اس کو مبارک باد پیش کرنے لگے۔ ساجد کے بچوں کی تو خوشی کی انتہا نہ رہی اور وہ بار بار انسپکٹر کے خوبصورت بنگلے کا چکر لگاتے کہ اب وہ ان کی رہائش گاہ ہوگی۔ ساجد نے اس خیال کے تحت کہ اُسے ترقی ملنے والی ہے اور پاکستان میں اس کو اسی عہدے کا حقدار سمجھا جائے گا عارضی طور پر تین ماہ کے لئے ہندوستان ہی میں قیام کرنے پر رضامندی دے دی۔

دن پر دن گزرتے رہے مگر احکام آج ملتے ہیں نہ کل جگن ناتھ احکام کو دبائے بیٹھا رہا اور ان کی تعمیل نہ کی۔ اسی دوران ساجد کو کام کرنے باہر جانا پڑا۔ وہاں سے فارغ ہو کر واپس آیا تو سٹیشن پر کسی نے اس کو مطلع کیا کہ سابق ڈویژن میں ایک انسپکٹر رخصت پر جا رہا ہے اور اس کو اس کی جگہ کام کرنے جانا ہوگا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی کیونکہ قاعدے کے بموجب ڈویژن میں جو شخص سینئر ہوتا تھا اس کو بھیجا جاتا تھا مگر اس کمبخت جگن ناتھ نے ایسا چکر چلایا کہ ساجد کو دوسرے ڈویژن میں جانے کے احکام ملے۔ وجہ یہ سمجھ میں آئی ہے کہ وہاں جانے کے

ریاست بھرت پور سے گزرنا پڑتا تھا جہاں کے لوگوں نے قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کسی مسلمان کو زندہ اور ان کے سامان کو صحیح سلامت نہ گزرنے دیں گے۔ صاف ظاہر تھا کہ جگن ناتھ ساجد کی جان کے درپے تھا۔ ساجد اس سازش کو تاڑ گیا اور گاڑی سے اترتے ہی سیدھا ہسپتال پہنچا۔ وہاں کے مسلمان کمپاؤنڈر کے ذریعے ہندو ڈاکٹر سے پندرہ روز کا بیماری کا سرٹیفکیٹ لے کر گھر بیٹھ گیا۔

ترقی کے احکامات نہ آنے تھے نہ آئے۔ ایک روز ایک مسلمان اسسٹنٹ انجینئر سٹیشن پر آئے اور انہوں نے سب مسلمانوں کو براستہ بھرت پور حیدرآباد سندھ کے ریلوے پاس حوالے کئے اور نصیحت کی کہ آپ لوگ پاکستان چلے جائیں تو بہتر ہے اور وہ بھی وہیں جانے والے ہیں۔ پاسوں میں ایک ماہ کی میعاد رکھی گئی تھی۔ اب مسلمان سر جوڑ کر بیٹھتے اور تدبیریں سوچتے۔ بھرت پور کے راستے تو جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ایک نے تجویز پیش کی کہ مسلمان فوجیوں کے ساتھ جو وہاں تھے نکل جانا محفوظ رہے گا۔ فوجیوں میں نصف تعداد مسلمانوں کی تھی اور نصف ہندوؤں اور سکھوں کی۔ مسلمانوں کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ ہتھیار جمع کرا دیں اور چلے جائیں جس پر وہ راضی نہ ہوتے تھے اور ہتھیار ساتھ لے جانے پر مصر تھے اور ان کا چیلنج تھا کہ کسی میں ہمت ہے تو ان سے زبردستی ہتھیار رکھوالے۔ اس طرف سے بھی مایوسی ہو گئی۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ وقت نکلا جا رہا ہے روانگی کی تاریخ مقرر کر لی گئی۔ اس کو خفیہ رکھا گیا اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ کس راستے سے جائیں گے۔

مقررہ تاریخ پر سب لوگ ریل میں سوار ہو گئے۔ ہندوؤں کو بڑا تعجب تھا کہ جس راستے کے پاس ان کو دیئے گئے تھے اس کے بالکل مخالف سمت وہ لوگ جا رہے تھے۔ خبر ملی تھی کہ جھانسی سٹیشن پر مسلمانوں سے بھری ہوئی پوری ٹرین کا صفایا کر دیا گیا ہے اس لئے وہ راستہ چھوڑ کر ال

آباد ہوتے ہوئے بخیر و عافیت کراچی پہنچ گئے۔ کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ میں ذیلہ ہفتہ میں بمبئی آ گیا تھا اور حاجی مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ آگے روانگی کے لیے اپنی باری کا منتظر تھا۔ ریلوے اسٹیشن کا روزانہ چکر اس نیت سے لگاتا تھا کہ شاید کوئی عزیز یا شناسا سامنے ملاقات ہو جائے تو اس کی رہنمائی کر سکوں۔ آخر یہ حکمت عملی کام آئی اور ایک روز ساجد پلیٹ فارم پر مل گیا۔ اس کو معہ بال بچوں کے لے کر مسافر خانے پہنچا اور اپنے قریبی کمرے میں جگہ دلوا دی۔

اس علاقے میں صورتِ حال تشویشناک نہ تھی مگر حفظ ماتقدم کے طور پر اعلان کر دیا گیا تھا کہ لوگ مسافر خانے سے زیادہ دور نہ جائیں۔ ضروریات کی تمام چیزیں قریب ہی دکانوں پر دستیاب تھیں۔ خریداری کے لئے دور جانے کی حاجت ہی نہ تھی۔ البتہ عید الفطر کے موقع پر نماز پڑھنے کی غرض سے ضرور کچھ دور جانا پڑا جو کرکٹ کے میدان میں ادا کی گئی۔ فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ وہاں تجارت پیشہ مسلمانوں کے بچے ”ہندوستان ٹائمز“ کے پرانے پرچوں کے اوراق ایک ایک آنے فروخت کر رہے تھے جن کو خرید کر مسلمان جائے نماز کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔

اس دن بعد ہمیں پاکستان جانے کے لئے جل درگا نامی جہاز میں جگہ ملی جو دو سال تک سمندر کی تہہ میں پڑا رہا تھا اور جس کو نکال کر مرمت کر کے سفر کے قابل بنایا گیا تھا۔ کچھ لوگ اس جہاز میں جانے سے ڈر رہے تھے مگر مجبوری نے ان کو اس پر سوار کروا ہی دیا۔ سب کو جگہ کشادہ مل گئی۔ جب اطمینان ہوا تو لوگ مختلف مشاغل میں لگ گئے جن میں ایک ٹولی تاش کھیلنے والوں کی بھی تھی۔ اتفاق سے آدھی رات کے وقت جہاز بیچ سمندر میں رک گیا۔ جہاز رکنے کی وجہ سے چونکہ لوگ واقف تھے اس لئے ان کو تشویش لاحق ہوئی۔ خصوصاً خواتین بہت خائف تھیں۔ بعض کو یہ کہتے سنا گیا کہ جب جہاز میں جوا کھیلا جائے گا تو جہاز صحیح سلامت کیسے پہنچے گا۔ ان خواتین کا اشارہ ان لوگوں کی طرف تھا جنہوں نے دن میں تاش سے دل بہلایا تھا۔

ایک گھنٹے بعد جہاز پھر روانہ ہوا مگر اس کی رفتار اتنی کم تھی کہ دوسرا جہاز جو بمبئی سے ایک دن بعد روانہ ہوا تھا اس سے آگے نکل گیا۔ بمبئی سے روانگی سے قبل کراچی میں اپنے بھتیجے کو میں نے اطلاع دے دی تھی کہ ہم جل درگا سے پہنچ رہے ہیں۔ تیسرے دن کراچی پہنچے تو بھتیجا بندرگاہ پر موجود تھا۔ مسافر پاکستان کی سرزمین پر پہنچ کر انتہائی خوش تھے اور بڑے جوش و خروش کا اظہار کر رہے تھے اور سجدہ شکر ادا کر رہے تھے۔

ساجد کو راولپنڈی ڈویژن میں تعینات کر دیا گیا اور وہ دلجمعی سے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔ میری تقرری کراچی ہی میں ہوئی۔ چھ ماہ بعد ساجد کو ترقی دے کر انسپکٹر بنا دیا گیا تو اس کا ذہن ہندوستان میں اپنے سابق اسٹیشن کی طرف منتقل ہوا۔ اس کو یاد آیا کہ کئی لوگوں نے جن میں ہندو بھی شامل تھے۔ اسے پاکستان پہنچنے پر اطلاع دینے کو کہا تھا۔ ان لوگوں کو کم ہی امید تھی کہ ہم لوگ صحیح سلامت پہنچ جائیں گے۔ اکرام اللہ نے جنہوں نے ہندوستان ہی میں رہنے کو ترجیح دی تھی، خاص طور پر تاکید کی تھی کہ پاکستان سے ایک خط ضرور ان کو لکھ دیا جائے۔ ساجد کو جب یہ بات یاد آئی تو اس نے ان کو اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بخیر و عافیت پہنچنے کی اطلاع دے دی اور یہ بھی درخواست کی کہ وہ بھی وہاں کے حالات سے مطلع کریں۔ ایک روز ساجد کا خط مجھے ملا۔ لکھا تھا کہ ہندوستان سے اکرام اللہ کا جواب آیا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ خبر بھی لکھی ہے کہ لال بخار خود لال بخار کے عارضہ میں مبتلا ہو کر پرلوک سدھا گیا ہے۔

***

سچی کہانیاں

مکافاتِ عمل

کتنے ہی منہ زور اتھرے جوانوں نے اپنی جوانی طاقت اور اختیار کے زعم میں معصوم جوانیوں کو تاراج کیا اور بدلے میں کچھ معاوضہ دے کر سمجھا کہ قیمت ادا ہوگئی اور کبھی تو معاوضے کی بھی زحمت نہ کی لیکن مکافاتِ عمل سے نہ بچ سکے اور بدلہ ان کی عورتوں کو دینا پڑا۔

☆ .... امجد عنایت

دنیا میں غیر محسوس طور پر مکافاتِ عمل کا قانون جاری و ساری ہے جو انسان کے اچھے اور برے اعمال کے اثرات اس پر، اس کے متعلقین اور معاشرے پر مرتب کرتا ہے اور انسان کی تقدیر میں بھی تبدیلی اسی کے تحت آتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ زکوٰۃ دینے والے کا عموماً نقصان نہیں ہوتا، جن بچوں کا عقیقہ ہوتا ہے وہ ہمیشہ خوش قسمت اور خوشحال رہتے ہیں، صلہ رحمی اور ضرورت مندوں کی مدد کرنے والے لمبی عمر پاتے ہیں اور ان کی دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے اشارے ہمیں قرآن و حدیث سے بھی ملتے ہیں اور قرآن و حدیث سے سچی بات اور کیا ہوگی۔ اسی طرح ظلم کرنے والا ایک دن عبرت کا نشان بن جاتا ہے زانی محتاج ہو جاتا ہے اور مغرور کا سر ایک دن نیچا ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار ایسا نہیں بھی ہوتا تو اس کی وجہ برائی کے معاملے میں توبہ یا کوئی

نیکی ہو سکتی ہے اور نیکی کے معاملے میں ریاکاری فخر یا بدنیتی۔ پھر بھی اگر یہاں اچھے بُرے عمل کا بدلہ نہ ملے تو آخرت میں ضرور ملے گا بطور مسلمان یہ ہمارا ایمان و یقین ہے۔ ذیل میں ہم کچھ ایسے ہی سچے واقعات بیان کررہے ہیں جن میں یہ قانون واضح طور پر کارفرما نظر آتا ہے البتہ بعض تکلیفیں آزمائش ہوتی ہیں جو نیکوں کو بھی ہو سکتی ہیں۔

زنا آج کل بہت عام ہوگیا ہے کیونکہ اس کے لئے سہولت پیدا کرنے والے کئی شیطانی ذرائع ایجاد ہو گئے ہیں ہر دور میں اس کی تباہ کاریاں الگ انداز میں نظر آتی ہیں۔ یہ ایسا گناہ ہے جس کے برے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی پر سب گناہوں سے زیادہ ہوتے ہیں جو کئی کئی نسلوں تک چلتے ہیں۔ یہ تو عام سی بات ہے کہ بڑے بڑے معزز لوگ اپنے نطفے بازار حسن کی طوائفوں کے رحم میں چھوڑ آتے ہیں اور ان سے جو بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ان کو بھی دھندے پر بٹھا دیتی ہیں کیونکہ ان کا تو یہ کاروبار ہے اور اگر بیٹے پیدا ہوتے ہیں تو وہ بھی وہاں دلال بنتے ہیں یا بدمعاشی ہی کرتے ہیں اور کبھی قدرت ان کے گناہ کا انتقام یوں بھی لیتی ہے کہ بھائی بہن کا یا باپ ہی بیٹی کا خریدار بن کر پہنچ جاتا ہے۔

زیب کو اللہ نے شکل عقل اور دولت سے خوب نوازا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ جہاں سے گزرتا گوریاں آہیں بھرتیں اور اس کی اک نظر التفات کی منتظر رہتیں۔ زیب نے بھی اپنے رنگ روپ کا خوب فائدہ اٹھایا اور جوانی بڑی رنگین گزاری لیکن اس کی شادی حادثاتی طور پر ایسی عورت سے ہوگئی جو کہ عمر میں تو اس سے آٹھ دس سال بڑی تھی ہی اس کا رنگ بھی پکا تھا اور تھی بھی قبول صورت خاندانی دباؤ کے باعث زیب نے اسے قبول تو کرلیا مگر یہ کوئی جوڑ نہ تھا پھر نوخیز جوانیاں اب بھی اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں نتیجتاً وہ پھر بہک گیا۔ اکثر باتیں کب چھپتی ہیں اور جاسوسی کی رگ تو ہر عورت میں ہوتی ہے جبکہ خوبصورت مردوں کی بیویوں میں تو یہ رگیں ایک سے زائد ہوتی ہیں۔ بیوی کو پتا چلا تو اس نے بہت ہنگامہ کیا۔ زیب کے سسرال والے زبردست قسم کے لوگ تھے۔ بات طلاق اور کورٹ کچہری خرچے جرمانے اور بچوں کی کفالت تک پہنچی۔ زیب کو بچے بھی ماں کو دینے پڑے اور خرچہ بھی۔ یہ سزا بہت بڑی تھی مگر زیب پھر بھی نہ سدھرا۔

اب اس نے پیشہ ور عورتوں کے پاس جانا شروع کر دیا انہی میں سے ایک چالاک حرافہ نے اپنے حاملہ ہونے کی اداکاری کر کے زیب کو دھمکیاں دے کر نکاح پر مجبور کر دیا۔ خاندان والوں کو پتا چلا تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور اس کا بائیکاٹ کردیا۔ مالی مشکلات کا شکار ہو کر اس نے مجبوراً اسے طلاق دے دی اور خاندان والوں نے اس کی تیسری شادی خاندانی لوگوں میں کرادی اور اب وہ ایک بظاہر آسودہ زندگی گزار رہا ہے لیکن طوائف سے اسے جو بچی ہوئی تھی جوان ہوتے ہی اس کی ماں نے اسے دھندے پر بٹھا دیا اور زیب سب کچھ جاننے کے باوجود بھی کچھ نہ کر سکا۔ پہلی بیوی سے ہونے والا بچہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے کیونکہ اسے ایک دن بھی باپ کا پیار نہیں ملا۔ بچی نے اس کا پیار پایا تھا مگر وہ سسرال کی وجہ سے بے بس ہے جو کہ اس کے ننھیالی ہی ہیں وہ چاہنے کے باوجود اس سے مل نہیں سکتی۔ ہاں تیسری بیوی سے ہونے والی اولاد اس کے پاس ہے اب آپ خود ہی حساب لگالیں کہ اس نے کیا کھویا اور کیا پایا اور وہ کس کس طرح قانون مکافات کی زد میں آیا اور جوانی کی عیاشیاں اسے کتنی بھاری پڑیں۔

بھائیوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے باپ نے کمال کو کاروبار پر کلی اختیار دے رکھا تھا۔ کپڑے کا ٹھوک کاروبار تھا اور آمدنی کا کوئی حساب نہیں تھا۔ پھر باپ نے اسے پاور لومز بھی لگا دیں اور اپنی خوبصورت

بھتیجی سے اس کی شادی کرا دی۔ اس کے پاس اس دور میں کار تھی جس دور میں لوگوں کے پاس بائی سائیکل بھی خال خال تھے اس وقت سب سے بڑا نوٹ سو کا ہوتا تھا جو کہ خال خال لوگوں کو ہی دیکھنا نصیب ہوتا تھا اور اس کی مالیت آج کے ہزار روپے سے بھی زیادہ تھی اور کمال فلمی ولنوں کی طرح سو کے نوٹ سے سگریٹ جلایا کرتا تھا۔ جلد ہی برے دوستوں نے اسے گھیر کر شراب و شباب پر لگا کر اس کے پیسے سے اس کے ساتھ ساتھ خود بھی عیاشی شروع کر دی۔ اسی دور میں ایک شاطر طوائف اس کی زندگی میں آئی اور اس نے موٹی آسامی دیکھ کر اس کا دوسرا نکاح چلبلی سے اپنی خوبصورت چھوٹی بہن سے کرا دیا۔ جب اس بات کا علم پہلی بیوی کو ہوا تو پانچ بچے ہو چکے تھے۔ اس نے احتجاج کیا تو اسے گھر سے نکال کے اس کے سامان کو آگ لگا دی۔ وہ بچا کھچا سامان سمیٹ کے بچوں کو لے کے میکے آ بیٹھی۔ اس کا باپ بہت با اصول اور ایماندار آدمی تھا۔ اس نے کمال کو بہت دوسری بیوی کو طلاق دے کر پہلی بیوی کو واپس لانے کا کہا لیکن اس نے اپنی آسائش چاہنے والے کو عاق کر کے گھر سے نکال دیا۔ گاڑیوں میں سفر کرنے والا سڑک پر آ گیا اور پیدل لوگوں کا مالک ریڑھی پر پھیری کرنے لگا۔ ہاں اس کے کنگال ہونے پر بھی دوسری بیوی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور وفا کی داستان رقم کی حالانکہ وہ ایک طوائف کی بہن تھی۔ جلد ہی اس کے تین بچے دوسری بیوی سے بھی ہو گئے۔ آئندہ بیس سال اس نے اسی طرح چھوٹے چھوٹے کام کر کے زندگی کی گاڑی کو دھکیلا چھوٹے بھائی جو اب اس کی جگہ جائیداد کاروبار کے مالک تھے کبھی کبھار صدقات و زکوٰۃ کی شکل میں اپنے باپ سے چھپ کر اس کی مدد کر دیتے تھے۔ اسی طرح انہوں نے پہلے اسے مکان لے دیا اور پھر دکان بنا دی اور اس کی زندگی کچھ آسان ہو گئی۔ ایک بیٹا تھا جس نے محنت مزدوری کی اور

دنیا کا مال

میں اس دنیا کے مال کو کیا کروں گا کہ جس کے حلال میں حساب اور حرام میں عذاب ہے۔

(حضرت علیؓ)

پھر اسے عزیزوں کی مدد سے دبئی بھجوا دیا تو حالات کچھ بہتر ہونے لگے۔ بچیوں نے گھر میں ٹیوشنیں پڑھا پڑھا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اچھی نوکریاں حاصل کیں تب جا کے کمال کے دن پھرے مگر میاں بیوی کی جوانی حالات کا ایندھن بن گئی اور پہلی بیوی اور اس کی اولاد بھی رل گئی۔ وہ بارل شہری نہ بن سکے۔ بیوی انکی مسافرت کے باعث کینسر کا شکار ہو کر مر گئی اور بیٹے معاشرے کے مفید شہری بننے کی بجائے خود نشے کا شکار ہوئے اور دوسروں کو بھی کیا۔ ان کے رشتے اچھے خاندانوں میں نہ ہو سکے اور نہ ہی وہ خاندان میں رل سکے۔ ایک شخص کی غلطیوں کی سزا ساری عمر ان سے نہ چھوٹی بلکہ ان کے متعلقین نے بھی پائی پارہ پارہ کافی نسلیں کا شکار ہوئے اور معاشرے کے لئے عبرت کی مثال بنے۔

ناصر آغا جوانی سے ہی منہ زور بھٹکے جذبات کا حامل تھا جن کو ٹھنڈا کرنے کے لئے اس نے لڑکے لڑکی، مرد عورت اپنے پرائے کی کبھی تمیز نہ رکھی یہی وجہ ہے کہ وہ اس قدر بدنام ہوا کہ خاندان تو کیا برادری میں بھی کسی نے اسے رشتہ دینے کی ہامی نہ بھری حتیٰ کہ اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی جو کنواری ماں بننے والی تھی اور اابارشن کرا کے اس کو رشتہ دے دیا گیا جو اس نے مجبوراً قبول کر لیا لیکن اس اابارشن میں کوئی ایسی پیچیدگی پیدا ہو گئی کہ وہ دوبارہ اُمید ہوتے ہی اس کا بلڈ پریشر شوٹ کر جاتا اور بچہ خود بخود ضائع ہو جاتا۔ بڑی منتوں مرادوں کے بعد ایک بچہ زندہ سلامت پیدا ہو گیا لیکن اس

کے بعد کبھی کوئی بچہ منزل تک نہ پہنچ سکا۔ اکلوتا بچہ بھی ابتدائے جوانی میں ہی باپ کے نقش قدم پر چل نکلا۔ ایک دن اس نے نہانے کے لئے نہر میں جو چھلانگ لگائی تو وہاں پانی شاید کم تھا یا زمین سخت تھی کہ اس کا سر بسب زور سے زمین سے ٹکرایا تو ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر آ گیا اور وہ کچھ عرصہ مفلوج رہنے کے بعد فوت ہو گیا اور ناصر کو ہمیشہ کا روگ دے گیا۔

مظفر کا حال بھی ناصر سے ملتا جلتا تھا اور انہی وجوہات کی بناء پر اس کا رشتہ بھی نہ ہو سکا ایک دفعہ اس نے ایک دوست کے ساتھ مل کر ایک لڑکی گھر سے بھگالی لڑکی کی مرضی شامل تھی اور یہ موٹر سائیکل پر تینوں آ رہے تھے کہ تعاقب کے خدشے اور پکڑے جانے کے خوف کے باعث گھبرا کر ایک رکشے سے ایکسیڈنٹ کر بیٹھے دوست اور لڑکی تو بچ گئے مگر اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ دوست نے لڑکی کو واپس بھیج دیا اور اسے ہسپتال لے گیا۔ ٹانگ جڑ تو گئی مگر صحیح نہیں کہ وہ اب بھی لنگڑا کر چلتا ہے۔

اظہر پیدائشی حرامی تھا ہر راہ چلتی لڑکی کو چھیڑنا اپنا حق سمجھتا تھا۔ گالیاں جوتے بھی کبھی اسے مشن سے نہ ہٹا سکے اس کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی جو جتنی خوبصورت اور نوخیز تھی اتنی ہی بدزبان اور بدکردار تھی اور شادی کے کچھ ہی عرصے جب اس نے پر پرزے نکالے اور گھر پر ہی لوگوں کو بلانا شروع کر دیا تو اظہر نے احتجاج کیا بیوی نے دھمکی دی کہ میں اپنے یاروں سے تمہیں قتل کرا دوں گی نتیجہ یہ کہ وہ اب اپنی آنکھوں سے سب کچھ ہوتا دیکھتا ہے مگر کچھ کر نہیں سکتا۔ یہ بھی مکافات کی ایک شکل ہے۔

فراز کے اپنی کزن کرن کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے جبکہ کرن کے فراز کے علاوہ بھی کئی لڑکوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ کرن کا تعلق کسی قدر غریب گھرانے سے تھا اس کی شادی ایک غریب گھرانے کے نیم معذور شخص سے ہوگئی فراز امیر تھا اس کی شادی ایک امیر گھرانے میں ہو گئی۔ شادی کے بعد کرن کی دوستیاں کم ہونے کی بجائے بڑھ گئیں اور جب اس نے اسے آمدنی کا ذریعہ بنا لیا تو شوہر کا احتجاج بھی کم ہوتے ہوتے ختم ہو گیا۔ فراز سے بھی اس کے تعلقات بدستور قائم تھے جس کا علم اس کی بیوی کو ہوا تو اس نے احتجاج کیا فراز نے اس کا خرچ بند کیا تو اس نے بھی ردعمل میں شادی سے قبل کے کسی یار سے دوبارہ تعلقات قائم کر کے اپنے اخراجات چلانے شروع کر دئے جب یہ راز فراز پر کھلا تو اس نے طلاق دے دی بیوی عدالت جا پہنچی اور خرچ کے کیس کے ساتھ ساتھ مار پیٹ اور سسرالیوں پر دست درازی کا کیس بھی کر دیا گرفتاری اور سزا و خرچے سے بچنے کے لئے فراز طلاق سے مکر گیا اور بیوی کو گھر لے آیا اور کرن نے بھی اس کی ایماء پر اپنے شوہر سے خلع لے کر بچے بھی لے لئے اور فراز سے نکاح کر لیا اور فراز کی اجازت سے پرانا دھندہ منظم طریقے سے شروع کر دیا پہلی بیوی بھی واپسی کے بعد سے خودمختار تھی او فراز اس پر کسی قسم کا کنٹرول اب فراز کا نہ تھا بچے پالنے کے لئے اس نے مردوں کی طرح دکانداری شروع کر دی جبکہ فراز دو بیویوں کے ہوتے ہوئے بھی دراصل کسی کا شوہر نہیں ہے اور اپنی جان کو کئی لاعلاج روگ لگا چکا ہے مکافات عمل نے اسے عبرت کا نشان بنا کے رکھ دیا ہے۔

کاکی نے شاید ہی کسی لڑکی کو چھوڑا ہو جب اس کی شادی ہوئی تو علم ہوا کہ بیوی بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ادھر اُدھر تو اس کے کئی بچے تھے مگر گھر میں بچہ نہ دیکھ کر بڑا بددل ہوا دوسری شادی یا طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ سسرالی بڑے زورآور تھے مجبوراً بھائی کا ایک بچہ گود لے لیا تو وہ ایک ایکسیڈنٹ میں فوت ہو گیا پھر اس ڈر سے کوئی اور بچہ گود بھی نہ لیا کہ وہ بھی نہ مر جائے کیونکہ شاید اس کی قسمت ہی ایسی تھی یوں مکافات عمل کا شکار ہو

کر دیا و لید مر ا۔

کاشی کو بھی ہزار جتنوں کے باوجود اولاد نہ مل سکی کیونکہ ایک تو وہ بڑا مغرور اور بدزبان تھا اور اس نے والدین کا بڑا دل دکھایا تھا دوسرے اس نے اپنے حسن اور تعلیم کے زعم میں اپنی کزن کا رشتہ رعونت سے ٹھکرا دیا تھا کزن کی شادی بھی ہوگئی اور اولاد بھی جبکہ وہ ابھی تک بے اولاد ہے۔

بدگوئی، غیبت اور لوگوں کی خامیوں کا مذاق اڑانا مظہر کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی اپنا پرایا کوئی اس کی زبان سے محفوظ نہ تھا۔ دو لڑکوں کے بعد وہ بچی کا خواہشمند تھا اس کے گھر لڑکی تو پیدا ہوئی مگر ذہنی معذور جسے پالنا اس کے لئے عذاب بن گیا اس کی چھوٹی بھابی نے گھریلو لڑائی میں جٹھانی کو بچی کی معذوری کا طعنہ دیا اس وقت وہ خود ایک بچی کی ماں تھی اور حمل سے تھی وہ لڑکا چاہتی تھی لڑکا ہی پیدا ہوا مگر وہ بھی ذہنی معذور تھا۔

ندیم مردہ اور بیمار گوشت بیچا کرتا تھا جبکہ سفیر ایسا ہی گوشت شادی ہالوں اور ہوٹلوں کو سپلائی کرتا تھا وہ دونوں ایسے گوشت کو خود کھانے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہ کرتے تھے نتیجتاً دونوں خود بھی ہیپاٹائٹس کا شکار ہو کر گئے۔ ایک اولاد ننھیال میں رل گئی اور دوسرے کی بچیوں نے جسم فروشی شروع کر دی مکافات یوں سامنے آیا۔

اصغر سکول کے بزنس سے وابستہ تھا اور خاصا کما رہا تھا اسے بزنس میں توسیع کے لئے کچھ رقم کی ضرورت پڑی تو ایک دوست سے نصف پر شراکت کر کے ایک بڑی رقم اس سے لے لی بعد میں اختلافات ہونے پر رقم سے مکر گیا اور حلف بھی دے دیا چونکہ گواہ کوئی تھا ہی نہیں حالانکہ یہ اللہ کا حکم ہے لہٰذا دوست کو کچھ نہ ملا۔ تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کے بھائی کا ... ہوا جو کہ چار رہا تھا۔ لڑکا بھی تباہ ہو گیا اور بھائی بھی مر گیا بعد میں ... یہی تھا جو اس نے ... کی کھائی ہوئی رقم سے لیا تھا۔

اکبر سکول ٹیچر تھا اول تو وہ سکول میں ٹک کر بیٹھتا ہی نہ تھا اور اگر افسران کے ڈر سے بیٹھنا بھی پڑتا تو بس بیٹھتا ہی تھا پڑھاتا کچھ نہیں تھا۔ امتحان میں نقل لگوا کر بچوں کو پاس کرا لیتا اور سزا سے بھی محفوظ رہتا۔ جب مکافات عمل کا سلسلہ شروع ہوا تو سب سے پہلے تو اس کے بچے اعلیٰ تعلیم میں ناکام ہوئے اور پھر بری صحبت میں پڑ کر جرائم کی راہ پر چل نکلے ایک لڑکا ڈکیتی میں گرفتار ہوا اور دوسرا اقدام قتل میں۔ اس کی جمع پونجی ان کو چھڑانے اور کیس لڑنے میں خرچ ہوگئی حتیٰ کہ کرپشن سے جو زمین لی تھی وہ بھی بیچنا پڑی۔

تاشیر کی ڈیوٹی سرحدی علاقے میں تھی اور اس کا اکثر و بیشتر باڑے میں آنا جانا رہتا تھا جہاں سے الیکٹرونک اور دوسری اشیاء سستے داموں مل جاتی تھیں جنہیں وہ دوستوں کو مہنگے داموں بیچ کرتا تھا۔ دوگنا تگنا حتیٰ چار چار گنا تک اور ساتھ ہی دوستوں پر احسان بھی جتاتا اس کے علاوہ وہ موقع بہ موقع دوستوں پر بطور قرض رقمیں بھی لیا کرتا تھا جو اس نے کبھی واپس کرنے کی زحمت نہیں کی جب کوئی تقاضا کرتا تو اپنے حالات کی ایک دردناک تصویر پیش کرتا کہ دوسرے کو خاموش ہونا پڑتا اور اسے خدشہ ہوتا کہ واپس کیا ملنا ہے کچھ اور نہ دینا پڑ جائے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی رقم سے اس نے عزیزوں کے ساتھ مل کر لکڑی کا کاروبار شروع کیا تو عزیزوں نے لکڑی بیچ بیچ کر رقم اس کو دینے کی بجائے کھانا شروع کر دی حتیٰ کہ وہ کاروبار ختم ہو گیا پھر اس نے جمع پونجی سے ٹینٹ سروس کا کام شروع کیا اور ساتھ چھوٹے بھائی کو بٹھایا جو نشئی ہو گیا اور دکان کا سامان بیچ بیچ کر نشہ پورا کرنے لگا جو بڑا سامان بچ گیا تھا یعنی دیگیں وغیرہ وہ ایک ڈکیتی میں پار ہو گئیں ممکن ہے اس میں بھی چھوٹے بھائی کا ہاتھ ہو یوں وہ ساری جمع پونجی اور جی پی فنڈ وغیرہ رقم سے لیا تھا۔

ضائع کر کے اب معمولی پنشن اور چھوٹے موٹے کام کر کے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

فیصل کے مالی حالات نہایت کمزور تھے اس نے ہجرت کی اور مناسب جگہ دیکھ کر چھوٹا سا پھٹہ لگا لیا دن رات محنت کے بعد قسمت نے یاوری کی اور وہ دکان بنانے میں کامیاب ہو گیا پھر اس نے مکان اور دکان خرید لئے پھر یہ سلسلہ رکا نہیں اور بیس پچیس سال میں کروڑ پتی ہو گیا۔ پہلے پہل وہ پوری زکوٰۃ نکالا کرتا تھا جب اس کی جمع پونجی بڑھی تو زکوٰۃ کی رقم بھی بڑھ گئی اس نے اس کے حساب سے زکوٰۃ دینے کی بجائے برائے نام زکوٰۃ دینے کا سلسلہ شروع کیا ایک دن شارٹ سرکٹ سے اس کی دکان میں آگ لگ گئی اور لاکھوں کا نقصان ہو گیا اور شہزاد جو باقاعدگی سے زکوٰۃ نکالا کرتا تھا کبھی اس کا نقصان نہیں ہوا بلکہ اس کے حالات بہتر ہوتے گئے۔

کینسر ایک تکلیف دہ مرض ہے اور اب اس کا کسی قدر علاج بھی موجود ہے کئی مریض کینسر کے باوجود ٹھیک ٹھاک زندگی گزار رہے ہیں لیکن کچھ ایسے مریض بھی مشاہدے میں آئے کہ جو سائل ہونے کے باوجود کینسر سے سسک سسک کے مرے حالانکہ علاج بھی بہت کیا ایک۔ مریض نے پوتوں کی شدید حق تلفی کی کیونکہ ان کا باپ نہیں رہا تھا۔ ایک مریضہ نے بچوں کے رشتوں کے سلسلے میں باپ کی نافرمانی کی تھی دو مریضاؤں نے سسرال میں بڑا غلط رویہ اختیار کیا اور قطع رحمی کا باعث بنی تھیں۔

شہریار کو عملیات کا شوق تھا اور اس شوق میں وہ کالے جادو تک پہنچ گیا وہ کالے جادو کے ذریعے لوگوں کے جائز ناجائز ہر قسم کے کام کرنے لگا لوگوں نے اپنے دشمنوں کے کاروبار، اولاد وغیرہ اس سے بند کرائے اور کئی گھروں میں جدائیاں ڈلوائیں۔ اس نے مال تو بڑا کمایا لیکن اس کے چہرے پر لعنت برستی تھی اس کے گھر ایک بچہ اور بچی معذور پیدا ہوئے اور اس کی اولاد کے رشتے نہ ہو سکے اور ایک آدھ کا ہوا تو طلاق ہو گئی خود اس کی موت بڑے عبرت ناک انداز میں ہوئی۔

فیاض اسم بامسمّٰی تھا اس کی فیاضی رشتے داروں تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ عام تھی وہ کسی ضرورت مند کو خالی نہیں لوٹاتا تھا اس نے کتنے ہی رشتہ داروں کو پڑھا لکھا کر ان کو ان کے پاؤں پر کھڑا کیا کتنے ہی لوگوں کو مالی امداد دی کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کر سکیں شاید اسی کا صدقہ ہے کہ وہ ہمیشہ لاکھوں میں کھیلا اور کاروباری اتار چڑھاؤ کے باوجود شاندار گھر، گاڑی اور دکان خرید لی اور اور بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی جن میں سے ایک انجینئر اور ایک سائنسدان بن کر اس کے خوابوں کی تکمیل کا باعث بنے۔

کتنے ہی منہ زور بھرے جوانوں نے اپنی جوانی طاقت اور اختیار کے زعم میں معصوم جوانیوں کو تاراج کیا اور پھر قلم یا غلط روپیہ کر سمجھا کہ اس کی قیمت ادا کر دی اور ابھی تو قیمت دینے کی ابھی ابتدا تھی لیکن مکافات عمل سے وہ بھی نہ بچ سکے کوئی گردے ختم ہونے سے شوگر میں مبتلا ہو کر Dialysis کراتا کراتا سسک سسک کر مر گیا کسی نے کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے نشہ آور دواؤں کا استعمال شروع کیا جس کی انتہا ہیروئن پر ہوئی اور اس کا تمام مال جائیداد اور صحت ٹھکانے لگ گئی اور وہ محتاج اور بھکاری ہو کر مرا۔ کسی کی اولاد اس کے نقش قدم پر چلی اور اس کی عزت ساکھ اور دولت کو ٹھکانے لگا دیا کسی کی بیٹی یا بہن نوکر کے ساتھ بھاگ گئی یا ڈاکو اٹھا لے گئے اور وہ معاشرے میں عبرت کا نشان بن گئے جنہوں نے اسے مکافات عمل یا قدرت کا انتقام سمجھ کر صبر کیا وہ پھر بھی کم نقصان میں رہے لیکن جنہوں نے غیرت میں آ کر قتل وغیرہ کر دیئے وہ تباہ و برباد ہو گئے۔

◆❖◆

بات ہے رسوائی کی

جرم کے بعد ہر مجرم کا سینہ نفسیاتی قید خانہ بن جاتا ہے
جس میں ہر لمحہ اسے ضمیر کا تھانیدار کوڑے مارتا رہتا ہے۔

☆ دستگیر شہزاد
0300-9667909

20

فروری کی صبح عائشہ تھانہ سول لائن آئی اور اس نے انسپکٹر نبیل مغل کو اپنے شوہر ابوبکر کی گمشدگی درج کرنے کی درخواست کی۔ نبیل مغل نے گمشدگی درج کر کے معاملے کی جانچ ایس آئی حسنین شاہد کے سپرد کر دی۔ جب حسنین شاہد نے عائشہ سے پوچھ گچھ کی تو عائشہ کی متضاد باتوں اور اس کے غیر ضروری رونے پیٹنے سے انہیں عائشہ پر شک ہو گیا مگر اپنا شک ظاہر کیے بغیر انہوں نے عائشہ سے کہا ٹھیک ہے تم جاؤ، ہم ابوبکر کو تلاش کرتے ہیں۔

تھانے سے عائشہ سیدھی اپنے کرائے کے کمرے پر گئی۔ ایک بیگ میں ضروری سامان بھرا پھر اپنی بہن سحرش کے گھر آ پہنچی۔ وہاں سے دونوں بچوں کو لے کر میکے چلی گئی۔ بچوں کو ننھیال میں چھوڑا اور شام تک واپس سحرش کے گھر آ گئی۔ میکے سے اس کا بھائی بھی ساتھ آیا تھا۔

ادھر جب عائشہ اپنے کمرے سے ضروری سامان لے کر گئی تھی مکان کے باہر سادہ لباس میں کھڑا کانسٹیبل حمزہ شہاب اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے عائشہ کو بیگ کاندھے پر لٹکائے ہوئے جاتے دیکھ کر یہ بات فون پر حسنین شاہد کو بتا دی۔

22 فروری کی صبح سحرش کے فون پر مدثر کا فون آیا، وہ عائشہ سے فون پر بات کرنا چاہتا تھا۔ چونکہ عائشہ کے پاس فون نہیں تھا اس لیے وہ سحرش کے فون پر بات کر رہا تھا۔ سحرش نے عائشہ کی بات مدثر سے کرائی۔ فون پر کچھ دیر بات کرنے کے بعد عائشہ کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ اسے غصے میں دیکھ کر سحرش نے سبب پوچھا تو عائشہ نے بتایا مدثر کہہ رہا تھا کہ بسنت والے دن شراب کے نشے میں اس کا ابوبکر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ ہاتھا پائی کے دوران غصے میں مدثر نے اس کا قتل کر دیا اور لاش ایک جگہ پھینک دی۔ کہنے کے ساتھ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''اس کمینے نے مجھ کو بیوہ بنا دیا''۔ وہ بین کرنے لگی۔ ''میرا تو سب کچھ لٹ گیا''۔

گھر میں موجود سبھی یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ ابوبکر قتل ہو چکا ہے۔

''ہمیں یہ بات فوراً پولیس کو بتا دینی چاہئے''۔ بہنوئی طاہر احمد نے کہا۔

''ہمارے بیچ میں تم کون ہوتے ہو ٹانگ اڑانے والے''۔ عائشہ غصے سے چیخ پڑی۔ ''تمہیں پولیس کے سوا کچھ سوجھتا بھی ہے؟''

اس کی یہ بات سن کر سحرش سے نہیں رہا گیا، تین دن سے بہن کو بین کرتے دیکھ کر وہ خود پریشان تھی۔ اس نے عائشہ کے گال پر ایک کرارا طمانچہ جڑ دیا اور چیخی۔

''چپ...... ایک دم چپ! اب تو ایک لفظ نہیں بولے گی۔ یار بدلنے کا تیرا شوق میں خوب جانتی ہوں۔ اب تو مدثر پر الزام لگا رہی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تو نے ہی مدثر کے ساتھ مل کر اپنے شوہر کو اوپر پہنچایا ہے اور اب پارسا بننے کا ڈرامہ کر رہی ہے''۔ اس کے ساتھ ہی سحرش طاہر احمد کی طرف گھومی۔ ''طاہر! بند کرو اسے کمرے میں اور فوراً پولیس کو فون کرو۔ پولیس کا ڈنڈا چلے گا تو خود ہی بتائے گی سچائی''۔

سب کچھ کرو گالی دے دو، برا بھلا کہہ دو، تھپڑ مار لو مگر یاد رکھو! دوراہے پر آ کر کسی کا ساتھ مت چھوڑ دو بندہ بے بس ہو جاتا ہے۔

قابلِ اعتبار اکثر قاتلِ اعتبار ہوتے ہیں۔

طاہر پولیس کو فون کرتا، اس سے پہلے ہی پولیس سحرش کے گھر پہنچ گئی۔ دراصل پولیس کی نظروں میں عائشہ پہلے ہی مشتبہ ہو چکی تھی۔ حسنین شاہد نے جب اس کے کمرے کی تلاشی کروائی تو اس کا شک پختہ ہو گیا۔ اسی سبب پولیس نے مکان مالک کی موجودگی میں مدثر اور عائشہ کے کمروں کے تالے تڑوا کر کمروں کا معائنہ کیا۔

کمرے کی دیواروں پر خون کے گہرے داغ تھے جنہیں کھرچنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے دیوار میں اس جگہ مقتول کا سر پچخا گیا ہو۔ فرش کو گھس گھس کر دھونے کے نشانات بھی موجود تھے۔ مدثر کے کمرے کی تلاشی سے پولیس کو یہ اندازہ لگا کہ ابوبکر کا قتل اسی کمرے میں کیا گیا تھا۔ پھر لاش کو دوسرے کمرے میں بوری میں بھر دیا گیا۔ اس کے بعد آدھی رات مدثر اپنے کسی دوست کے ساتھ لاش ٹھکانے لگا کر فرار ہو گیا۔

پولیس کو سراغ اور ثبوت ملے تو عائشہ کی تلاش میں سحرش کے گھر پہنچ گئی۔ عائشہ کو پوچھ گچھ کے لئے تھانے لے جانے خود حسنین شاہد پولیس ٹیم کے ساتھ آئے تھے۔ عائشہ کے ساتھ طاہرہ اور سحرش کو بھی تھانے لے جایا گیا۔ تھانے میں تو پتھر بھی بول پڑتے ہیں، عائشہ تو کمزور دل کی گناہ گار تھی۔ اس نے پولیس کو ساری بات سچ سچ بتا دی۔

"مدثر کہاں ہے؟" اس بارے میں عائشہ کچھ نہیں بتا سکی۔ تب انسپکٹر نبیل مغل کی ہدایت پر پولیس نے مدثر کو جال میں پھانسنے کے لئے تھانے میں ہی ایک منصوبہ بنایا۔ حسنین شاہد نے سحرش سے کہا آپ مدثر کو فون ملائیے۔ عائشہ فون پر اس سے کہے کہ پولیس کو ہم پر شک ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ پولیس ہمیں پکڑ کر جیل میں ٹھونس دے، ہم ایسی جگہ بھاگ چلیں جہاں پولیس کے فرشتے بھی ہمیں تلاش نہ کر سکیں۔ سحرش نے مدثر کو فون لگا کر عائشہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ بُری طرح خوف زدہ عائشہ نے مدثر سے وہی کہا جیسا حسنین شاہد نے اسے کہنے کے لئے کہا تھا۔

"آج شام پانچ بجے بند روڈ بس کے سٹیشن کے باہر آ کر ملو۔" مدثر نے کہا۔

پانچ بجے سے پہلے ہی حسنین شاہد ماتحتوں کے ساتھ سادہ لباس میں بند روڈ بس کے سٹیشن گیٹ نمبر 2 کے پاس پہنچ گئے۔ ساتھ میں عائشہ بھی تھی۔ مدثر کے آتے ہی

☆.....انسان سب کچھ بھول سکتا ہے سوائے ان لمحوں کے جب اُسے اپنوں کی بہت ضرورت تھی اور وہ دستیاب نہ تھے۔

☆.....دلوں میں فرق پڑ جائے تو اتنا یاد رکھنا کہ تمام دلیلیں ومنطقیں اور فلسفے بے کار ہو جاتے ہیں۔

میں دو گھنٹے بیت گئے مگر سات بجے تک بھی مدثر نہیں آیا۔ پھر مایوس ہو کر پولیس پارٹی عائشہ کو لے کر تھانہ سول لائن آ گئی۔

پولیس کو مدثر نہایت ہی گھاگ قسم کا لگ رہا تھا۔ وہ پولیس کی چال بخوبی سمجھ گیا تھا۔ اب اسے پکڑنے کے لئے انسپکٹر نبیل مغل نے ایڈیشنل ایس ایچ او احمد جنید کی سرکردگی میں ایک ٹیم بنا دی۔ اس ٹیم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مدثر کے موبائل فون کو سرولانس پر لگوا دیا۔ یعنی فون کے ذریعے اس کی لوکیشن اور آنے جانے والی کالیں ٹریس کی جا سکتی تھیں۔

لیکن لوکیشن کا علم نہ ہو سکا۔ وجہ یہ تھی مدثر نے اپنا فون ہی بند کر دیا تھا۔ ٹیم نے کئی جگہ تلاش کیا لیکن مدثر نہیں ملا۔

29 فروری کی صبح مدثر کا فون چالو ہو گیا۔ فون کی لوکیشن چاہ میراں میں ایک بلڈر کے آفس کے آس پاس تھی۔ پولیس نے ایک لمحہ ضائع کئے بنا وہاں پہنچ کر مدثر کو دبوچ لیا اور تھانہ سول لائن میں لے جا کر اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو وہ پولیس کو ورغلانے لگا کہ اسے ابوبکر کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے مگر جب اس کے سامنے عائشہ کو لایا گیا تو وہ سمجھ گیا کہ اب جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مدثر نے اپنے جرم کی ساری داستان سنا دی۔

اس کے بعد عائشہ کے بیانات سے جرم کی ایک حیرت انگیز کہانی سامنے آ گئی۔

لاہور کا باشندہ ابوبکر زیادہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا البتہ

اُسے دنیاداری کی سمجھ بوجھ تھی۔ شہر میں لوگ اس کی کافی عزت کرتے تھے۔ چودہ سال قبل اس کی شادی قادر آباد کی عائشہ سے ہوئی تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی۔ ابوبکر اُسے پا کر بہت خوش تھا۔ وہ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ شادی کے آٹھ سال بعد عائشہ نے ایک بیٹی کو جنم دیا پھر دو سال کے وقفے کے بعد اس کے ایک اور بیٹی پیدا ہوئی۔ دو بیٹیاں ہونے کے بعد گھر کا خرچہ بڑھا تو ابوبکر کو آمدنی بڑھانے کی فکر ہوئی۔ وہ قصور آ گیا اور ایک راج مستری کی شاگردی اختیار کر لی اور راج مستری کا کام سیکھ لیا۔ کام چلنے لگا تو اس نے عائشہ اور بچوں کو بھی قصور بلا لیا اور کرائے کا ایک کمرہ لے کر رہنے لگا۔

عائشہ خوبصورت تو تھی مگر کردار کے لحاظ سے ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے تھے تبھی سے وہ بہک گئی تھی۔ شہر میں کئی نوجوانوں سے اس کے تعلقات تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جو بھی عائشہ کے حُسن پر ریجھتا عائشہ اُس پر اپنے حُسن کی چاندنی کی ٹھنڈی چھاؤں کی چادر تان دیتی۔

قصور میں ابوبکر کا راج مستری کا کام اچھا چلنے لگا تو عائشہ کو کھلا آسمان مل گیا اور اس کے پَر پرواز کے لئے پھڑ پھڑانے لگے۔ عائشہ کی یہی بے چینی اور اضطراب اسے مدثر کی آغوش میں لے گیا۔

پہاڑ نگر کے رہنے والے جاوید کا بیٹا مدثر کئی سال پہلے قصور آیا تھا۔ اس نے بھی پہلے راج مستری کا کام سیکھا۔ وہ کافی تیز دماغ اور چلتا پرزہ قسم کا بندہ تھا اس لئے وہ جلد ہی ٹھیکے لے کر لوگوں کے مکان بنوانے کا کام کروانے لگا۔ اس کام سے خوب کمائی ہونے لگی۔ اس نے ایک بائیک بھی خرید لی اور مہنگے مہنگے کپڑے پہننے لگا۔

ابوبکر جس مکان میں کرائے پر رہتا تھا مدثر بھی اسی مکان میں ایک کمرے میں رہتا تھا۔ وہ اکیلا ہی رہتا تھا، اس کے ٹھاٹ باٹھ دیکھ کر عائشہ اسے رشک بھری نظروں سے دیکھتی اور سوچتی میں نے بھی تو ایسا ہی شریک حیات چاہا تھا مگر مجھے ملا ایک سیدھا سادہ مزدور۔

ایک ہی مکان میں رہتے رہتے ہوئے جب ابوبکر کے کنبے اور مدثر کے درمیان نزدیکیاں بڑھیں تو حسین عائشہ مدثر کی نظروں میں چڑھ گئی۔ عائشہ کو وہ بھابی کہتا تھا۔ عائشہ بھی اس کا چھوٹا موٹا کام کر دیتی تھی۔ مدثر اپنے کمرے کی چابی عائشہ کو دے جاتا تا کہ شام کو پانی آنے پر وہ اس کے لئے پانی بھر دے۔ اس طرح دونوں دھیرے دھیرے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

مدثر کے پاس پیسہ آیا تو وہ شراب بھی پینے لگا۔ وہ روزانہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر شراب کی چسکیاں لیتا۔ مدثر نے ابوبکر سے بھی دوستی گانٹھ لی تھی اور اس کو بھی پلاتا تھا۔ دونوں ساتھ بیٹھ کر شراب پینے لگے۔ ایک رات مدثر نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ابوبکر کو اتنی پلائی کہ وہ بے سدھ ہو گیا۔ اور اسے کچھ ہوش نہیں رہا اور مدثر کو من کی مراد پانے کا موقع مل گیا۔ اس رات عائشہ چپکے سے مدثر کے کمرے میں گھسی تو صبح ہونے سے پہلے نہیں نکلی۔ عائشہ کے شباب کا نشہ ہی ایسا تھا کہ مدثر نے اپنے پلے سے روزانہ ابوبکر کو شراب پلانا شروع کر دی۔ دھیرے دھیرے ابوبکر شراب کا عادی ہو گیا۔ نشہ زیادہ ہونے لگا تو وہ کام سے بھی ناغہ کرنے لگا۔ جس سے کام ملنا بند ہو گیا۔ تب اس نے راج مستری کا کام چھوڑ کر بوجھ ڈھونے والا ٹھیلہ چلانا شروع کر دیا۔

مدثر ہر رات ابوبکر کو اتنی پلا دیتا کہ صبح دس بجے تک وہ سوتا رہتا۔ اس دوران عائشہ مدثر کے کمرے میں چلی جاتی اور رات بھر دونوں خوب عیش موج کرتے رہتے۔

ایک رات ابوبکر پی کر بے سدھ ہوا تو کچھ دیر بعد اس کا جی متلایا۔ متلی اور قے سے اس کا نشہ اچاٹ ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے وہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد آہٹ پا کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ یہ دیکھ کر حیرت

میں پڑ گیا کہ عائشہ دبے پاؤں بیڈ سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلی تھی اور باہر سے اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ ابوبکر کو شک ہوا کہ عائشہ کہیں مدثر کے کمرے میں تو نہیں گئی، گئی تو کیوں گئی؟

اس کیوں کا مطلب جب اس کی سمجھ میں آیا تو وہ تڑپ کر بیڈ سے اٹھا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جو دو کمروں کے درمیان تھا۔ وہ دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ایک کنڈی اس طرف تھی دوسری مدثر کی طرف۔ دونوں کنڈیاں بند رہتی تھیں۔ ابوبکر نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائی تو وہاں کا نظارہ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی عزت و غیرت ایک غیر مرد کی بانہوں میں تھی۔ غم و غصے سے ابوبکر پوری رات جاگتا رہا۔ اسے اب ساری سازش سمجھ میں آگئی تھی۔ صبح چار بجے عائشہ کنڈی کھول کر کمرے آئی تو اس نے ابوبکر کو بیدار پایا۔ وہ اسے ہی گھورے جا رہا تھا۔

”آگئی منہ کالا کر کے“۔ ابوبکر نے جلتی آواز میں کہا اور غصے سے فرش پر تھوک دیا۔

”اوہ! تم نے سب کچھ جان لیا“۔ عائشہ بے حیائی سے مسکرائی۔

غصے میں ابوبکر نے عائشہ کے بال پکڑ لئے پھر اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”کیوں کیا تم نے میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا؟“

عائشہ نے ابوبکر کے ہاتھوں سے اپنے بال چھڑا کر اسے پرے جھٹکا پھر ناگن کی طرح پھنکاری۔ ”دھوکا تمہارے ساتھ تب ہوتا جب میں مدثر کے ساتھ بھاگ گئی ہوتی۔ وہ تو میرے ساتھ اپنی دنیا بسانے کے لئے مرا جا رہا ہے، میں ہی انکار کرتی ہوں۔ تمہارے ساتھ رہ کر مجھے کیا ملا؟ صرف محرومی اور آنسو۔ مدثر مجھے سب کچھ دیتا ہے میک اپ، کپڑے، جوتی...... وہ میرے ارمان پورے کرتا ہے اور میری بیٹیوں کا بھی خیال رکھتا ہے۔ تمہیں بھی شراب پلا دیتا ہے۔ اس کے عوض میں اسے خوش کر دیتی ہوں تو کیا بُرا ہے۔ مجھے تو اس سودے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی“۔

”تو پھر تُو کوٹھے پر ہی بیٹھ جا“۔ ابوبکر چیخا۔ ”سودا ہی کرنا ہے تو کھل کر کرو تجھ میں اور ایک رنڈی میں کیا فرق ہے؟“

”میں اپنی بیٹیوں کا منہ دیکھ کر چپ ہوں“۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ پھر چیخا۔ ”ورنہ تُو میرے ہاتھوں ماری جاتی۔ اب غور سے سن لے آئندہ تُو نے ایسا کیا تو میں تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا“۔

”یہ تو وقت بتائے گا“۔ عائشہ نے بے خوفی اور بے حیائی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”دیکھوں گی کون کس کے ٹکڑے کرے گا“۔ یہ کہہ کر وہ بستر میں گھس گئی۔

ابوبکر نے ا صبح مدثر کے کمرے پر جا کر اسے خوب بُرا بھلا کہا اور صاف صاف وارننگ دے دی کہ وہ آئندہ کبھی اس کے گھر نہ آئے۔ یا تو وہ یہاں سے کمرہ چھوڑ دے یا پھر وہ خود ہی یہ گھر خالی کر دے گا۔

ابوبکر اب بیوی پر نظر رکھنے لگا، وہ یہ مکان بھی بدل لینا چاہتا تھا۔ کچھ گھنٹوں کے لئے کام پر جاتا پھر دیسی شراب کا پوا غٹک لیتا۔ نشہ چڑھتا تو اسے بیوی کی بے حیائی یاد آجاتی وہ سیدھا گھر پہنچتا اور عائشہ کو گالیاں بکتے ہوئے اس کی پٹائی شروع کر دیتا۔

وقت آگے بڑھا، عائشہ اور مدثر کے اچھے دن چلے گئے تھے۔ مدثر عائشہ کے حصول کے لئے تڑپ رہا تھا اور عائشہ ابوبکر کے ظلم سے عاجز تھی۔ ایک دن دونوں ملے اور ابوبکر کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور منصوبے پر عمل کرنے کے لئے انہوں نے 25 فروری کا دن چنا۔ 25 فروری بسنت میلے کا دن تھا اور مدثر نے صبح سے ہی شراب پینا شروع کر دی تھی۔ پھر انگریزی شراب کی بوتل لے کر

ابوبکر کے کمرے پر پہنچا تو ابوبکر سمجھ گیا۔

''آؤ یار! آج آخری بار ہم جام ٹکرائیں''۔ مدثر نے بڑی عاجزی سے کہا۔ کہ پچھلی بار جھگڑا ہو گیا تھا۔'' کوتاہی میری ہی تھی، ہاتھ جوڑتے ہوئے ... بھائی میں اپنے کیے کے لئے تم سے معافی مانگتا ہوں''۔

ابوبکر شراب کا پکا عادی ہو چکا تھا۔ وہ مفت کی شراب دیکھ کر وہ رہ نہ سکا اور شراب کے لالچ میں اسے معاف کر دیا۔ دونوں پینے بیٹھ گئے۔ آدھے گھنٹے میں بوتل ختم ہو گئی۔ مدثر نے کم پی ابوبکر کو زیادہ پلائی۔ ابوبکر نشے میں جھومنے لگا۔ تبھی مدثر نے ابوبکر کے سامنے عائشہ کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا یہ دیکھ کر ابوبکر چیختا ہوا اٹھا اور مدثر کو مارنے دوڑا لیکن نشے میں اتنا چور تھا کہ مدثر کو کیا مارتا خود مدثر نے ابوبکر کی گردن دبوچ لی پھر اس کا سر دیوار سے پٹخنے لگا اور تب تک پٹختا رہا جب تک ابوبکر کے جسم میں جان رہی۔ سر پھٹنے سے کافی خون نکلا پوری دیوار لال ہو گئی۔

لوگ اس دن گلی میں چھتوں پر بسنت کی خوشیاں منا رہے تھے۔ اس لئے کافی شور و غل تھا۔ ابوبکر کے دونوں بچے گلی میں پھر رہے تھے۔ ابوبکر کے گھر میں ہونے والا شور شرابا کسی نے نہیں سنا۔

''لاش کو کہاں پھینکو گے؟'' عائشہ نے مدثر سے پوچھا۔

''تم فکر مت کرو میں نے لاش ٹھکانے لگانے کا انتظام پہلے ہی کر لیا ہے''۔ مدثر نے کہا۔ ''بس، تم ان بچوں کو لے کر کہیں چلی جاؤ''۔

عائشہ فوراً باہر نکلی اور بچوں کو لے کر ملتان روڈ واقع پھوپھو کے گھر چلی گئی۔ دوپہر کے بعد وہ بچوں کو لے کر واپس کمرے میں پہنچی تو عائشہ نے دیکھا کہ مدثر اپنے دوست ابوذر کے ساتھ مل کر ابوبکر کا سر دھڑ سے الگ کر رہا تھا۔ ابوذر و مدثر دونوں کے ہاتھوں میں خون آلود چاقو تھے۔ یہ خوفناک منظر دیکھ کر دونوں بچیاں ... نے آنکھیں تو مدثر نے بچیوں کو ... پکڑا پھر چاقو لہراتے ہوئے بولا۔ یہ بات کسی کو بتائی تو مار دوں گا۔ بچیاں ... سہم گئے۔ عائشہ ... بہن سحر کے گھر چلی گئی۔

منصوبے کے مطابق مدثر نے ... پلاسٹک کے بورے ... رکھے ہوئے تھے۔ دوست ابوذر کی مدد سے اس نے دھڑ بوری میں لپیٹ کر باندھا اور سر کو بھی اسی طرح بوری میں لپیٹ کر باندھا پھر رات بارہ بجے بوروں کو ابوبکر کے سامان ڈھونے والے ٹھیلے پر رکھ کر شاہدرہ کی جھاڑیوں میں پھینکا اور سر اور چاقو کو دریائے راوی کے قریب پانی سے بھرے گڑھے میں پھینک کر دونوں گھر واپس لوٹ آئے۔ رات دونوں نے ابوبکر کے کمرے کی صفائی کی لیکن خون کے کچھ چھینٹے دیوار اور فرش پر رہ گئے۔

مدثر کی نشاندہی پر پولیس نے رائے ونڈ سے ابوذر کو بھی گرفتار کر لیا اور پھر دونوں کو ساتھ لے جا کر جھاڑی میں پھینکے گئے بورے میں بند دھڑ اور گڑھے سے ابوبکر کا سر اور چاقو برآمد کر لیا۔

جرم کے بعد ہر مجرم کا سینہ نفسیاتی قید خانہ بن جاتا ہے جس میں وہ مسلسل سزا بھگتتا رہتا ہے۔ ابوبکر کی لاش برآمد ہونے کے بعد سول لائن تھانے میں یہ معاملہ قتل کے تحت درج کر لیا گیا۔ اس کیس کے تینوں ملزموں مدثر و ابوذر اور عائشہ کو پانچ مارچ کو سیشن کورٹ میں پیش کیا گیا۔

عدالت نے تینوں کو عدالتی حراست میں جیل بھیجنے کا حکم دے دیا جہاں وہ اپنے کیے کی سزا تو بھگتیں گے ہی لیکن آخرت میں جو عذاب تیار ہے وہ الگ ہے۔

***

جہاں پھول کھلتے تھے

ہم انسان تلخ حقائق پر گریہ تو کر سکتے ہیں مگر انہیں تبدیل نہیں کر سکتے۔ غلطی ہم سے ہوتی ہے ورنہ فطرت نے تو ہمیں حقوق و فرائض کا مکمل دستور عطا کیا ہے۔

0345-6875404

"جنید!"، سپرنٹنڈنٹ جیل ڈی ایس پی سعد نے اپنے دفتر کی کھڑکی سے صدا لگائی مگر پھر چونک کر رہ گیا۔ ہتھکڑیوں میں جکڑا ہوا جوان اس کا لخت جگر نہیں تھا، مگر اس سے بلا کی مماثلت رکھتا تھا۔ سعد کا دل بے قابو ہو کر دھڑکنے لگا۔ اس نے ماتھے پر لرزاں پسینے کے قطروں پر حیرت ملی پریشانی میں ہاتھ پھیرا اور جیب سے رومال نکال لیا۔ پھر بے ساختہ مڑ کر اپنے ڈپٹی کی طرف دیکھا، جو کرسی پر براجمان واقعات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

"سر! دل نہیں مانتا مگر یہ بدبخت ان تین دہشت گردوں میں شامل ہے جنہیں موت کی سزا سنائی جا چکی ہے"۔ ڈپٹی نے اپنے افسر کو بتایا۔ سعد کے چہرے پر بکھرے ہوئے نقوش میں دکھ کا تاثر ابھر آیا۔ وہ استفہامیہ نظروں سے ڈپٹی کی طرف دیکھتا رہا۔ "یس سر! یہ وہی خطرناک مجرم ہیں جو رات گئے یہاں بھیجے گئے ہیں۔ آپ کے حکم پر ان کے لئے مخصوص کوٹھڑیاں تیار کروا دی گئی تھیں اور جیل میں سکیورٹی بھی بڑھا دی گئی ہے"۔ ڈپٹی نے مضبوط لہجے میں رپورٹ دیتے ہوئے باس کو مطلع کیا، پھر ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہوا جو مسلسل بج رہا تھا۔

"سر! آپ کے لئے گاڑی تیار ہے، آپ ابھی تو سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔ باغ نگر میں آپ کی رہائش کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے"۔ ڈپٹی نے سعد کو آگاہ کیا۔

سعد نے اپنے ماتحت افسر کی طرف تحسین بھری نظروں سے دیکھا، پھر فوراً ہی اپنی کیپ سر پر سجائی اور آغاز سفر کا اشارہ دے دیا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ رکا، اپنے دفتر پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ "آپ کے حوالے"۔ اپنے ڈپٹی کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ساتھ ہی اس کے قدموں کی حرکت میں تیزی آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی جیپ باغ نگر کی جانب فراٹے بھر رہی تھی۔ اسے وہاں زیر تعمیر جیل کا معائنہ کرنا تھا اور متعلقہ سکیورٹی نظام کے حوالے سے تجاویز کو آخری شکل دینا تھی۔

باغ نگر سعد کے لئے بظاہر اجنبی علاقہ نہیں تھا، مگر گزرے ہوئے وقت کے ساتھ اجنبی ہو چکا تھا۔ علاقے کے خدوخال اس کے ذہن میں ابھرے تو مخصوص آب و ہوا کی تازگی اس کی روح میں اتر گئی۔ کبھی وہ بصد شوق وہاں جایا کرتا تھا۔ بچپن میں والدین کے ہمرکاب ہوا کرتا، مگر بعدازاں اسے فقط ان کی اجازت کی ضرورت پڑا کرتی تھی۔ پھر غم دوراں نے اسے شکنجوں میں جکڑ لیا۔ پولیس سروس اپنانے کے بعد وہ اس طرف کبھی نہیں جا سکا تھا۔ اب اس محکمے میں آئے اسے بیس برس بیت چلے تھے۔ جب آخری بار باغ نگر گیا تو اس دم وہ بی اے کا طالب علم تھا۔

ماضی کے سمندر میں اترا تو مضطرب موجیں اس کے فکری سفینوں پر ٹکرانے لگیں۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا تو حسن فطرت کے مناظر نے اس کے موسموں کی بلاخیزی کو قدرے سکون سے ہمکنار کر دیا۔ اس نے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پا لیا، پھر اپنی آنکھیں موند لیں۔ سکون ملا تو اس کے خیالات آبی جھرنوں میں گھرے ایک گھروندے پر مرکوز ہو گئے، جس کا آنگن گلوں کی تاب سے دہکا کرتا تھا۔ گہنا اسی گھر کی باسی تھی۔ رشک حور، کیف بھری وادیوں میں حسن فطرت کا شاہکار۔

"میری گہنا"۔ سعد زیر لب بڑبڑایا۔ یک دم اسے ہنگام کے تاریک سلسلوں میں عہد ماضی کے جھروکے وا دکھائی دینے لگے تھے، جن میں یادوں کے دیئے ہواؤں کے دوش پر جھلملا رہے تھے۔ اس لو نے سعد کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ مدت بعد ان یادوں کو کھوجنے لگا جو اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں دفن ہو چکی تھیں۔

○●○

وہ سعد کی نوعمری کا دور تھا، اس کی عمر کوئی بیس برس ہوگی، جب وہ بی اے کا امتحان دے کر نتیجے کا انتظار کر رہا تھا کہ تفریح کا خیال اس کے جی میں سمایا اور وہ باغ نگر پہنچ گیا۔ کرائے کے بنگلے میں اترا ہی تھا کہ اس کی نظر گہنا پر پڑ گئی، جو تازہ پھولوں کے گجرے چنگیر میں سجائے وہاں آن پہنچی تھی، پھر یہ جان کر شرمندہ سی ہوگئی کہ شہری بابو تنہا ہی بنگلے میں مقیم ہوا تھا۔ سعد نے اس کا حسن دیکھا تو جی جان سے اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اسے بس دیکھتا رہ گیا، پھر گہنا نے اسے چونکا دیا۔

''کیوں بابو! چھوہری کیا کبھی نہیں دیکھی؟'' اگلے لمحے یہ کھنکتی ہوئی آواز قہقہے میں ڈھل گئی۔

سعد حواس میں لوٹا تو اپنا سب کچھ ہار چکا تھا۔ اسے سنبھلنے میں چند لمحوں کی دیر لگی۔

''تم کون ہو؟'' بے اختیار اس نے پوچھ لیا۔

اسے بدحواس پا کر گہنا پھر ہنس پڑی۔ چہرے کی کھلتی ہوئی چمک اب اس کے نینوں میں بھی مچلنے لگی۔

''گویا میری محنت آپ کے کسی کام نہیں آسکتی''۔ اس نے خوش رنگ گجروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سعد کی آنکھیں بدستور گہنا پر گڑھی رہیں۔ ''ایسے کیوں دیکھ رہے ہو مجھے؟'' گہنا نے میٹھے سے لہجے میں احتجاج کیا۔ اس بیچ سعد خاصا سنبھل چکا تھا، لفظوں کو تولتے ہوئے بولا۔

''سوچتا ہوں، قدرت نے تمہیں موتیے کی کلیوں سے انسانی قالب میں ڈھال کر ذوق پرستوں پر کتنا بڑا احسان کیا ہے''۔ سعد کی جرأت نے گہنا کو چونکا دیا۔ اس کی اجلی رنگت میں گلوں کی سرخی دوڑ گئی، پھر پسینے کے موتی جھریں پھولوں میں شبنم کی طرح اس کے عوارض پر مچلنے لگے۔

گہنا تو چلی گئی مگر سعد کو روح تک گھائل کر گئی۔ اس روز اس نے گہری چوٹ کھائی تھی، شب بھر اسی کے خیالوں میں کھویا رہا، جاگتا رہا، کروٹیں بدلتا رہا۔ چاند سا چہرہ بار بار اس کی آنکھوں میں لہرانے لگتا۔ وہ سکون سے اس قدر عاری ہوا کہ اگلے روز صبح سویرے اپنی گل بکاؤلی کے ہاں پہنچ گیا قسمت کا دھنی نکلا، جونہی اسے صحن گل ہی میں نظر آگئی اس دم باغیچے میں گلرنگ آتش پوری طرح دہک رہی تھی۔ گہنا انہماک سے تازہ پھول چن رہی تھی۔ اس کی نازک انگلیاں گل و خار میں الجھی ہوئی تھیں۔ سعد کو مقابل پا کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی، پھر اس کے عوارض میں وہی گلاب مہکنے لگے جن کی جھلک سعد کو دیوانہ بنا چکی تھی۔

''ماں، بنگلے والا بابو آیا ہے''۔ گہنا نے فوراً من کا چور ماں کے حوالے کر دیا۔ ماں کا جہاندیدہ چہرہ سلوٹوں سے اٹنے لگا اور آنکھوں میں اندیشے الجھنے لگے۔ سعد نے ذہانت دکھائی، جو ماں کو سنبھال لیا، پھر اسے دلاسہ دیتے ہوئے مدعا لبوں پر لے آیا۔

''خالہ! مجھے تازہ گلوں کی نوکری چاہیے، کمرے کی سجاوٹ کے لئے۔ حسن و زیبائش کا مرقع''۔ وہ بولا۔ آخری لفظ اس نے دھیرے سے کہے۔

''بابو! تو ماں کے پاس بیٹھ جا''۔ گہنا لجائی۔ ''مجھے یقین ہے کہ تو نے صبح چائے بھی نہیں پی ہوگی۔ مجھے بس تھوڑا سا وقت چاہئے، ابھی نوکری تیار ہو جائے گی''۔ وہ اپنی جرأت کو شرافت کا لبادہ پہناتے ہوئے بولی۔ پھر اپنے کام میں جت گئی۔ اس نے کئی انواع کے پھولوں کا انتخاب کیا، پھر انہیں مرتب کیا۔ سعد کو ہر پہلو تجیں گلوں سے حسین لگا۔ اس نے کئی بار اس کی جانب چور نگاہوں سے دیکھا۔ چند بار پکڑا بھی گیا اور شرمندہ ہوا۔ جس پر خالہ مسکرانے لگی۔

''جہاندیدہ عورت میرے باپ کی طرح تھانیدار لگتی ہے''۔ اس نے ذہن میں سوچا۔ ''وہ لوگ نہیں

اپنے روندے جانے کا دھڑکا لگا رہے، ہمیشہ رحم وکرم کے طالب رہتے ہیں"۔ خالہ نے کہا تو وہ ڈر سا گیا۔ اسے لگا جیسے خالہ اس کا ذہن ٹٹول چکی تھی۔

اس روز کے بعد گہنا علی الصبح خود ہی بنگلے پہنچ جایا کرتی تھی۔ بنگلے کا ملازم فجر کے وقت بیرونی دروازے کھول دیا کرتا تھا۔ اس وقت سعد سیر کے لئے جایا کرتا تھا۔ گہنا اپنے گھر سے بنگلے کی جانب دیکھا کرتی تھی۔ سعد جونہی سبک خرامی کے بعد بنگلے میں داخل ہوتا، گہنا وہاں آجایا کرتی تھی۔

ایک شب برکھا ٹوٹ کر برسی تھی۔ گہنا علی الصبح جاگی تو بوندوں کی رم جھم جاری تھی۔ گلوں کے دامن آبی موتیوں سے مالامال تھے۔ کلیوں میں تازگی کا نکھار بھی سہانا دکھتا تھا۔ ہلکی میگھا میں گہنا نے پھولوں سے ٹوکری سجائی تو اس کے اپنے من میں بھی کلیاں کھلنے لگیں۔ تمناؤں کے گلزار مہکنے لگے۔

اُس روز گہنا بنگلے میں پہنچی تو بھیگ چکی تھی۔ بوندیں گلچیں کی زلفوں میں بھی نکھر گئی تھیں، جہاں گلوں نے اچھوتے رنگ سجادیے تھے۔

سعد نے پھولوں کی ٹوکری سنبھالی تو گہنا اس کے قریب تر آگئی۔ سعد نے خوبصورت سبدِ گل میز پر سجاد دی۔ اس دم برکھا انگڑائی لے کر مچل اٹھی۔ سعد نے بے اختیار گہنا کو کنج محفوظ میں کھینچ لیا۔ پھر نسوانی خود سپردگی کا طلسم نمو پانے لگا۔ دو اجسام سانسوں کی حدت میں پگھلنے لگے۔ شوخ گلابوں کا لہو گہنا کے گالوں میں اتر آیا۔ اس کے لب لرزنے لگے۔ سانس باہم الجھنے لگے۔ برکھا ٹوٹ کر اتنا برسی کہ تراوت ذی روحوں میں گہرائیوں تک اتر گئی۔

عمر کی ناپختگی تھی، یا شعور کی بالیدگی میں کمی، جو سعد اور گہنا اپنے جذبوں پر قیود نہ لگا سکے اور معاشرتی پیچیدگیوں کی پرواہ کے بغیر باہمی میل جول میں لاپروا رہے۔ گہنا چپکے سے بنگلے میں آجایا کرتی تھی، جہاں وہ سعد کے ہمراہ کچھ وقت گزارتی۔ بے قابو چاہت کا یہ پہلو نوع آدم کو راس نہیں آسکتا تھا۔

ایک روز بنگلے کے ملازم نے قیامت ڈھادی، اور ایسا کھیل کھیلا کہ بستی والوں نے پریموں کو یکجا پا کر بنگلے کا گھیراؤ کرلیا۔ اس انبوہ میں گہنا کے رشتہ دار بھی شامل تھے، جن کا طیش وغضب دیدنی تھا۔

"اس بگڑے امیرزادے نے ہماری برادری کی یتیم لڑکی کو خراب کیا ہے، ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔ اس کے علاوہ بھانت بھانت کی غضبناک بولیاں بار بار ابھرتی تھیں۔ غارت گری ہو بھی جاتی مگر چند افراد سعد اور گہنا کو بچانے کی کوشش کررہے تھے جو غصیلے لوگوں کے نرغے میں بُری طرح سہم گئے تھے۔

سعد کو کچھ سجھائی نہ دیتا تھا جبکہ گہنا مسلسل رو رہی تھی۔ اس نے ماں کے کئی تھپڑ بھی کھائے تھے۔ معاملہ اتنا بڑھا کہ بستی کے بڑوں کو متحرک ہونا پڑا جنہوں نے اس کشیدہ صورتِ حال پر قابو پانے کی تدبیر کی۔ اسی روز شام کے وقت کرتا دھرتا افراد کا اکٹھ بنانے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اس کے بعد ملزم کو بنگلے میں پابند کردیا گیا۔

سعد کے سر پر سوار عشق کا بھوت ہوا ہو چکا تھا اور اب وہ کسی طرح پیچیدہ مسئلے سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا مگر حالات کا دھارا اس کے مخالف نظر آتا تھا۔ اس دور میں مواصلاتی نظام ارتقائی دور میں تھے۔ کسی سے فوری رابطہ قائم کرلینا ممکن نہیں تھا، سعد اپنی قسمت کو کوستا اور غلطیوں پر پچھتاتا رہ گیا۔

ادھر گہنا کی بس ایک ہی رٹ تھی۔ "مروں یا جیوں، سعد کی ہو چکی ہوں، اس کے بنا نہیں رہ سکوں گی"۔ وہ بار بار کہتی۔ جب اس پر جسمانی تشدد بڑھ جاتا تو وہ تقاضا کرتی کہ اسے مار دیا جائے۔ مار پیٹ نے باعث اس کے منہ اور ناک سے لہو بہنے لگا تھا۔

شام، اکٹھ کے وقت پریمیوں کو مجرموں کے طور پر بڑوں کے سامنے لایا گیا۔ دونوں زخمی تھے اور اس ہیئت میں لیلیٰ مجنوں نظر آتے تھے۔ اب انہیں سنگساری کے مراحل درپیش تھے کیونکہ عمومی ردعمل حدوں سے بڑھا جاتا تھا۔

''ہم نے کوئی ایسا بڑا جرم نہیں کیا''۔ سعد نے حوصلہ کر کے بستی والوں کو بتا دیا مگر اس کی آواز شوریدگی میں دب کر رہ گئی۔

''دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا جائے''۔ بڑوں نے عجلت میں فیصلہ دے دیا۔ اس بابت صرف چند شوریدہ سروں کے بیان سنے گئے۔

''کیا سعد کے رشتہ دار، احباب آپ لوگوں کا فیصلہ تسلیم کر لیں گے؟'' گہنا کی ماں نے گھبرا کر پوچھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ پا سکی۔

''یہ نکاح ابھی ہوگا، ہماری موجودگی میں، جیسا کہ ہمارے ہاں روایت ہے''۔ ایک باعزت بڑے نے حکم سنا دیا۔

''قاضی صاحب کو بلایا جائے''۔ ایک دوسرے معتبر نے تانا کہا۔

تھوڑی دیر بعد بستی کے افراد کی موجودگی میں سعد اور گہنا کا نکاح وقوع پذیر ہو گیا۔ بند گہنا کو تشفی آمیز لگا ہو گا مگر سعد کے لئے یہ رسم قتل سے کم نہیں تھا۔

'بڑے قاضی صاحب دو روز میں بستی پہنچ جائیں گے، اس وقت نکاح کے کاغذ مکمل کروا لوں گا''۔ قاضی صاحب نے وضاحت کی۔ بدنظمی اس دم اپنی انتہا پر نظر آئی۔ بندھن کے دیگر مراحل کسی کی نظر میں نہیں تھے۔

رسم نکاح کے بعد بستی کے لوگ اپنے آپ کو سرخرو قرار دیتے رہے، مگر گہنا کی ماں پر گہری تشویش کے آثار واضح تھے۔ بوڑھی عورت اندیشوں میں مبتلا تھی۔ وہ دیگر وجوہ کے باعث بھی پریشان تھی۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ بستی کے معتبر افراد کی تواضع کے لئے اقدام کر سکتی۔

''تنگدستی گھرانوں کی عزت داری میں نقب کی راہیں ہموار کرتی رہی ہے''۔ گاؤں کے معزز بڑے نے بستی کی محفل برخاست کرتے ہوئے کہا۔

گہنا کی ماں گھر لوٹ کر بے انتہا روئی۔ اس نے بیٹی کو خوب کوسا اور اس کے چہرے پر ایک بار پھر تھپڑوں کی بارش کر دی جو اب ذہنی اور جسمانی سزاؤں کے باعث تھک ہار چکی تھی۔ تھوڑی دیر صبر سے مار کھاتی رہی پھر بے ہوش ہو کر دھڑام سے پھولوں کی روش میں گر پڑی۔ یہ ماجرا دیکھ کر اس کی ماں اور بھی پریشان ہو گئی اور اونچی آواز میں رونے لگی۔ رشتہ داروں نے اسے سنبھالا، بتایا کہ اس کی لاٹری نکل آئی تھی۔ اس کی بیٹی امیر زادے کی بیوی بن چکی تھی۔

''سعد لڑکی کو پسند کرتا ہے، اسے اپنے ساتھ شہر لے جائے گا۔ جلد ہی امارت اس غریب گھرانے کے قدم چوم لے گی''۔ انہوں نے کہا، پھر گہنا کو بھی باور کرایا کہ اب اسے سعد کے ساتھ ہی رہنا چاہئے۔

دو روز بعد ایک کار سعد کے بنگلے میں آن رکی۔ گہنا اس دم اپنی ماں کے گھر تھی۔

''تمہاری امی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ فوری طور پر میرے ساتھ شہر واپس چلو''۔ سعد کے کزن نے اسے بتایا۔ خبر سن کر سعد سکتے میں آ گیا۔ اس کی جیسے جان نکل گئی، دل ڈوب گیا۔ لمحہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کر زمین پر گر پڑتا، کزن نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ سعد اب حواس باختہ ہو چکا تھا، اس کی سوچنے اور سمجھنے کی قوت مسدود دکھائی دیتی تھی۔

اس دم بنگلے کا ملازم بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ سعد کا سامان اس کے کزن نے گاڑی پر لادا اور وقت ضائع کئے

بغیر دونوں شہر کی راہ ہو لئے۔ گاڑی پر سعد بری طرح پریشان تھا اور مسلسل رو رہا تھا۔ وہ ماں کی صحت یابی کے لئے دعائیں بھی مانگ رہا تھا۔ گھر واپسی کا یہ سفر آٹھ گھنٹے پر محیط تھا، جس کے دوران ہی یہ علم ہو گیا کہ اس کی ماں انتقال کر گئی تھی۔

ماں کی وفات کا صدمہ سعد پر کوہ گراں کی طرح گرا۔ یہ سانحہ خاندان نے بڑی مشکل سے برداشت کیا۔ اس کے والد بھی ان دنوں اچانک صدمے سے انتہائی پریشان تھے۔ مرحومہ گھریلو معاملات میں روح رواں تھی۔ اس کی موت کے بعد گھر میں حیات سسکنے لگی۔ سعد کی کائنات میں بھی رنگ اسی کے دم سے تھے جو ماند پڑے، تو اسے ہر سو تاریکیاں دکھائی دینے لگیں۔ والد کے ساتھ اس کا رشتہ فاصلوں پر مبنی تھا، جنہیں پاٹنے کی جسارت وہ کبھی نہیں کر سکا تھا، نہ ہی والد نے کبھی اس کی طرف اپنے بازو وا کئے تھے۔ وہ پرانے دور کے جابر تھانیدار تھے اور عادتاً اپنا دبدبہ گھرانے پر بھی مسلط کئے رکھتے تھے۔ مرحومہ خاتون ہی زیادہ تر باپ اور بیٹے کے درمیان روابط کا ذریعہ تھی، مگر اب پُر ملال سانحے کے بعد سعد اور اس کے والد ایک ہی گھر میں اجنبیوں کی طرح رہنے لگے تھے۔

چند روز اس طور گزرے ہوں گے کہ سعد کی زندگی میں ایک بڑا انقلاب آ گیا۔ اسے پولیس اکیڈمی کی طرف سے کال لیٹر موصول ہو گیا۔ اب اس کا کیریئر شروع ہو رہا تھا۔ اسے فوری طور پر ابتدائی تربیت کے لئے بلا لیا گیا تھا۔ گھر سے اس طرح نکلنا سعد کے لئے مفید ثابت ہوا۔

اکیڈمی میں وہ اس قدر مصروف ہو گیا کہ تن و من کا ہوش بھی نہ رہا۔ رات گئے کہیں فرصت میں ماں یاد آتی تو وہ غمزدہ ہو جاتا۔ کبھی والد کے حالات تصور کر کے پریشان ہوتا لیکن کبھا کا بھولا بھٹکا خیال وہ ذہن سے جھٹک دیتا۔ لڑکی کا روپ اس کے خیالوں میں محض ناقابل تلافی خطا کے طور پر ابھرتا تھا جس پر زیادہ سوچنا وہ دل و دماغ پر لمحوں کا عذاب سمجھا کرتا تھا۔

تربیت ختم ہوئی تو اسے پہلا اسٹیشن اپنے شہر میں مل گیا۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی۔ ڈیوٹی کے بعد روزانہ وہ اپنے گھر آ جایا کرتا تھا۔ زیادہ تر اپنے والد کے ساتھ رہتا، جو اب سہاروں کے متلاشی نظر آتے تھے۔ ان میں جینے کا ولولہ ماند پڑ رہا تھا۔ کبھی وہ اپنے اور بیٹے کے بیچ حائل فاصلے مٹانے کی کوشش کرتے مگر ناکام رہتے۔ اس پہلو جو وہ برسوں بو چکے تھے، کبھی اس پر پچھتانے لگتے۔

''بیٹا گھر کے دروازے مجھے اب بند دکھائی دیتے ہیں، جی چاہتا ہے کہ ہم انہیں کھولنے کی کوشش کریں''۔ ایک شام انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں سعد سے کہا اور پھر بے چارگی کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا''۔ سعد نے والد کو جواب دیا۔ متفرق خیال اس کے ذہن میں ابھرنے لگے۔

''دیکھو بیٹا! تمہاری ماں کے بل بوتے پر یہاں گہما گہمی جاری رہتی تھی، یہ مکان گھر نظر آتا تھا۔ یہاں دوست احباب آتے رہتے تھے۔ موجودہ حالات پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ تمام گھرداری نوکر چاکروں پر منتقل ہو گئی ہے، جو گھر کے ہمدرد نہیں کہلا سکتے۔ کبھی کھانا مجھے بھی بنانا پڑتا ہے۔ مرحومہ تو چلی گئی، ہمیں ہر طرح محروم کر گئی۔ میں چاہتا ہوں کہ اب تم گھر کی ذمہ داریاں سنبھال لو، میرا مطلب تمہاری خانہ آبادی سے ہے۔ سچ یہ ہے کہ عورت کے بنا گھر نہیں چلا کرتے''۔

سعد کے والد نے گفتگو میں متوازن ٹھہراؤ رکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں مدعا کہہ دیا۔ سعد پر بجلی سی کوند پڑی، پھر ان شعلوں میں ایک مایوس چہرہ سلگنے لگا جو جلد ہی میں جل کر خاکستر ہو گیا۔ ایک لرزش سی سعد کے بدن

میں دوڑ گئی۔

سعد کے والد نے گھرانے کی امیدوں کا دیا گھر کے طاقچے میں فروزاں کر دیا تھا، جس کی لو میں وہ اپنی راہیں بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ اس اچانک تقاضے نے البتہ سعد کے دامن ضمیر میں انگارے بھر دیے تھے، کچھ خوف کے الاؤ بھی روشن تھے جو اس کے دل و ذہن میں بھڑکنے لگے تھے۔ سہارا جس کو اپنا کر گہنا اس کی ذوق حیات میں قیام کر سکتی تھی، اب منوں مٹی تلے دفن ہو چکا تھا۔

والد سے شادی پر مکالمے کے بعد سعد کو احساس ہوا کہ وہ وجود جو اس کے خیالوں میں کبھی کبھار چند لمحے اپنی جوت جگایا کرتا تھا، اب مستقلاً اس کے دماغ میں معلق ہو گیا تھا۔ اگر واقعی وہ لمحوں کا عذاب تھا تو اب وہ بے حد بڑھ گیا تھا۔

چند روز بعد سعد کے والد نے بیٹے کے لئے دلہن کا انتخاب بھی کر لیا۔ نیلم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہترین اوصاف کی مالک لڑکی تھی، جو کسی بھی خاندان کے لئے افتخار کا سرمایہ ہو سکتی تھی۔

سعد کے لئے مسلسل متذبذب ہوئے رہنا قدرتی امر تھا۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ والد کے سامنے اقرار خطا کر لے اور جو سزا وہ دیں، اسے خندہ پیشانی سے قبول کر لے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گہنا کے احباب نے اسے تلاش کر لیا تو اس کی خاندانی زندگی پیچیدگیوں کا شکار ہو جائے گی اور اسے ایسا نقصان پہنچنے کا احتمال ہو جائے گا، جو شاید اس دم ناقابل تلافی ہو، مگر وہ چاہ کر بھی والد کے سامنے اپنے لب نہ کھول سکا۔ سعد کے والد نے بھی بیٹے کے عمومی رویوں میں تغیر بھانپ لیا تھا، مگر وہ اسے اپنا الجھاؤ اگل دینے پر آمادہ نہ کر سکے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ان کے بیٹے کے لئے والد کے ازلی خوف سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ انہی حالات میں اس کی شادی نیلم سے ہو گئی۔

نیلم کی شخصیت میں دلکش خوبیوں کا ایسا اچھوتا پن تھا کہ جس نے سعد کو اپنے طلسم میں جکڑ لیا۔ بعد ازاں نو بیاہتا جوڑے کی خاندانی زندگی خوشنمائیاں سمیٹے یوں رواں دواں ہو گئی کہ سعد کی کتاب زیست میں ماضی کے نقوش پر دوراں کی گرد تہہ در تہہ جمتی چلی گئی اور کئی متعلقہ چہرے اس خاک میں اٹ کر اپنا عکس کھو بیٹھے اور غیر متعلقہ شمار ہونے لگے۔ زیست کے اس سفر میں جو نئے وجود متعلقہ ہوئے، ان میں سعد کی بیٹی مہوش جانِ پدر بنی۔ بعد میں جنید بھی پیدا ہوا۔

◆◆◆

یکایک موسم طوفانی کیفیت میں ڈھل گیا تھا۔ تیز ہوا کے تھپیڑے سعد کی گاڑی سے ٹکرانے لگے۔

''آندھی بہت تیز ہے''۔ ڈرائیور نے پہلو بدلتے ہوئے سعد کو مخاطب کیا، جو اپنے خیالوں کے تلاطم میں گھرا ہوا تھا۔

''ہاں، بادل گھرے دکھائی دے رہے ہیں''۔ اس نے ڈرائیور کو جواب دیا۔ ساتھ ہی گاڑی کا ونڈو چین اوپر کی سمت چلا دیا۔ بوندا باندی کا آغاز ہو چکا تھا۔

''وادی میں موسلا دھار بارش کا امکان ہے''۔ ڈرائیور نے سکرین پر وائپر متحرک کر دیے۔ گاڑی کی رفتار کم کر دی۔

بیس سال قبل سعد نے اس وادی کو ایسے ہی موسم میں الوداع کہا تھا۔ اس روز بھی میگھا ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ دھرتی ابر کی گڑگڑاہٹ میں لرز رہی تھی اور تند ہوائیں پہاڑوں کے سینوں پر سر ٹکرا رہی تھیں۔

طوفان سعد کے ذہن میں بھی دوبارہ بپھرنے لگے تھے۔ مدت بعد گہنا اپنے شخصی عکسوں کے لبادے میں اس کے دماغی پردوں پر مسلسل چھائی ہوئی تھی۔

''نہ جانے وہ کس حال میں ہو گی، میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی؟'' سعد نے خیال کیا۔ اس کا بدن

جذبوں کی آمیزش تلے کپکپانے لگا۔ یکا یک فضا شعلہ بار ہوئی۔ فلک پر زوردار دھماکہ ہوا اور ارض تھرتھرا اٹھی۔ حد نظر تک رعد کا غضب دکھائی دینے لگا۔ سعد کو یوں لگا جیسے برق اس کے اپنے من میں کوند گئی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں اور سر گاڑی کی نشست پر ٹکا دیا۔ ''الامان''۔ اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

ڈرائیور نے گاڑی ایک ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں کھڑی کر دی۔ بیس سال قبل سڑک کے کنارے، صرف ویرانیاں ہوا کرتی تھیں۔ سعد نے یاد کیا۔ اب تو ہر طرف گاڑیوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ اس نے پہلو بدلا، پھر آہ بھری۔

''سر! میں نے آپ کو کبھی اس طرح پریشان نہیں دیکھا''۔ ڈرائیور نے مضطرب لہجے میں سعد سے کہا جو اس پر چونک سا گیا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔

''سر! موسم میں چائے کی حاجت قدرتی بات ہے''۔ اس نے بظاہر معاملہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

سعد باغ نگر پہنچا تو رات چھا چکی تھی۔ دیکھنے میں بستی اب نئے روپ میں ڈھل چکی تھی۔ نئی راہیں اس کی شناسا نہیں تھیں۔ قدرتی دلفریب مناظر کی جگہ مصنوعی خوبصورتیاں دکھائی دیتی تھیں۔ سعد ایک پُرشکوہ عمارت میں اترا، جس کا آنگن گملوں سے لدا ہوا تھا، مگر پھولوں میں اسے نہ تو رنگ بچے اور نہ ہی وہ اس خوشبو سے معطر تھے جو اس علاقے کا خاصہ تھی۔

اس کا ذہن بدستور عہد رفتہ کے سلاسل پر مرکوز تھا۔ اس بھنور سے نکل آنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ احساس جرم، جو کئی سال اس کے ذہنی نہاں خانوں میں پوشیدہ رہا تھا، اب خلش کے عذاب کی صورت ابھر آیا تھا اور اس کے وجود کو ڈس رہا تھا۔ حد درجہ بے قراری کے باعث وہ تمام رات جاگتا رہا، سوچتا رہا مگر اپنا ضمیر مطمئن نہ کر سکا۔

دوسرے دن شام کے وقت اسے فراغت نصیب ہوئی تو وہ تا دیر سڑکیں ناپتا رہا۔ بہت ساری سیر کی، پھر کچھ مقام اسے مانوس نظر آنے لگے۔ اگلے روز اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے چند گلیوں کا انتخاب کیا، پھر ان راستوں پر چل پڑا۔ اچانک وہ گھنا کے اجاڑ پرانے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ مکان دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا، وہ بوکھلا گیا۔ منظر غیر متوقع تھا۔ عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی، دروں پر لکڑی کے تختے شکستہ ہو چکے تھے، جبکہ دیواریں مخدوش دکھائی دیتی تھیں۔ صحن گل مٹی کا ڈھیر بن چکا تھا۔ در و دیوار سے صرف ویرانی ٹپکتی تھی۔ سعد دل مسوس کر رہ گیا۔ کبھی یہ جگہ کتنی پُر رونق ہوا کرتی تھی، اس کے ذہن میں ابھرا۔

پہلے تو سعد اسے وہم سمجھا، مگر بعد ازاں اس کا ماتھا ٹھنکا کہ بستی کے لوگ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ بعض لوگ اس کا نام سن کر ٹھٹک جایا کرتے تھے اور پھر اسے بغور دیکھا کرتے تھے۔ وہ ان چہروں پر بدلتے ہوئے تغیر پا کر حیران ہوا کرتا تھا۔ یہ سرسری ملاقاتیں عموماً غیر یقینی کی فضا میں ختم ہو جایا کرتی تھیں۔ کبھی سوالیہ نظریں اس کا تعاقب کرنے لگتیں، مگر اس کے چہرے پر عموماً ایسا تاثر طاری رہتا تھا کہ لوگ چاہ کر بھی اس کے قریب نہیں آ پاتے تھے اور اس کا شخصی حصار نہیں توڑ پاتے تھے۔ کبھی اسے یہ بھی گمان ہونے لگتا کہ علاقے کے بعض لوگ اسے پہچان چکے تھے۔

ہاشم محکمہ پولیس کا پرانا ملازم تھا۔ افسروں کا خدمتگار تھا۔ سعد کو فرائض کی انجام دہی میں اس کی چابک دستی بہت پسند تھی۔ ہاشم اس کے خاصا قریب تھا۔ وہ پولیس افسروں کی پرانی کہانیاں جانتا تھا کیونکہ ایک عمر

سے محکمے کے ڈاک بنگلے سے منسلک تھا۔ اسے میزبان سٹاف میں معتبر جانا جاتا تھا مگر کسی حد تک باتونی تھا۔ لطیف پیرائے میں پرانے افسروں کی کہانیاں سنانا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ یہ قصے وہ ہر کسی کو نہیں سناتا تھا۔ صرف انہی لوگوں سے گویا ہوتا، جنہیں وہ اس بابت شوقین جانتا تھا۔ فضول باتوں سے اجتناب برتتا اور اپنے رویوں پر دھیان رکھتا تھا۔ سعد جانتا تھا کہ ہاشم اس کی کہانی میں حال اور ماضی کی کڑیاں ملا سکتا تھا۔ وہ اس سے دیگر متعلقہ بھید بھی جان سکتا تھا۔ اپنے تئیں وہ ارادہ کر چکا تھا کہ موقع پا کر ہاشم سے قصہ پارینہ پر بات کرے گا۔

اس شام میگھا ٹوٹ کر برسی تھی۔ گلوں کے چہرے موتیوں سے لد گئے تھے۔ سبزے نے بھی نکھار اوڑھ لیا تھا۔ آبی گزرگاہوں میں پانی بڑھا تو نالوں میں رواں آبی لہریں بھاری پتھروں سے ٹکرانے لگیں۔ شام، ہر سُو گہرا اندھیرا چھا گیا، پھر وقت کے ساتھ برکھا میں تندی بڑھتی گئی۔

سعد کی سوچوں کا تانا بانا موہی گردابوں میں الجھنے لگا تھا۔ ہاشم نے سعد کو زیادہ پریشان دیکھا تو اس کی من پسند بلیک کافی بنا کر لے آیا۔ اس دوران مینہ کی بوچھاڑ نے کھڑکیوں کے پٹ وا کر دیئے تھے۔ ہاشم نے آبی یلغار پر قابو پانے کی کوشش کی تو چند ہی لمحوں میں بھیگ گیا۔ وہ تر لباس کے ساتھ ہی سعد کی خدمت میں حاضر رہا۔ اس نے پلیٹ میں بسکٹ سجائے اور پلیٹ میز پر کپ کے پہلو میں سجا دی۔

''کبھی اندر اور باہر کے موسم مزاجاً یکساں ہو جاتے ہیں''۔ سعد نے بات کی تو وہ چونک پڑا۔ وہ جانتا تھا کہ جذبوں کے کسی بلاخیز موسم میں ایسا لمحہ ضرور آئے گا، جب سعد کا ذہن گزرے وقتوں میں بھٹکنے لگے گا، پھر اس کا ضمیر وہ انجانی داستان کریدنے کی سعی کرے گا، جس کا مرکزی کردار ہونے کے باوجود وہ پتا سے شناسا

نہیں تھا۔ اب وہ سمجھ گیا تھا کہ جذبوں کا دھارا موضوع طرف لے جائے گا۔ وہ اپنی نگاہیں جھکاتے ہوئے بولا۔

''آپ نے بجا کہا سر! وقتوں کے زرخیز موسم بھی بلاخیز جسارتیں جنم دیتے ہیں، پھر یہ کہانیاں بن کر انہی موسموں میں غرق ہو جاتی ہیں''۔

''معلوم نہیں ہاشم، ماہ و سال کے سلاسل میں چھپا ہوا خفتہ تجسس آج ذہنی نہاں خانوں سے کیونکر ابھر آیا ہے؟'' سعد نے معاملہ واضح کرنے کی کوشش کی۔ اب وہ دل شکستہ اور قدرے بے چین بھی دکھائی دے رہا تھا۔

تھوڑی دیر گفتگو میں خاموشی بسی رہی۔ ہاشم سوچوں میں غلطاں ہو گیا جبکہ سعد نے بند کھڑکی کے پہلو میں شیشوں کے قریب جا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ اس بیچ ہاشم دوبارہ گویا ہوا۔

''خواتین کہا کرتی ہیں کہ سعد ایک شاہزادہ تھا جو کہیں دور سے آیا تھا۔ شاید قسمت اسے یہاں کھینچ لائی تھی۔ پھر اس بستی کی ایک لڑکی اسے پسند آ گئی جو پھولوں کی طرح خوبصورت تھی اور گل فروش تھی۔ دونوں کے بیچ پیار ہوا، پھر شادی ہو گئی۔ ایک روز شاہزادہ اچانک غائب ہو گیا۔ اس کی شہزادی، گہنا تمام عمر راہیں تکتی رہ گئی۔ شاہزادہ کبھی لوٹ کر واپس نہ آیا۔ شاید اسے اجل نے نگل لیا تھا۔ اس نے جب بستی چھوڑی تو اس دم طوفانی میگھا برس رہی تھی۔ طوفان نے غالباً اسے شکار کر لیا۔ یوں اس کی گہنا بھی برباد ہو گئی''۔

ہاشم نے بتایا۔ یکایک رعد کڑکی اور طوفانی بارش دھرتی پر غضبناک ہو گئی۔ سعد کا دل دہل کر رہ گیا۔ وہ خاموشی سے ہاشم کی طرف دیکھتا رہا، پھر اچانک بولا۔

''عورتوں کی سوچ سادہ لوحی پر مبنی ہو سکتی ہے، زیرک مرد کیا کہتے ہیں؟''

''سعد ایک دھوکہ باز شخص تھا۔ اس نے سادہ لوح گہنا کو دھوکہ دیا اور موقع پا کر بستی سے فرار ہو گیا۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ اس دم اس کی بیوی حاملہ تھی''۔ ہاشم نے جواب دیا۔ ابر ایک بار پھر زور سے گرجا اور اس کی کڑک طول و عرض میں پھیل گئی۔ سعد کو محسوس ہوا کہ برق نے اس کا خرمن جلا کر بھسم کر دیا تھا اور شعلے اس کے لہو میں بھر رہے تھے۔

''کیا وہ حاملہ تھی؟'' اس کے گلے سے بمشکل نکلا۔ اگلے ہی لمحے وہ جذبوں سے مغلوب، اپنی راکنگ چیئر میں ڈھیر ہو گیا۔

''جی ہاں، سر!'' ہاشم نے جواب دیا اور سعد کے قریب قالین پر بیٹھ گیا۔ آپ نے جاری طوفان کا مشاہدہ کیا سر! کہتے ہیں کہ شدت بھرا طوفان موسم کی ان رُتوں میں ضرور آتا ہے سال میں ایک بار اور یہ ان وقتوں تک سر اٹھاتا رہے گا جب تک برسوں پرانی کہانی مکمل نہیں ہو جاتی''۔ ہاشم نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے لرزنے لگے تھے۔

''کون سی کہانی ہاشم؟'' سعد نے پہلو بدل کر بے چینی سے پوچھا۔

''گزری رُتوں کی روداد ہے سر! اسی وادی میں دو پیار بھرے دل یکجا ہوئے تھے۔ ان کے دلوں میں امنگوں کی کلیاں کھل اٹھی تھیں، پھر زمانے نے ان کلیوں کو مسل ڈالا''۔ ہاشم کھڑکی کی جانب قدم اٹھاتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں بیرونی مناظر پر ساکت ہو گئی تھیں اور لہجے میں تندی سرایت کر آئی تھی۔

اس کا دھیان کہانی پر مرکوز ہو چکا تھا۔ سعد نے جذبوں کی بڑھتی بے قراری میں اپنی راکنگ چیئر چھوڑ دی اور ہاشم کے قریب چلا آیا۔ اس نے بات کرنے کے لیے لب کھولے مگر ہاشم کو گویا پا کر خاموش ہو گیا۔

''ایسے ہی موسموں وہ گلفام باغ نگر آیا تھا''۔ ہاشم نے سعد کی طرف دیکھا، پھر بولا۔ ''وہ نو عمر زندگی سے

بھرپور تھا۔ وادی نے اتنا حسین شخص پہلے کم ہی دیکھا تھا۔
اس نے ہر ملنے والے کو اپنی خوش فطرتی کی طرف راغب
کرلیا‘‘۔ ہاشم نے نگاہیں اٹھائیں، دونوں کی آنکھیں
چار ہوئیں، لمحے رک سے گئے۔ تیز ہوا میں برکھا کا شور
فراز کی طرف بڑھ گیا۔ سعد کے چہرے پر مُردنی چھا گئی
تھی۔ اس نے قریبی میز پر سے پانی کا گلاس اٹھایا تو اس
کے ہاتھ کپکپانے لگے۔

ہاشم جانتا تھا کہ سعد کے وجود میں موجزن جذبوں
کی تندی اس دم طوفانی رُت کے ہم پلہ تھی اور اس نے
اپنے آپ کو پُر عذاب لمحوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اب وہ
خاموشی سے سرگزشت سن رہا تھا۔ رفتہ رفتہ واقعات اس
پر کچھ اس طرح عیاں ہوئے:

’’جوانی کا سہانا دور تھا اور اس دم سماں بھی سہانا
تھا، جب پہلی نظر ہی میں سعد گہنا پر فریفتہ ہو گیا تھا اور اس
کے سامنے دل ہار بیٹھا تھا۔ کچھ یہی حال گہنا کا بھی تھا۔
باہم آنکھیں چار ہوئیں تو وہ چوٹ عیاں ہو گئی، جو دونوں
نے کھائی تھی۔ گہنا نے آنکھیں جھکا لیں، مگر ان نگاہوں
کی تپش اپنے وجود پر محسوس کرتی رہی، جو اسے لمحہ لمحہ
گھائل کر رہی تھیں۔ یہ دونوں پر لڑکپن کی اچھوتی
واردات تھی۔ انہوں نے کائنات میں بکھرے رنگ دیکھنا
شروع کئے تھے کہ ان کی کائنات میں بھی رنگ نکھر گئے۔
دونوں اس وقت شعور کی منزلوں سے دور تھے، کچھ شعور
سے پہلوتہی بھی کرتے رہے۔ ان راہوں پر چل نکلے، جن
کی تمنا دل تو کرتا تھا، عقل نہیں۔

ان کی باہمی ملاقاتوں کے لئے وادی میں بے شمار
مقامات موجود تھے، جہاں وہ عوام الناس کی تجسس بھری
نظروں سے اوجھل رہ سکتے تھے بلکہ گہنا تو پہاڑی جنگلوں
میں پل کر جوان ہوئی تھی، اس نے سعد کو بھی پناہگاہوں
سے روشناس کرا دیا۔ گہنا سعد کے بنگلے میں بھی پہنچ جایا
کرتی تھی، جہاں دونوں عمارت کے آنگن میں بیٹھ کر
خوش گپیاں کیا کرتے تھے۔ شرانگیزی بنگلے کے ملازم نے
کی تھی۔ اس نے دونوں کے تعلقات پر انگلی اٹھائی تھی۔
پھر بات ہر کسی کے ہاتھ سے نکل گئی۔ گہنا کو اس کی ماں
نے سنبھالنے کی کوشش کی مگر بستی کے بڑوں نے عقلمندی
سے کام نہ لیا اور دونوں کی شادی جبراً کروا دی۔ سعد کسی
طور پر بھی ان کے دائرۂ اختیار میں نہیں تھا۔ وہ موقع
پاتے ہی بستی سے چمپت گیا۔ اس طرح گہنا بلائے
ناگہانی میں گرفتار ہو گئی۔ سعد کہاں گیا؟ یہ بھی معمہ بن
گیا۔ اکثر لوگوں نے اسے مجرم قرار دے دیا۔ افواہیں
بھی جنم لیتی رہیں۔ چند ایک نے یہ بھی کہا کہ سعد نے
ان کی آنکھوں کے سامنے پہاڑی چوٹی سے برساتی
نالے میں چھلانگ لگا دی تھی اور یوں طوفانی رات کے
دوران خودکشی کر لی تھی، مگر کوئی بھی لاش تلاش نہ کر سکا۔

شروع میں گہنا کو پختہ یقین تھا کہ سعد جلد اس کے
پاس لوٹ آئے گا۔ اس کے نزدیک وہ اس سے پیار کرتا
تھا اور پریمی دھوکہ باز نہیں ہو سکتے، مگر دن جب تیزی
سے گزرنے لگے تو گہنا بھی مایوس ہونے لگی۔ اب وہ ماں
کی پھٹکاریں کثرت سے کھاتی تھی، جسے غربت میں بیٹی
کا بوجھ ناتواں کندھوں پر بھاری دیتا تھا۔ جب انکشاف
ہوا کہ وہ حاملہ ہو چکی تھی تو ماں بیٹی پر گویا قیامت ٹوٹ
پڑی۔

اس مرحلے پر بستی کے چند لوگوں نے شہر کا رخ کیا
اور سعد کو کھوج نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور
مایوس لوٹے۔ ماں بیٹی سعد کے تعاقب میں شہر نہیں جا
سکتی تھیں البتہ منتیں ماننے جابجا خانقاہوں پر پہنچ جاتیں۔
مختلف عاملوں سے ملتیں اور پیروں کے آستانوں پر پیسہ
لٹاتی رہیں لیکن ہاتھ کچھ بھی نہ آیا۔

عام خیال تھا کہ گہنا کے ساتھ نکاح تحریر میں آ جاتا
تو سعد کبھی یوں غیر متعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ گہنا کے پاس
ایک کاغذ البتہ موجود تھا جو کسی رجسٹر پر شادی سے

مندرجات ظاہر کرتا تھا۔

جلد ہی دوراں وہ وقت لے آیا، جب البڑسی گھنا کے آنگن میں اس کے وجود سے تخلیق پانے والا بھی مہکنے لگا۔ اسے جاوید کا نام دیا گیا۔ دنیا میں ایسے بچے بھی جنم لیتے ہیں جنہیں ماں سے غذا کے طور پر پیار تو مل جاتا ہے مگر ان کے حصے میں کوسنے بھی بہت آتے ہیں۔ توجہ انہیں کم ملتی ہے مگر مدم توجہی کی سزا زیادہ۔ ان کی طرف بددعاؤں میں بھی کمی نہیں آتی۔ انہیں باور کرایا جاتا ہے کہ وہ بلا جواز منحوس نہیں کہلاتے۔ انہیں ملنے والی معمولی خیر سگالی میں رحم اور ترس کے عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ ایسے بچے خودرو پودوں کی طرح پرداخت پاتے ہیں۔ یہ بچے اگر اقرباء سے نفرت کرنا سیکھ جائیں تو یہ پہلو بھی بلا جواز نہیں کہا جاسکتا۔

بنارس باغات کا مالی تھا۔ اس کے گھر میں بھی اسی نوع کا بچہ موجود تھا جسے ماں جنم دیتے وقت مرگئی تھی اور بچے کو باپ نے پانچ برس پروان چڑھایا تھا۔ بنارس مالی اب بچے کے لئے ممتا کی مٹھاس پانا چاہتا تھا اور اس ناطے اپنے گھر آنگن میں بہار بھی۔ وہ گھنا کا گرویدا ہو چکا تھا۔

''یہ کیسا انصاف ہوگا کہ آپ کے بچے کو تو پیار مل جائے مگر میرا لخت جگر اسی پیار سے محروم ہو جائے؟'' گھنا نے دبے لفظوں میں احتجاج کیا مگر اس کی اپنی ماں یہ ناطہ قبول کرنے پر آمادہ ہو چکی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں بیٹی کا گھر بسا دینا چاہتی تھی، خصوصاً جبکہ اس کو خود اپنی زندگی کا بھروسہ نہیں تھا، گھنا کا بچہ البتہ وہ خود اپنا لینا چاہتی تھی۔

معصوم سا بچہ جاوید، شادی کے موقع پر جب اپنی ماں سے جدا ہوا تو محرومیوں نے اس کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ وہ اپنی ننھی سی دنیا میں تنہا رہ گیا، پھر تنہائی پسند ہوتا گیا اور آہستہ آہستہ کئی منفی رویوں کا شکار ہو گیا۔ پیار۔۔۔ محرومی سے اسے سخت گیر اور کٹھور دل بھی بنا دیا تھا۔

سانحے حیات پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں مگر گ: کی زندگی میں یہ بار بار آئے تھے۔ ہر نیا سانحہ پہلے سے زیادہ قیامت خیز ہوتا تھا۔ ایک روز اس کی زندگی کا کڑا المیہ بھی ظہور پذیر ہو گیا۔ اس کی ماں اچانک انتقال کر گئی۔ محلے والوں نے دیکھا کہ بے کس عورت اپنے صحن گل میں گری پڑی تھی اور وہیں ابدی نیند سوگئی تھی۔

ماں کی جدائی گھنا کے لئے تنہائی کا عذاب بن کر اتری۔ الم تو شاید وہ سہہ جاتی مگر ان گھمبیر مسائل کا مقابلہ نہ کر سکی جو اس المیے کے باعث پیدا ہو گئے تھے۔ اس کے خاوند کا رویہ بگڑ گیا تھا۔ سوتیلا بیٹا اسے زہر لگتا تھا اور وہ اسے اپنے گھر میں کسی صورت پناہ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ بچے کو اس بری طرح دھتکار دیتا کہ وہ محرومی کی تصویر بن جاتا۔

آخر گھنا کو یقین ہو گیا کہ وہ حالات کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ اسے اپنے لخت جگر اور خاوند میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اسے اپنانا تھا۔ مسئلہ گو پیچیدہ تھا مگر زیادہ سوچ کا متقاضی نہیں تھا۔ گھنا نے خاوند کا گھر چھوڑ دیا اور بیٹے کو اپنا لیا۔ وہ اجڑ کر آبائی گھر واپس لوٹ آئی اور دس سالہ بیٹے کے ساتھ رہنے لگی۔

دوراں کی گردش میں محو سفر ہوئی تو گھنا کو یقین ہوتا گیا کہ اس کا بیٹا نارمل نہیں تھا بلکہ اس کی نیم پختہ شخصیت نفسیاتی و معاشرتی مسائل کی آماجگاہ بن چکی تھی اور وہ عام بچوں سے یکسر مختلف تھا۔ نوعمر، یاس اور خودرحمی کا شکار تھا، پھر اسے کسی پر اعتماد نہیں تھا اور وہ انسانی رشتوں کو بے معنی قرار دیتا تھا۔ وہ رویوں میں انتہا پسند ہو چکا تھا اور شدید انتقامی احساسات کا حامل دکھائی دیتا تھا، خصوصاً اپنی ماں کے خلاف۔ ماں ہی ایسی ہستی تھی جو اس کے زیر عتاب رہ سکتی تھی اور وہ اسے زخم زخم کرسکتا تھا، رلا سکتا تھا، گو اس صورت میں خود بھی پہروں کڑھتا رہتا۔

ماں جو کہتی، وہ اس کے برعکس کرتا تھا۔ اس پہلو بدتہذیب بھی دکھنے لگتا۔ اس میں اعتماد کی شدید کمی تھی، اس لئے تعلیم میں اس کی دلچسپی معدوم ہو چکی تھی۔ دن کا بیشتر حصہ وہ گھر سے غائب رہتا تھا۔

ماں کو ستانے کی خاطر وہ کئی حربے کرتا۔ پورا پورا دن کھانا نہ کھاتا۔ بے چاری منتیں کرتی رہ جاتی۔ سخت گرمی میں پنکھا بند کر دیتا اور سخت سردی میں گرم لباس سے اجتناب کرتا۔ ہر وہ کام کرتا جس سے ماں کا دل سرزد خطاؤں پر پچھتاتا۔

ماں کی حسرت تھی کہ وہ کسی طرح میٹرک تک تعلیم حاصل کر لے مگر وہ بری صحبت کا شکار ہو گیا۔ اس دور میں ماں نے اس کی بہت منت سماجت کی کہ وہ اپنی روش تبدیل کرے، اس کے آگے ہاتھ جوڑے، اپنی خطاؤں پر معافی چاہی، آنسو بہائے مگر بیٹے سے بات نہ منوا سکی اور مجبور محض بن کر رہ گئی۔ پھر وہی ہوا جس کا احباب کو خدشہ تھا۔ بیٹا امتحان سے قبل ہی گھر سے فرار ہو گیا۔ ایسا گیا کہ اس کی خبر تک نہ ملی۔ ماں اپنی محرومیوں پر روتی رہ گئی۔ وہ چاہ کر بھی اپنی کوتاہیوں کی تلافی نہ کر سکی تھی۔

بیٹے نے گھر چھوڑا تو ماں بھی اپنے مستقبل سے مایوس ہو گئی۔ صحن گل میں مشقت کرتی تو ساتھ آنسو بہاتی رہتی۔ کبھی حالات سے اس قدر مایوس ہو جاتی کہ اپنے لیے اجل کی دعائیں مانگنے لگتی۔ اب وہ جیون کو سزا سمجھنے لگی تھی۔

کڑے حالات کا بوجھ اس کی قلبی صحت پر بھی پڑا۔ رفتہ رفتہ وہ زندہ لاش کی طرح نظر آنے لگی۔ وقت اپنی چال چلتا رہا۔ اسی طرح دوراں کی گرد ماہ و سال پر جمتی رہی۔ پھر اس کی زندگی میں ایک بھونچال اور آیا بستی میں خبر پھیل گئی کہ ایک روز اچانک جاوید کو ملکی سرحد کے قریب جہادی کیمپ میں دیکھا گیا تھا۔ علاقے کا ایک لڑکا کیمپ سے فرار ہو کر اپنی بستی پہنچا تھا۔ اس نے ماضی کے واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ بستی کی مسجد کے قریب نوجوان لڑکے ایک معلم سے ملا کرتے تھے۔ جس نے انہیں افغان جہاد میں حصہ لینے پر ابھارا تھا جاوید اسی شخص کی تعلیمات سے متاثر ہوا تھا۔ بستی کے دیگر لڑکے معلم کے قابو نہ آئے مگر وہ اور جاوید مقدس جہاد میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ دونوں کو مختلف اوقات میں دور دراز علاقوں میں بھجوایا گیا۔ دونوں کے ٹریننگ کیمپ علاقہ غیر میں واقع تھے۔ مذکورہ لڑکے نے جاوید کو وہاں کہیں دیکھا تھا۔

لخت جگر کے بارے میں خبر گہنا پر بجلی بن کر گری۔ اسے اپنا اور بیٹے کا مستقبل خودکش شعلوں میں جلتا ہوا دکھائی دیا۔ جہاد کتنا متبرک ہو سکتا تھا، وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی۔ اس نے بستی کے کرتا دھرتا افراد کے سامنے گریہ زاری کی، جو اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ طویل اور ان تھک محنت کے بعد گہنا بالآخر اس معلم تک پہنچ گئی، جو مختلف آبادیوں سے جہاد کے لئے نوعمر لڑکے جمع کر رہا تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ جاوید کو اسی نے علاقہ غیر میں بھجوایا تھا۔ گہنا کے حالات بھانپنے کے بعد اس کا دل پسیج گیا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی سی کوشش کرے گا کہ جاوید کو گھر واپس پہنچا دے۔

چند روز بعد اس نے گہنا کو اپنی ناکامی کی خبر سنا دی۔ بتایا کہ جاوید کی ٹریننگ مکمل ہو چکی تھی لہٰذا اسے کیمپ سے واپس لانا ممکن نہیں رہا تھا۔ مزید براں نوجوان اب عاقل اور بالغ ہو چکا تھا۔ تلخ حقائق آشکار ہونے پر گہنا کا جسمانی عارضہ تیزی سے بڑھ گیا۔ وہ صحن گل میں مشقت کے قابل بھی نہ رہی۔ زندہ رہنا اس کے لئے اور بھی کٹھن ہو گیا۔

زندگی میں بارہا اس کی تمناؤں کی مالا ٹوٹی اور بکھری تھی مگر جیون کے اس مرحلے پر وہ اس قدر مایوس ہو چکی تھی کہ زندہ رہنے کی آرزو سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ انہیں

چاہتی تھی کہ اس کے سانسوں کی ڈوری چلتی رہے، مگر خلا کو اپنے ہاتھوں سے گلے لگالینا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ہر صبح نئی یاس لئے شام کا انتظار کرتی اور پھر شب گزارنے کی سعی شروع کر دیتی۔ بالآخر ایک صبح تھک ہار کر گر پڑی اور ہسپتال پہنچ گئی پھر وہیں کی ہو کر رہ گئی ہے۔

جاوید تین سال جنگی میدانوں کی خاک چھانتا رہا۔ اس بیچ دنیا نے اسے کئی تجربوں سے ہمکنار کیا۔ اب وہ جہانِ کارزار میں کندن مانا جاتا تھا۔ یہی نہیں، اس کا وجود بھی کڑیل جوانی میں ڈھل چکا تھا۔ کرختگی اس پر طاری ہوتی تو وہ ہیبت ناک دکھائی دینے لگتا تھا۔ دو مدت بعد گھر لوٹا تو صحن گل میں نہال کملائے ہوئے تھے۔ مکان کے دروازے کھلے تھے مگر مکین وہاں موجود نہیں تھے۔ ویرانی در و دیوار پر منڈلا رہی تھی۔ جاوید گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اب اس کا اپنا حلیہ بھی بدل چکا تھا۔ چہرے اور سر کے بال بے ہنگم طور پر بڑھے ہوئے تھے۔ شاید اسی وجہ سے جاننے والے اسے پہچان نہیں پا رہے تھے۔ اس نے محلے میں واقع قریبی کریانہ سٹور کے مالک سے بات کی اور ماں کے بارے میں دریافت کیا، پھر معاملہ جان کر بے حد پریشان ہو گیا۔ وہ خیراتی ہسپتال کے دروازے پر پہنچا تو شام ڈھل چکی تھی۔ اس کے دل پر خوف طاری تھا۔ ماں کی حالت دیکھ کر وہ انتہائی رنجیدہ ہو گیا۔ بے ساختہ اس کے قدم چھو کر معافی کا خواستگار ہوا اور اپنا چہرہ اس کے پیروں میں رکھ کر بُری طرح رو پڑا۔ وہ ماں کے پاؤں چومتا رہا، حتیٰ کہ وہ اس کے اشکوں سے تر ہونے لگے۔ گہنا اپنے طور پر حرکت کرنے سے قاصر تھی، بمشکل بیٹے کو سنبھال پائی، اسے پچکارتی رہی۔

"میرا ہی قصور تھا لختِ جگر! میں نے ہی تمہیں لاوارث کر دیا تھا۔" اب گہنا بھی بُری طرح رونے لگی تھی۔ ماں بیٹا کچھ دیر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے رہے۔ ماں ٹکٹکی باندھے جواں سال کو دیکھتی رہی۔ اس بیچ اس کی آنکھوں میں اشک بھی لرزاں ہو جاتے اور چند چہرے پر پھسلنے لگتے۔ اس حالت میں وہ انتقال کر گئی۔ مرتے وقت اپنے کڑیل بیٹے کی بانہوں میں تڑپتی رہی۔ بیٹا اس کی دنیا میں اس وقت لوٹا تھا جب وہ اس کے کندھا دے کر محض اس کی آخری آرام گاہ تک پہنچا سکتا تھا۔ وہ حواس پر بوجھ لئے ان مراحل سے گزر گیا مگر جب گھر میں تنہا ہوا تو زندگی اس پر بوجھ بن گئی۔ یادوں کے سہارے اس کا جینا مشکل ہو گیا۔ پچھتاوے اس کے ذہن میں ابھرتے تو ان سے تشفی پانا اسے ممکنات سے بعید دکھائی دینے لگتا۔ اشک بھی اسے تسلی نہ دے پاتے۔ کبھی وہ اوہام کا شکار ہو جاتا۔ ایک کمرے میں ماں کا جنازہ دیکھتا تو دوسرے دروازوں کے پیچھے نانی کا جسدِ خاکی۔ ان حالات میں اس کا ذہنی سکون بُری طرح اکارت ہو گیا۔ وہ انسانی روابط سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ اس کے ماضی کے باعث احباب اس سے کتراتے تھے۔ کچھ خود بھی وہ زیادہ ہی اکھڑ مزاج دکھائی دینے لگا تھا۔

کئی دنوں کا عذاب جھیلنے کے بعد ایک شام اس نے قریبی مسجد کی راہ لی۔ نماز کے بعد خدا کے گھر میں وہ بُری طرح رو پڑا۔ اس نے نمازیوں سے التجا کی کہ وہ اس کے لئے ذہنی سکون کی دعا مانگیں اور معمول کی زندگی میں واپس لوٹ آنے میں اس کی مدد کریں۔

اگلے روز اس نے بھرپور مشقت شروع کر دی۔ گھر کا آنگن کھود ڈالا، پھر اسے کیاریوں میں منقسم کر دیا۔ زمین کے حصے بخرے کر کے مٹی کو زرخیز کیا اور گھر میں پودوں کی نرسری کا اہتمام کر لیا۔ اس کی محنت رنگ لائی اور جلد ہی صحنِ گل پوری آب و تاب سے مہکنے لگا۔ شغل ترقی کی طرف بڑھا تو "گہنا نرسری" کی چھت بھی گملوں سے بھر گئی۔ باہر کی جانب متعلقہ سائن بورڈ بھی آویزاں ہو گیا۔ جاوید کو حیات کا یہ مثبت پہلو بھا گیا۔

میں پُرسکون زندگی گزارنے کا جذبہ نمو پانے لگا۔

چند برس اس طور گزرے ہوں گے کہ وطن کی پُرسکون فضاؤں میں بھی فتنہ و تخریب کے شعلے بھڑکنے لگے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ آتش دور دور تک پھیل گئی۔ کئی بے گناہ ہم وطن دہشت گردی کا لقمہ بننے لگے۔ آگ تیزی سے حدیں عبور کرنے لگی۔ ایک تنظیم کے کارندوں نے جاوید کو بھی کھوج نکالا جسے اچانک معلوم ہوا کہ وہ اپنے پُرتخریب ماضی کے باعث دہشت گردوں کا اسیر بن چکا تھا اور اب قتل و غارت گری کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا۔ اسے اپنے ان آقاؤں کے اشاروں پر چلنا تھا جنہوں نے اس کا یہ روپ تخلیق کیا تھا۔

جاوید نے انسانی جانوں کا ناقابلِ یقین ضیاع قریب سے دیکھا تھا مگر اپنے وطن میں اس نوع کے المیے سے بچنے کے لئے اپنی جان خود لے لینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا اگلا مشن کیا تھا۔ اسے یہ پُرخطر کام مرضی کے خلاف فوراً ہی کرنا تھا کیونکہ زبردست کا ٹھینگا اب اس کے سر پر تھا۔

جاوید نے مہیا کی گئی عینک پہنی تو حیران رہ گیا۔ عینک کے فریم میں مائیکرو کیمرے آویزاں کئے گئے تھے۔ اس نے مسجد میں نماز پڑھی تو ساتھ ہی کئی فوٹو بھی حاصل کر لئے جو عمارت اور علاقے میں تخریب کاری کے لئے ضروری تھے۔ اس دوران اس کے دل پر خوف بھی طاری ہوا کیونکہ اس کے طفیل ایسے مقام پر خون خرابہ ہونے والا تھا جو اس کے رب کا گھر قرار دیا جاتا تھا۔

مسجد پر خودکش حملہ ہوا تو وہ اسی علاقے میں موجود تھا بلکہ وہی خودکش بمباروں کو وہاں تک لے کر آیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ تخریبی منصوبہ بقوع پذیر ہوا اور دشمنانِ وطن کی توقع سے بڑھ کر کامیاب رہا۔ ایسی تباہی پھیلی کہ انسانیت رو پڑی۔ بندوقوں نے بےتحاشہ شعلے اگلے، دستی بم بھی پھٹے، پھر رہی سہی کسر خودکش حملہ آوروں نے پوری کر دی۔ نمازِ جمعہ کے دوران خانۂ خدا لہولہو ہو گیا۔

انسانی جسموں کے چیتھڑے ہر طرف بکھر گئے۔ آہ و بکا تھی کہ آسمانوں تلک جاتی تھی۔ کئی افراد شہید ہوئے تو بےشمار زخمی تڑپتے رہے۔ بچ جانے والے اپنے پیاروں کو ڈھونڈتے رہے۔ قیامتِ صغریٰ کا سماں تھا۔ تباہی کے یہ منظر جاوید نے بھی دیکھے تھے، وہ حواس باختہ ہو گیا اور اسی بھگدڑ میں بطور مشتبہ پکڑ لیا گیا۔ اس کے دو اور ساتھی بھی دھر لئے گئے۔

عدالت میں تینوں اشخاص نے اعترافِ جرم کر لیا۔ جاوید واحد شخص تھا جس نے نمازیوں پر فائرنگ نہیں کی تھی مگر وہ اپنا مقدمہ بھرپور طور پر نہ لڑ سکا اور سزائے موت کا مجرم قرار دیا گیا۔ اس کے باقی ساتھیوں کو بھی یہی سزا ملی۔ بعد میں اور گرفتاریاں بھی ہوئی تھیں۔

◆◆◆

ہاشم نے سعد کو اس کی کہانی سنائی تو سمجھ گیا کہ سامع کا دل مندا ہو چکا تھا کہانی کے لفظوں نے اسے ڈس لیا تھا اور اب وہ بری طرح رو رہا تھا۔ اس کا وجود جذبوں کی شدت سے لرز رہا تھا اور اس کی ذہنی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ بری طرح ٹوٹ چکا تھا۔

''میں جاوید سے بھی بڑا مجرم ہوں، بیٹے کا بھی دشمن رہا اور اس کی معصوم صفات ماں کا بھی''۔ سعد نے درد بھری لرزیدہ آواز میں کہا اور دوبارہ اونچی آواز میں رو پڑا۔ اب وہ اپنے اعصاب پر قابو پانے سے قاصر لگ رہا تھا۔

طوفانِ باد و باراں تندی میں عروج پر پہنچ چکا تھا۔ ابر پوری تاب سے دھرتی پر ٹکرا رہا تھا۔ باد بپھر چکی تھی۔ پہاڑ رعد کی گڑگڑاہٹ میں لرز رہے تھے۔ غضب دھرتی پر بڑھتا جا رہا تھا۔ لگتا، بارش کبھی نہیں تھمے گی۔ کیا یہ

خیال سعد کے ذہن میں برق کی طرح کوند گیا۔ باغ نگر روانگی سے پہلے جاوید نامی جوان کو وہ خود پھانسی کی کال کوٹھڑی میں ڈال آیا تھا۔ سعد کے دماغ میں ایک چہرہ معلق ہو گیا۔ اُسے یاد آیا کہ قیدی جاوید اس کے لختِ جگر جنید کا ہم شکل تھا اور دونوں میں اس قدر مماثلت تھی کہ وہ خود بھی دھوکہ کھا گیا تھا۔ بعدازاں وہ بہت حیران بھی رہا تھا۔

''گویا پھانسی کا مجرم میرا اپنا بیٹا تھا''۔ سعد زیرلب بڑبڑایا، اس کے چہرے پر ابھرتے ہوئے تاثر میں اب بلا کی تلخی تھی، الم تھا۔

''ہاشم! میں اسی وقت شہر لوٹ جانا چاہتا ہوں''۔ وہ بےچینی کے عالم میں بولا۔

''مجھے معلوم تھا کہ یہ کہانی آپ کو بہت پریشان کر دے گی''۔ ہاشم کی صورت پر بھی پچھتاوے چھانے لگے تھے۔

''ہاشم! یہ کہانی میرے نصیب کا حصہ تھی، میری لغزش، آخر میرے سامنے آئی تھی''۔ سعد نے دکھے ہوئے لہجے میں بات کی۔

''مجھ سے کوئی خطا سرزد ہوئی ہو تو میں دست بستہ معافی چاہتا ہوں''۔ ہاشم کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

''مجھے واپس جانا ہے، ہاشم!'' سعد نے ارادے کا اعادہ کیا۔

''شب کی ظلمت گہری ہے اور طوفان بھی شدید، سر! آپ ارادے پر نظرثانی کر لیں''۔ ہاشم کے لہجے میں ہمدردی تھی اور انداز منت کا مگر سعد اپنا ذہن بنا چکا تھا۔ کہانی کے تانے بانے اس کے دماغ میں الجھ چکے تھے۔ اب اس کے لئے وہاں ٹھہر جانا بہت مشکل تھا۔ اسی عالم میں اس نے باغ نگر چھوڑا اور شدید طوفانی رات میں شہر کی طرف چل پڑا۔ تمام راستہ وہ طوفانوں سے لڑتا رہا۔ اندرونی تلاطم بیرونی تند موسموں سے زیادہ بلاخیز تھا۔

سعد اپنے شہر پہنچا تو رات گزر چکی تھی اور سحر طلوع ہو رہی تھی۔ اس نے گھڑی پر وقت دیکھا اور ڈرائیور کو جیل اپنے دفتر جانے کا حکم دیا۔ دفتر آنے کا یہ وقت سعد کے لئے نیا نہیں تھا۔ وہ کئی بار ایسے ہی اوقات میں اپنے دفتر آتا رہا تھا، خصوصاً جبکہ اسے پھانسی کے ناگوار مراحل کی نگرانی درپیش ہوا کرتی تھی۔ آج اسے چھٹی حس وہاں لے آئی تھی۔ فوراً ہی اسے جیل میں پھانسی کے اہتمام کا اندازہ ہو گیا مگر شاید اسے آنے میں دیر ہو چکی تھی۔ اس کا ڈپٹی مجرم جاوید کو پھانسی پر لٹکانے کے بعد لوٹ رہا تھا۔ ڈپٹی کے ہمراہ سعد اپنے دفتر پہنچا تو دونوں کے ذہنوں پر جاوید کا آخری سفر چھایا ہوا تھا۔

''حیرت کی بات ہے سر! اس مجرم کا نہ تو کوئی ملاقاتی آیا اور نہ ہی اس نے اپنی کسی آخری خواہش کا اظہار کیا، عجیب شخص تھا، بس چپکے سے مر گیا''۔ ڈپٹی نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''کبھی رشتے بعدازمرگ بھی ظاہر ہو سکتے ہیں''۔ سعد نے ڈپٹی کو جواب دیا۔

''کیا آپ اس کے احباب کو جانتے ہیں؟'' ڈپٹی نے تجسس بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''ہاں، اس کے بدنصیب باپ کو''۔ سعد نے بات کی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''کون ہے وہ؟'' کئی گمان ڈپٹی کے ذہن میں ابھر آئے تھے۔ اس کی صدا تقریباً چیخ کی صورت بلند ہوئی۔

''اس کا باپ تمہارے سامنے کھڑا ہے، دوست! پریشان حال، وہ اپنے بیٹے کی لاش لینے آیا ہے۔ اس کی بانہوں میں اس کے جواں سال لختِ جگر کی لاش ڈال دو''۔ سعد نے کسی حد تک حوصلہ جمع کرتے ہوئے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آیا، سر!'' ڈپٹی اب انتہائی پریشان

نظر آ رہا تھا۔ بات سن کر سعد نے جو زیادہ تیکھے سے بھی تھا دھیرے دھیرے کہا۔

''اس جواں عمر کی رہنمائی میں اس کی زندگی بسر نہیں کر سکا، اب نصیب میرا منہ چڑا رہا ہے کہ میں نے اپنا کندھا دے کر موت کی اندھیری کوٹھری تک پہنچا دیا۔ اس نے اپنی ماں کا چہرہ اس کے مرتے وقت دیکھا تھا، اب اس کی اجل نے مجھے اس سے متعارف کرا دیا ہے۔ ہم ان تلخ حقائق پر گریہ تو کر سکتے ہیں مگر انہیں تبدیل نہیں کر سکتے۔ فطرت نے ہمیں حقوق و فرائض کا مکمل دستور عطا کیا ہے، غلطی ہم ہی سے ہوتی ہے، ہم فطرت کے تقاضوں سے پہلوتہی کرتے ہیں اور وقتی طور پر اپنے آپ کو کامران بھی سمجھنا شروع کر دیتے ہیں''۔ سعد نے بمشکل الفاظ ادا کیے۔

تھوڑی دیر بعد چوہنی گھاٹ سے ایک لاش اس کے بستر تک پہنچ چکی تھی اور وہ غمزدہ اس کے پہلو میں ڈھیر ہوا نظر آ رہا تھا۔

اس وقت وہ انتہائی ماندہ اور بے بس دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اسے ڈپٹی کے سہارے کی ضرورت پڑ گئی۔

◆◆◆

علاقے کے معززین جمع ہو چکے تھے۔ گہنا نرسری کا افتتاح تھا۔ سعد نے فیتا کاٹنے کے لئے قینچی اٹھائی تو اس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ بعد ازاں یہ افتتاح ایک مشہور سماجی شخصیت نے کیا۔ گہنا نرسری اب بنات کی افزائش گاہ نہیں تھی، بلکہ نادار بچوں کی درسگاہ کا روپ دھار چکی تھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ نوتعمیر شدہ عمارت کا صحن اس روز بھی احمریں گلوں سے دہک رہا تھا، مگر اس دم کئی مدعوئین کی آنکھوں میں اشک تیر رہے تھے۔

●○●

دعائے مغفرت

''حکایت'' کی مستقل قاریہ محترمہ **آسیہ خاتون** ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئیں۔

اِنَّ لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مرحومہ ایم اے اسلامیات اور ریٹائرڈ ہیڈ مسٹریس گرلز ہائی سکول سمنز بال تھیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کے درجات بلند فرمائے اور جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ قارئین دعائے مغفرت فرما کر ثواب دارین حاصل کریں۔

یاد رہے، مرحومہ ''حکایت'' کے ہر دلعزیز قلمکار مولانا محمد افضل رحمانی کی بھتیجی تھیں۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔

''حکایت'' کے ایک اور دیرینہ **قاری** **محمد آزاد صاحب** گاؤں مجھوئی ایبٹ آباد قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ادارہ ان کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔ (ادارہ)

غزل

خادم حسین مجاہد

جس کو مسجد میں بھی خدا نہ ملا
اس کو دنیا میں کچھ ملا نہ ملا

تیری بستی کے اتنے لوگوں میں
کوئی بھی مجھ کو باوفا نہ ملا

بانٹ لیتا میں اس سے خیراتیں
مجھ کو لیکن کوئی گدا نہ ملا

جس کی فرقت میں دل تڑپتا رہا
ایک لمحہ بھی وہ جدا نہ ملا

جس نے مانگی پناہ تھی حاکم سے
کوئی دروازہ اس کو وا نہ ملا

کوئی آیا بھی اور چلا بھی گیا
پر مجھے حرفِ مدعا نہ ملا

جس کو پوجا تھا عمر بھر خادم
اُس کے در سے بھی آسرا نہ ملا

ایک ریٹائرڈ ڈی ایس پی کی زندگی میں پیش آنے والے ہنگامہ خیز واقعات

قسط:10 ☆ محمد رضوان قیوم

ہمارا خاندان بھی جب حویلی پہنچا تو وہاں صفِ ماتم بچھا دی گئی تھی۔ بے ہوش ڈاڈو کو پہلے ہی ہسپتال لے جایا جا چکا تھا۔ اسے کلدیپ کی خبر سن کر انجائنا کی تکلیف ہوئی تھی۔ سنتو تائی محلہ کی عورتوں کے درمیان بیٹھی بین کر رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد علاقہ کے تھانیدار نے کہا کہ لاش لانے کے لئے اس محلہ میں سے کم از کم ایک اچھی عمر والا شخص اور تین نوجوان پولیس ٹیم کے ساتھ تھنس گاؤں چلیں۔ پولیس پارٹی کے ساتھ تھنس گاؤں جانے والی محلہ کی چار افراد کی ٹیم میں مجھے بھی شامل کرلیا گیا تھا۔

تھنس گاؤں جانے والی پولیس پارٹی کے ساتھ جہاں محلہ کے ہم افراد بھی شامل تھے وہاں شہر کے سپیشل تھانہ جو (T.I.C) ٹک کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی بھی ایک علیحدہ ٹیم ہمارے علاقہ کی پولیس پارٹی کے ساتھ گئی تھی۔ T.I.C سے مراد Throughly Investigation Cell تھا یعنی اس خاص تھانہ میں اندھے قتل، بڑی ڈکیتیوں جیسے پیچیدہ جرائم کی بڑی باریک بینی، سائنٹفک اور جدید طریقہ سے انویسٹی گیشن ہوتی تھی۔ اس قسم کے خصوصی نوعیت کے تھانے برصغیر کے بڑے شہروں میں قائم تھے۔ T.I.C تھانہ کے ایس ایچ او مسٹر پونم نے مجھے اور محلہ کے ایک بزرگ مولانا نصیر الدین کو اپنی جیپ میں بٹھا لیا تھا۔

ایس ایچ او پونم شکل و صورت، بول چال سے ایک عام روایتی کرخت اور سخت زبان پولیس والوں سے ہٹ کر بڑا خوش اخلاق، ملائم زبان اور سلجھا ہوا انسان لگ رہا تھا۔ دونوں تھانوں کی پولیس جیپیں کھڑے سیلابی پانی کو چیرتی ہوئی تھنس گاؤں کی طرف کچے راستوں سے گزرنے لگیں۔ دوران سفر اس نے کرید کرید کر میرے اور کلدیپ کے بارے میں اتنے الٹے سیدھے سوالات کئے۔ بخدا میرا دل کیا کہ میں اس سے لڑ پڑوں لیکن مجھے اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ T.I.C کا تھانیدار تھا اور وہ ایسا کرنے کا مجاز تھا۔ اس کے ساتھ اس نے مجھے تلقین کی کہ میں [illegible] فلاں کورس کروں جس کی تکمیل کے بعد کسی بھی انٹر پاس کو پولیس میں با آسانی نوکری مل جاتی ہے۔ میں ہوں ہاں کر کے اسے ٹالتا رہا۔

''سنا ہے تمہاری کلدیپ سے بچپن کی دانت کاٹی کی دوستی تھی''۔ تھانیدار نے باتوں باتوں میں کہا۔ ''پچھلے دنوں تمہاری اس سے اور اس کے چچا زاد بھائی ناتھ سے خونی لڑائی ہوئی تھی اور کلدیپ چھری کے وار سے شدید زخمی ہو گیا تھا۔ مجھے ذرا بتلاؤ کہ تمہاری اتنی پرانی گہری دوستی اچانک اتنی کڑوی دشمنی میں کیسے تبدیل ہوئی؟''

میں نے اسے اس لڑائی کی وجوہات اور [illegible] کے بارے میں تفصیل سے بتلایا۔ وہ مجھ سے کافی دیر تک مختلف سوالات کی صورت میں باتیں پوچھنے کے ساتھ ساتھ ایک سفید کاغذ پر کچھ یادداشت لکھتا رہا۔

''ستار! تم نے میٹرک تو کر رکھا ہے''۔ پونم صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''اگر تم اپنے اچھے کیریئر کے لئے تقریباً چار ماہ کے لئے صرف ایک کورس کرنے کی قربانی دو تو تم پولیس میں بھرتی ہو سکتے ہو اور ویسے بھی تم واٹر ڈیپارٹمنٹ میں ایک ہی سیٹ میں جتے رہنے والی نوکری کر رہے ہو۔ میری مانو جیسا میں کہوں ویسا کرلو''۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''مجھے بھلا پولیس کی کون نوکری دے گا؟''

''ارے تم اگر دل سے اس کورس کو کرنے کی نیت اور ہمت کر لو تو میں تمہاری باقاعدہ سفارش بھی کروں گا''۔ پونم صاحب نے کہا۔

دونوں جیپوں کے ڈرائیوروں کے لئے گاڑیاں آگے بڑھانا انتہائی مشکل ہو رہا تھا۔ دونوں جیپوں کے انجنوں سے بڑی دلخراش چرچراہٹ کی آوازیں آ رہی

تھیں۔ نئی جگہ ہماری جیپ چلتے چلتے رکی۔ ڈرائیور، میں نے اور سپاہیوں نے مل کر اسے دھکیلے لگائے۔ ہماری منزل مقصود جب کچھ دور رہ گئی تھی تو ہماری جیپ کا کوئی ایسا پرزہ بڑی زوردار آواز سے ٹوٹ گیا جس سے جیپ بالکل ساکت ہو گئی۔ اسے ڈی آئی سی کی جیپ کے ساتھ رسے کی مدد سے باندھا گیا۔ اگلی جیپ سے سوائے ڈرائیور کے تمام سپاہی بمعہ تھانیدار بھی اتر گیا۔ سب نے پچھلی جیپ کو دھکا لگانا شروع کیا۔ کیچڑ زدہ اور پھسلن والی زمین میں قدم جمانا اور دھکا لگانے کا عمل کسی عذاب سے کم نہ تھا۔

ایک مقام پر دونوں جیپیں رکیں۔ ہمارے علاقہ اور ڈی آئی سی تھانیداروں نے علیحدگی میں کچھ صلاح مشورہ کیا اور پھر مجھے پچھلی جیپ میں بٹھلا دیا گیا اور میری جگہ جولز کا بیٹھا تھا اسے اگلی جیپ میں لے گئے۔ دونوں جیپیں بڑی آہستگی اور احتیاط سے خراماں خراماں سڑک کے اس حصے میں چل رہی تھیں جہاں کا لیول اونچا اور پانی کم تھا۔ مخصوص گاؤں تقریباً چار میل کی دوری پر تھا۔

دونوں جیپیں آگے پیچھے اپنی مخصوص رفتار میں چلتی رہیں۔ کچھ دیر کی مسافت کے بعد پولیس کی یہ دونوں جیپیں ایک حدود میں داخل ہوئیں جہاں کا پورا علاقہ سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ جیپوں کے تمام شیشے اس غرض سے چڑھا لئے گئے تاکہ چھینٹے اڑ کر اندر پانی نہ آئے۔ دونوں جیپوں کے ٹائر پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

"لگتا ہے اس دفعہ برساتی باڑھ نے کچھ زیادہ ہی تباہی مچائی ہے"۔ ہماری جیپ کے ڈرائیور نے کہا۔

"ہاں، واقعی اس میں کوئی شک نہیں ہے"۔ ایک ادھیڑ عمر کانسٹیبل نے کہا۔ "اس بار برصغیر کے کئی شہروں میں پچھلے سالوں کی نسبت شدید باڑھ اپنے ساتھ تباہی لے کر آئی ہے"۔

پولیس کی دونوں گاڑیاں کئی جگہ دلدل کے پانیوں میں پھنسیں۔ انہیں دھکا لگانا پڑا۔ ہم سب لوگوں کے کپڑے کیچڑ میں بری طرح لت پت تھے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ دھکا لگانے والوں میں تھانیدار پونم بھی اپنا برابر کا حصہ ڈال رہا تھا۔ گھٹنوں گھٹنوں گارے زدہ سیلابی پانی سے گزرتے ہوئے ہم سارے لوگ جب گاؤں اس مقام پر پہنچے جہاں اس علاقے کی پولیس اور کچھ لوگ کھڑے تھے ہماری نگاہوں کے سامنے کلدیپ کی ہاتھ بندھی لاش کیچڑ میں اوندھے منہ پڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اس حالت میں دیکھا تو میرا دل بھر آیا۔ میں اپنے دل پر قابو نہ رکھ سکا۔ میں دھاڑیں مارتے جیسے ہی اس سے لپٹنے لگا تو بجلی کی رفتار سے زیادہ پولیس ڈی آئی سی کے ایک سپاہی نے مجھے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"خبردار! لاش کو ہاتھ نہ لگانا۔ بے وقوف لڑکے تمہاری اس جذباتی حرکت سے ہماری انویسٹی گیشن کتنی بری طرح متاثر ہوتی تمہیں اس کا احساس نہیں ہے"۔

میں اپنا غم اپنے دل میں گھونٹ کر ایک طرف روتے ہوئے کلدیپ کے مردہ جسم کو دیکھنے لگا۔ کلدیپ کی لاش کے پاس مخصوص علاقہ کا تھانیدار اس کے ساتھ چند سپاہی اور چند دیہاتی کھڑے تھے۔

پونم نے وہاں کھڑے علاقہ کے تھانیدار سے کلدیپ کی لاش ملنے کی تفصیل پوچھی تو اس نے وہاں کھڑے ایک نوجوان دیہاتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔

تھانیدار پونم نے اس دیہاتی سے کچھ سوالات کئے تو اس نے اپنا جو بیان دیا مختصراً اس طرح تھا۔

حالیہ آنے والی باڑھ میں میری دو بھینسیں بہہ گئی تھیں۔ مجھے کسی نے بتلایا تھا کہ چند زندہ بھینسیں اس علاقہ میں موجود ہیں۔ میں جب اپنی بھینسوں کو ڈھونڈنے اس جگہ آیا تو یہاں یہ شخص اسی حالت میں مردہ ملا تھا۔

تھانیدار پونم نے سب سے پہلے کھوجی کو کہا کہ تم اپنی

کام کردے۔ (کھوجی اور پولیس کا فوٹوگرافر ساتھ تھے) پولیس کے کھوجی نے سب سے پہلے کلدیپ کی لاش کے قریب کی زمین کا معائنہ کیا اس نے وہاں کھڑے سیلابی پانی کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے نتھار کر کچھ کھرے تلاش کیے۔ اس کے بعد اس نے اپنی رپورٹ میں کچھ لکھا۔ کلدیپ کی لاش کی پولیس کے فوٹوگرافر نے مختلف زاویوں سے چند تصاویر لیں۔

''لاسا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟'' تھانیدار پونم نے تھنس گاؤں کے تھانیدار سے سوال کیا۔

''اگر سیدھی سڑک سے وہاں جایا جائے تو وہ دور ہے لیکن اگر کچے پکے دشوار راستے سے جایا جائے تو اس کا فاصلہ سمٹ کر 8 کلومیٹر رہ جاتا ہے لیکن عموماً یہاں کے مقامی دیہاتی اس راستے سے جانے کو کتراتے ہیں''۔

''کیوں؟'' پونم نے دوبارہ اس سے سوال پوچھا۔

''اس دشوار گزار جنگلی راستے میں جگہ جگہ خطرناک ڈاکوؤں، خونخوار بھیڑیوں، گیدڑوں وغیرہ کا بسیرا ہے۔ ڈاکو یہاں سے گزرنے والے مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ پندرہ دن پہلے انہوں نے ایک دیہاتی کو لوٹنے کے بعد ذبح کر دیا تھا..... ویسے پونم صاحب! میں اپنے ان ساتھی تھانیدار صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ مقتول کو ڈاکوؤں نے نہیں مارا۔ ایسا ہونا ممکن ہے۔ ویسے ان کے دو سرے نکات قابل غور و تفتیش طلب ہیں کہ مقتول قتل ہونے سے پہلے تین چار روز کہاں رہا؟ آیا کہ وہ اس گاؤں میں پیدل آیا تھا یا وہ کسی سواری کے ذریعہ لاسا گاؤں جانا چاہ رہا تھا۔ حالانکہ اسے اس بات کا علم ہوگا کہ ان دنوں اس علاقہ میں کئی کئی فٹ پانی کھڑا ہے''۔

یہ بات واقعی میری سمجھ سے باہر ہے لیکن تم ان باتوں کو چھوڑو''۔ پونم نے کہا اور پھر اپنے ساتھ آئے نوجوانوں اور سپاہیوں کو کہا کہ کلدیپ کی لاش کو بڑی احتیاط سے اٹھا کر پولیس جیپ کی چھت پر رکھ دو۔ کلدیپ کی لاش کو تھنس کے نوجوانوں اور پولیس کے سپاہیوں نے پولیس جیپ پر رکھ کر اسے اچھی طرح ایک بڑے سے موم جامہ سے ڈھانپ کر رسی سے باندھ دیا تاکہ وہ ہچکولے کھا کر گر نہ پڑے۔

تھنس تھانیدار نے ہمارے علاقہ کے تھانے کی پنکچر جیپ کو نہ صرف ٹھیک کروایا بلکہ پولیس ٹیم کے تمام افراد کے لئے کھانے پینے کا انتظام کیا۔

واپسی سے قبل جب ہم سارے لوگ تھنس تھانے میں بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے تھانیدار پونم کو تجویز دی کہ لاسا گاؤں یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور اس وقت ہمارے پاس پولیس پارٹی بھی ہے تو کیوں نہ ہم دیپا، ماتا کو کلدیپ کے قتل کی اطلاع کر دیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہ کم از کم کسی طرح مقتول کی آخری رسومات میں شرکت کرے گی۔

تھنس تھانے کے تھانیدار نے میری اس تجویز پر جواباً کہا کہ لڑکے کی بات میں بہت وزن ہے اور یہ اخلاقی لحاظ سے بھی درست ہے لیکن زمینی حقائق بھی تو ہمارے سامنے ہیں۔ پھر اس تھانیدار نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''برخوردار جس علاقہ میں تم جانا چاہتے ہو یہاں سے وہاں تک ایک تا چار فٹ تک نہ صرف پانی کھڑا ہے بلکہ یہ سارا علاقہ لاسا گاؤں تک ڈاکوؤں سے بھرا پڑا ہے''۔ اسی دوران پولیس ٹی آئی سی پارٹی نے ایک سپاہی نے تھانیدار پونم کی توجہ اس جانب دلوائی کہ سر مقتول کی تازہ تازہ شیو ہوئی ہے۔ لہٰذا اس نائی کو کھوجنا چاہیے کہ جس نے اس کی شیو بنائی ہے.. کلدیپ کی ٹھوڑی پر استرے کا ہلکا سا کٹ بھی نظر آ رہا تھا۔

مسٹر پونم نے تھنس گاؤں کے تھانیدار کو خصوصی طور پر کہا کہ تم نے کلدیپ کی تصویر اس علاقہ کے تمام حجاموں

کو دکھائی ہے۔ شاید ہمیں ان سے اس کیس کی گتھی سلجھانے میں اہم مدد مل جائے۔

''مسٹر پونم آپ صحیح کہتے ہیں۔'' تھنس کے تھانیدار نے کہا۔ ''میں ایسا کر کے جلد آپ کو رپورٹ بھجواؤں گا''۔

چلنے سے پہلے تھنس اور ٹی آئی سی تھانیداروں نے کچھ ضروری کاغذات کا تبادلہ، اندراج کیا اور ان میں ہم چاروں نوجوانوں، ہمارے ساتھ آئے بزرگ اور کئی دیگر لوگوں کے دستخط وغیرہ تھے۔ پونم نے گاؤں تھنس کے تھانیدار سے باتیں کرتے ہوئے کہا کہ میرے ذہن میں یہ سوال مچل رہا ہے کہ ڈاکوؤں نے اگر اس نہتے کو لوٹنا تھا تو لوٹ لیتے مگر وہ اسے جان سے مار کر اس کی لاش دور پھینک گئے اور وہ بھی ہاتھ پاؤں باندھ کر... اس میں کوئی راز ہے۔

کلدیپ کی لاش ٹی آئی سی تھانے میں لائی گئی۔ تھانیدار پونم نے ہم سے کہا کہ حویلی جا کر اطلاع کر دیں کہ مقتول کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد کل شام ٹی آئی سی تھانہ میں ضروری کارروائی کے بعد لواحقین کے حوالہ کی جائے گی۔

''تھانیدار صاحب! ہم نے لاش کی چیر پھاڑ، پوسٹ مارٹم نہیں کروانا''۔ ہمارے ساتھ آئے بزرگ نے تھانیدار پونم سے کہا۔

''...بزرگو! یہ قتل کا معاملہ ہے اور قانون کے تحت اس کا پوسٹ مارٹم کرانا لازم ہے''۔ پونم نے سخت لہجے میں کہا۔ ہم سب لوٹ کر جب حویلی پہنچے تو وہاں ماتم، سوگ کا سماں تھا۔ ... تمام ... بازار بند تھے۔ حویلی کے دروازہ پر لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ ہماری شکلیں دیکھ کر وہاں موجود لوگوں نے ہم سے سوالات پوچھنے شروع کر دیئے۔ ہم نے سب کو مختصر تفصیل بتائی۔

اگلے دن کلدیپ کی لاش تھانے سے وصول کر

راستہ اور منزل

اگر راستہ خوبصورت ہے تو معلوم کرو کہ کس منزل کو جاتا ہے لیکن اگر منزل خوبصورت ہے تو راستے کی پرواہ مت کرو کہ کیسا ہے۔

کے حویلی لائی گئی اور سکتہ زدہ لالہ جی کو کلدیپ کی میت کے قریب اس مقصد کے لئے لایا گیا تھا کہ وہ کلدیپ کا آخری دیدار کرنے اور رو کر اپنے دل میں رکے غم کا اظہار کر کے ہلکا ہو جائے۔

مقتول کی لاش انتہائی حد تک سڑ چکی تھی اور خیال تھا کہ زیادہ دیر رکھا گیا تو اس سے اٹھنے والی بدبو ناقابل برداشت ہو جائے گی۔ اس لئے اس کی آخری رسومات کا بندوبست جلدی جلدی کیا جانے لگا۔ کلدیپ کی لاش سے اس وقت بھی بدبو چھوٹنے کے ساتھ اس کے منہ سے مسلسل نیلا سرخی مائل لعاب رس رہا تھا۔

سنتو تائی کے دل خراش بین اور رونا انتہائی دردناک تھا۔ اس منظر کا احاطہ لفظوں میں کرنا انتہائی محال ہے۔ وہاں کلدیپ کا چچا شنکر دیال اور اس کے بیٹے، چچی بھی وہاں موجود اور رو رہے تھے۔

شنکر دیال نے میرے قریب آ کے مجھ سے واقعہ کی پوری تفصیل پوچھی (میں نے اسے اتنا کچھ بتلایا جتنا کہ مجھے پتا تھا)۔

لالہ جی کو سکتہ کی وجہ سے چپ لگی ہوئی تھی۔ اسی دوران شنکر دیال نے ماتم کے گھر کے تمام ... کے لئے روٹی، پانی دیگر تمام ضروری لوازمات کر لئے تھے۔ بظاہر ... سے اور اس کے بیٹوں اور چچی کی بے چین حالت کو دیکھ کر تو یہ لگ رہا تھا جیسے انہیں بھی کلدیپ کی موت کا دلی دکھ ہے۔

جیسے ہی کلدیپ کی لاش ... کر لئے ... کی لاش شمشان گھاٹ لے جانے کے لئے ... تھی

انھاں گئی تو اسی وقت خلاف توقع کمیش بمعہ فیملی آ گیا۔ اس منظر کو دیکھ کر سب حیرت زدہ ہو گئے کہ یہ لوگ کیسے اور کس طرح یہاں پہنچ گئے۔

"کیا ہوا میرے کلدیپ کو؟" دیپا سینہ کوبی کرتے ہوئے چلائی۔ "کس نے مارا ہے، میں اس کی نرخرہ چبا لوں گی"۔

ادھر ماتا کلدیپ کی ارتھی سے لپٹ کر دیوانہ وار رونے چیخنے چلانے لگا۔

"نہیں چھوڑوں گا ظالموں کو میں اپنی جان دے کر اپنے بھائی کے ہتیارے کی جان لے لوں گا"۔

ادھر دیپا کی آمد کا سن کر سنتو تائی آگ بگولہ ہو کر حویلی سے باہر کلدیپ کی ارتھی پر لیٹ کر دھاڑی۔ "خبردار تو نے اور ماتا نے اسے چھوا۔ شنکر دیال، تو نے کلدیپ کی چتا کو اگنی دینی ہے"۔

"نہیں بھاوجیہ میرا اگنی دینے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے کیونکہ ابھی کلدیپ کا بھائی زندہ ہے"۔ شنکر دیال نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ "تم یہ کام لال جی سے کروالو"۔

"نہیں اس کے اوسان قابو میں نہیں ہیں"۔ سنتو تائی نے روتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھوں گی کہ میں بانجھ تھی میری کوئی اولاد نہ تھی"۔

"اتنی کٹھور نہ بن سنتو بھابی!" شنکر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "دے دے ماتا کو اپنے بھائی کی چتا کو اگنی دینے کا ادھیکار"۔

"نہیں شنکر تم نے یہ آخری فریضہ ادا کرنا ہے"۔ تائی سنتو بضد تھی۔

"بھگوان ناراض ہوتے ہیں۔ اولاد کو ٹھکرانا نہیں چاہئے"۔ شنکر نے پھر کہا۔ "اری شکر کر تیرا ایک بیٹا ابھی زندہ ہے۔ تھوڑا دل بڑا کر کے صبح کے بھولے شام کو آنے کو معاف کر دے"۔

"نہیں نہیں میں کسی صورت میں اس ناخلف ماتا اور بہو دیپا کو معاف نہیں کر سکتی"۔ تائی سنتو نے دیپا کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں کلدیپ کو میں اپنا ورغلایا اور بھٹکا ہوا بیٹا مانتی ہوں۔ یہ بدنصیب اس منحوس کے ورغلانے پر ہی حویلی سے روپے، زیور چرا کر بھاگا تھا"۔

"نہیں میرا کلدیپ نہیں مر سکتا"۔ دیپا نے پچھتاوے کی آگ میں جلتے ہوئے کہا۔ "کاش! میں حویلی سے باہر ناراضگی کا قدم نہ رکھتی"۔

"دیپا بھگوان تیرا اسی طرح بیڑا غرق کرے جس طرح ہم رسوا زمانہ ہوئے ہیں"۔ سنتو نے دیپا کو کوستے ہوئے کہا۔ "تیرے منحوس قدم ہماری حویلی کی تمام خوشیوں کو اپنے پاؤں تلے روند گئے۔ تو حرافہ کی تو نے میرے معصوم بیٹے کو پہلے اپنے حسن کے جال میں پھنسایا اور پھر اس سمیت ہمارے پورے پریوار کو برباد کیا"۔

"یہ مجھ پر سراسر الزام ہے میں نردوش ہوں"۔ دیپا نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ "محلے والو! بھگوان کے لئے ساس جی کو سمجھائیں۔ میں آپ لوگوں کے سامنے کیسے اپنے آپ کو نردوش ثابت کروں؟"

"میں بھائی کی چتا کو لازماً چھوٹے بھائی ہونے کے ناطے اگنی دوں گا"۔ ماتا نے کہا۔

"نہیں! شنکر دیال تم نے کلدیپ کو اگنی دینی ہے"۔ سنتو تائی نے روتے چلاتے ہوئے یہ جملہ کیا۔

"چلو اس چتا کو اگنی دینے کا فیصلہ شمشان گھاٹ میں کرنا فی الحال ارتھی اٹھاؤ"۔ کسی نے کہا۔

شمشان گھاٹ کے پورے راستہ ماتا، اپنے چچا شنکر دیال سے لڑتا جھگڑتا رہا کہ میں نے ہی چتا کو آگ کی لکڑی دکھائی ہے اور شنکر کا کہنا ہے تھا کہ یہ اس کی بھاوج کا حکم ہے اور وہ یہ کام خود کرے گا۔ شمشان گھاٹ میں جب کلدیپ کا مردہ جسم جلانے کے لئے رکھا گیا تو وہاں ماتا نے چچا شنکر دیال کو پیچھے دھکیل کر خود بھائی کی چتا کو

آگ دکھانے کا ارادہ کیا تو شنکر نے بھی غصے کے عالم میں اسے ہلکا سا دھکا دے دیا۔ یہ دیکھ کر کملیش کے دونوں لڑکے طیش میں آ کر آگے بڑھے اور انہوں نے شنکر دیال کا گریبان پکڑتے ہوئے کہا کہ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو اپنے معصوم بھتیجے کو اپنے بھائی کی ارتھی کو آگ دینے سے روک رہا ہے۔

''ہاں یہ ہمارے خاندان کا پکا دشمن ہے۔ اس کا ہمارے خاندان پر کوئی ادھیکار نہیں ہے''۔ مانا چلایا۔

''ادھیکار ہے یا نہیں مجھے تمہارے خاندان کی سربراہ، میری بھاوجیہ نے زور دے کر یہ حکم دیا تھا کہ میں کلدیپ کی ارتھی کو اگنی دوں اور اس کے ساتھ ساتھ تجھے قریب نہ آنے دوں''۔

شمشان گھاٹ میں مانا کی حمایت میں کملیش، نکھیال شنکر دیال اس کے دونوں بیٹوں سے ٹھیک ٹھاک مکوں، لاتوں کی لڑائی لڑنے لگے۔ شنکر دیال کا سر پھٹا، کملیش کی ناک سے لہو بہنے لگا جبکہ پونم کے سر پر نہ جانے کس نے اینٹ ماری تھی۔ وہ زمین پر گر کر مچھلی کی مانند تڑپنے لگا تھا۔ کسی نے پولیس بلا لی تھی۔

''لڑنے والے تمام فریقین کو گرفتار کرلو''۔ تھانیدار کے حکم پر پولیس والوں نے نکھیال، شنکر دیال، کملیش اور ان کے دونوں بیٹوں سمیت مجموعی طور پر گیارہ افراد کو گرفتار کر لیا۔

پھر تھانیدار نے شنکر دیال کو کہا کہ وہ سنتو تائی کی نصیحت کے مطابق چتا کو اگنی دے۔

چار بندوں کو شام کو ہی چھوڑ دیا گیا جبکہ علاقہ کی پولیس شنکر دیال، کملیش، مانا کو اپنے ساتھ تھانے لے گئی۔ ان سب کے خلاف دنگا، نقص امن کی دفعات پر مشتمل پرچہ کاٹ دیا گیا۔

ابا اور علاقہ کے معززین تھانہ میں ان سب کو چھڑوانے کے لئے تگ و دو کرنے لگے۔ علاقہ کا تھانیدار تمام گرفتار شدگان کو یہ کہہ کر چھوڑنے کو تیار تھا کہ ان تمام افراد کو ٹی آئی سی تھانیدار کے حکم کے تحت گرفتار کیا گیا ہے اور ٹی آئی سی تھانہ کے حکم کی تعمیل ہر صورت پر لازم تھی۔ اس کی لمحہ لمحہ کی ڈیلی رپورٹ لازمی طور پر باقاعدگی سے ہیڈ آفس جاتی تھی۔ جسے D.P.R یعنی (Daily Performance Report) کہتے تھے۔ اس کے لئے گرفتار شدگان کی ضمانت یا دیگر دستاویزات کے لئے ٹی آئی سی کے متعلقہ مجاز آفیسر (مجسٹریٹ) نے مانا اور چار لڑکوں کو فی کس پندرہ روپے جرمانہ سنایا جبکہ کملیش، شنکر دیال اور اس کے بیٹوں کو تین تین روز قید بمعہ 50/- روپے فی کس جرمانہ کی سزائیں سنائی گئیں جبکہ نکھیال جو مجسٹریٹ سے ذرا اکھڑ ہو کر بولا تھا۔ اسے 5 روز قید بمعہ 80/- روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ کملیش، شنکر دیال اور اس کے بیٹوں پر اور ساتھ ہی نکھیال پر بھی لازم تھا کہ وہ ہر ہفتہ تین ماہ تک ٹی آئی سی تھانہ اپنی حاضری کے لئے آئیں۔

ادھر دیپا کو سنتو تائی نے اپنی حویلی میں گھسنے نہ دیا۔ وہ حویلی سے تیسرے گھر میں ایک محلہ دار تھی جس کا نام سوجا تھا، وہاں چلی گئی جبکہ لالہ جی کو لقوہ کے عارضہ کے ساتھ ہلکا سا دماغی فالج کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ وہ کافی دیر سوچنے کے بعد بڑی مشکل سے اپنی زبان سے اکا دکا الفاظ نکال سکتا۔ لالہ آرام دہ کرسی پر کسی زندہ لاش کی مانند دھوپ میں خاموشی سے پڑا رہتا تھا۔ سنتو تائی پے در پے صدموں کی مار کھا کر کم گو، تنہائی پسند سی ہو گئی تھی۔ اس کی صحت کا گراف بڑی تیزی سے تنزلی کا شکار ہو رہا تھا۔ دیکھا جائے تو وہی حویلی کے اندر اکیلی رہ گئی تھی۔

میری اماں، ابا اور محلہ کے ایک آدھ پڑوسی اس کی دلجوئی یا اس کے صدمات کو اپنی ہمدردیوں، تسلی کا مرہم لگانے ان کے پاس چلے جاتے تھے۔

ایک دن محلہ کے چند بڑے مرد، عورتیں دیپا کو

سنتو تائی کے پاس لے گئیں انہوں نے سنتو تائی کو سمجھایا کہ وہ دیپا کو اس حویلی میں رکھے یہ جو بھی کچھ ہے کلدیپ کی ودھوا اور لالہ پریوار کی بہو ہے۔ نیز ان محلہ داروں نے سنتو تائی کے ذہن میں یہ بات ڈالی کہ اس معصوم کا اس حویلی کی تباہی اور رُونما ہونے والے متعدد حادثات میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

سنتو تائی بڑی مشکل سے دیپا کو حویلی میں اس شرط پر رکھنے پر راضی ہوئی کہ یہ اپنا منحوس سایہ اس سے ہمیشہ دور رکھے گی۔ اوپر والے کمرے میں رہے گی اور اپنا کھانا پینا علیحدہ رکھے گی۔ دیپا نے روتے ہوئے سنتو تائی کے پاؤں پکڑ کر بڑی عاجزی سے ان سے معافی مانگتے ہوئے اپنی اس غلطی کا اعتراف کیا کہ اس نے حویلی سے ناچاقی کے باعث باہر قدم رکھ کر اپنی زندگی کی بہت بڑی بھول کی ہے۔ اہل محلہ کی منتیں، سماجتیں رنگ لائیں وہ دیپا کو واپس حویلی میں داخل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

دیپا سارا دن کلدیپ، نوتن کے کمروں میں جا کر روتی رہتی تھی۔ اسی رونے دھونے کے ساتھ اس نے ماتا اور چند مزدوروں کی مدد سے حویلی کے در و بام کو دھلوا کر صاف ستھرا کیا۔ پرانی طرز کا پڑا فرنیچر، گھسا پٹا کارپٹ، دیگر مخدوش سامان کو باہر پھنکوایا اور اس کی جگہ نئی ماڈرن چیزیں لائی۔ وہ حویلی کے رہائشی حصہ میں مرمت، سفیدی، رنگ، روغن کا ارادہ رکھتی تھی لیکن اسے ابا اور اہل محلہ نے سمجھایا تھا کہ اس کا ایسا کرنا بیکار جائے گا کیونکہ اس حویلی کا رہائشی حصہ لالہ جی نے تلکھال کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے اور وہ کسی بھی لمحے اس کے قبضہ کا تقاضا کر سکتا ہے۔ دیپا نے یہ کام روک دیا۔

ادھر تلکھال نے کلدیپ کی موت کی وجہ سے اور اظہار ہمدردی کرتے ہوئے حویلی کے قبضہ کے لئے ایک ماہ کی مزید مہلت دے دی۔

ایک خوش آئند بات یہ ہوئی کہ دیپا نے سنتو تائی کی شدید ناراضگی کے باوجود ان کی اتنی خدمت کی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ سنتو تائی کا دل اس کی جانب سے نرم پڑنے لگا۔ وہ پہلے تو دیپا کی جانب سے دیئے گئے سالن، روٹی اور اس کی خدمات کو ٹھکرا دیا کرتی تھی لیکن لگتا تھا انہوں نے حویلی کے ڈوبتے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ وہ اب دیپا سے کچھ کچھ باتیں کر لیا کرنے لگی تھی۔ گویا کہ ان کا اعتماد اس کی جانب سے بحال ہو گیا تھا۔

سنتو تائی کے ساتھ ساتھ دیپا اپاہج لالہ جی کی بھی بڑے دل و جان سے خدمت کر رہی تھی۔

ہم نے یہ منظر بھی دیکھا کہ اکثر دیپا چھت پر سنتو تائی کے پیچھے بیٹھی ان کے بالوں کی چمپی کر رہی ہوتی۔ لگتا تھا کہ حویلی کی روٹھی ہوئی رونقیں بحال ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

کلدیپ کی چتا کو جلے بمشکل 20 روز ہی ہوئے ہوں گے کہ حویلی میں ٹی آئی سی تھانہ سے تھانیدار یونم، سول وردی میں آفیسرز قسم کے دو آدمی اور پولیس کے سپاہی تھے۔

تھانیدار یونم نے حویلی میں موجود سنتو تائی اور دیپا کو اپنے پاس بلا کر ان سے کچھ سرسری باتیں کی اور پھر اس نے اس کے ساتھ آئے افسران نے پوری حویلی کے چپہ چپہ کا معائنہ کیا اور پھر تھانیدار یونم نے مجھے میرے گھر سے بلوایا۔

اس نے مجھے حویلی بلوایا تو میرے دل میں ہزار وسوسے، اندیشے جنم لینے لگے۔ یا اللہ خیر یونم نے مجھے حویلی کیوں بلوایا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کلدیپ کے قتل میں مجھے شامل تفتیش کر رہا ہو۔

لیکن ابا نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ جب تمہارے دل میں کوئی چور نہیں ہے تو تم تھانیدار کے سامنے پیش ہونے سے کیوں کترا رہے ہو؟

میں بہرحال ہمت کر کے حویلی میں تھانیدار کے

سامنے پیش ہو گیا۔ وہاں ٹی آئی سی کے دیگر اہلکار بیٹھے ہوئے تھے۔ ''وہاں بھی ستار! میں نے تمہیں اپنے پاس بلانے کے لئے کافی دیر سے سندیسہ بھیجا ہوا تھا۔ تم نے یہاں آنے میں اتنی دیری کیوں کر دی؟'' اس نے سوال کیا۔

''جی...... جی، میں دراصل غسل کر کے تیار ہو رہا تھا۔'' میں نے جھوٹ گھڑا۔

''لیکن تمہارے بال تو بالکل خشک ہیں۔ تم کیا سن باتھ لے رہے تھے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے وہاں موجود دونوں آفیسر کے سامنے میری جانب سے خواہ مخواہ بولے گئے جھوٹ کو پکڑتے ہوئے مجھے ٹوکا تو میں دلی طور پر دہل کر یہ سوچ کر پچھتانے لگا کہ میں نے یہ بھونڈا جھوٹ کیوں بولا۔

''تم نہا کر نہیں آئے۔ سچ بولو۔'' تھانیدار پونم نے مجھ پر ایک بار پھر طنز کا نشتر چلاتے ہوئے یہ جملہ بولا تھا۔

''جی وہ میں نے اپنے بال تولیہ سے اچھی طرح خشک کئے تھے''۔

اس نے مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر دس پندرہ منٹ تک ادھر ادھر کی باتیں کیں۔

میرے بعد پونم نے دھونند اور مریاں کو ان کی دکان سے بلوایا۔

دھونند آ گیا لیکن مریاں نہیں آیا۔ دھونند نے آتے ہی ہندوانہ طریقہ سے بڑی عاجزی سے سب کو جھک کر پرنام کیا۔

''تمہارا نام ہے دھونند؟''

''جی سرکار''

''میں نے تمہاری بڑی تعریف سنی ہے''۔ پونم نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم جادو ٹونے کے ماہر عملیات اور دیوی مخلوق کی ہیئت مجھ سے متعلق ہو۔''

''جی بار، آپ نے صحیح سنا ہے۔ لیکن مجھ میں

دولت اور حُسن

دولت اور حُسن کے لالچ میں کبھی اپنی سیرت خراب نہ کرنا کیونکہ دولت دنیا میں ہی ختم ہو جائے گی اور حُسن مٹی میں مل جائے گا لیکن اچھی سیرت آخرت تک ساتھ دے گی۔

(کنیز فاطمہ)

بھگوان کی کرپا ہے''۔ دھونند نے عاجزی سے کہا۔

''دھونند میری معلومات کے مطابق تم ہی نے اس حویلی میں موجود کسی پُراسرار مخلوق کی موجودگی کی نشاندہی کی تھی؟'' پونم نے کہا۔ ''کیا تم اس بارے میں کچھ سرسری سا بتا سکتے ہو؟''

''میرا گیان اور تجربہ کہتا ہے کہ اس حویلی میں ایک چڑیل اور ایک چھلاوہ موجود ہے اور وہ اس حویلی کی رسوئی میں شامل ہیں''۔ دھونند نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مجھے سنتو اور دیپا نے اس بارے میں بتایا اور دکھلایا بھی ہے۔ میں نے رسوئی کی اس چوکھٹ کا بغور معائنہ کیا ہے۔ جہاں اکثر بڑے پُراسرار طور پر نیلے رنگ کی آگ یا شعلہ نمودار ہو کر فی الفور غائب ہو جاتا تھا''۔ پونم نے کہا۔ ''لیکن دھونند جی! ایک بات جو میرے دماغ میں کھٹک رہی ہے وہ یہ کہ یہ آگ فوری کیوں بجھ جاتی ہے اور وہ اپنے پیچھے کوئی نشان کیوں نہیں چھوڑتی؟''

''سرکار یہی تو اس پُراسرار مخلوق کی پُراسراریت ہے''۔ دھونند نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''دراصل اس حویلی میں جو غیر مرئی مخلوق موجود ہیں ان کا کام ہی حویلی کے باسیوں کو شرارتوں کے ذریعہ بار بار نقصان اور ذہنی اذیت دینا تھا''۔

دھونند نے تھانیدار کو یہ بھی بتایا کہ میں نے اپنے

عملیات کے ذریعہ بڑے کشٹ کے ساتھ اس حویلی میں موجود اس غیر مرئی مخلوق کو کافی حد تک کھدیڑ دیا تھا لیکن بدقسمتی سے سنتوجی نے میرے کام میں ہر وقت رکاوٹیں ڈالیں اور جو کام میں کرنا چاہتا تھا وہ انہوں نے اپنے سخت رویوں کی وجہ سے کرنے نہیں دیا۔

"تم کس کے ذریعہ اور کہاں سے یہاں آئے تھے؟" پونم نے سوال کیا۔

"جی میں اس حویلی کے سرمی مکیش جی کے ذریعہ یہاں آیا تھا"۔ دھونند نے اپنے گاؤں کا نام بتا کر کہا۔

پونم نے کافی دیر تک دھونند سے سوالات و جوابات کیے اور دھونند کے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ اس کے بیان کی صورت میں کاغذ میں لکھتا رہا۔

پونم نے مکیش کو بھی بلوایا اور اس سے بھی تفتیشی انداز میں چند سوالات پوچھے۔ بالخصوص اس نے اس سے پوچھا کہ آیا کہ مقتول کلدیپ لاسا گاؤں آیا تھا کہ نہیں۔ اس پر مکیش نے کہا۔

"سرکار! اس سال جس ہولناک، تباہی والی سیلابی باڑ ہمارے پورے علاقہ کے ملحقہ دیہات میں آتی ہے آپ بتلائیں۔ دس بارہ فٹ کھڑے پانی کو پار کر کے لاسا گاؤں کس کا آنا ممکن ہے"۔ اس نے کلدیپ کے لاسا گاؤں آنے کا انکار کیا۔

دیپا نے بھی اسی قسم کا ملتا جلتا انکاری کا بیان دیا تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ نئی آئی سی تھانے کی تفتیشی ٹیم کے ساتھ ایک آفیسر ایسا بھی آیا تھا جو کسی سے سوال و جواب نہیں پوچھ رہا تھا۔ وہ صرف ایک طرف خوشی سے بیٹھ کر بیان دینے والے کی شکل پر اپنی نظریں گاڑھے رہتا تھا۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد پونم کے کانوں میں سرگوشی کرتا تھا۔ اس خوش آفیسر نے میرے چہرے پر مسلسل ٹکٹکی لگائی ہوئی تھی لیکن میں جان بوجھ کر اس سے اپنی نظریں نہیں ملا رہا تھا۔

"سنا ہے تمہاری اور کلدیپ دادا کے درمیان پچھلے دنوں نوتن کے سلسلے میں تکرار ہوئی تھی"۔ سادہ کپڑے میں ملبوس آفیسر نے مجھ سے یہ سوال پوچھا۔

"جی وہ میری جانب سے کلدیپ کو اپنی بہن نوتن کے عشق کے بارے میں خواہ مخواہ بدگمانی ہوئی تھی"۔

"کیسی خواہ مخواہ کی بدگمانی؟" اس آفیسر نے یہ جملہ بڑی آہستگی سے کہا۔ میں گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے اس سوال کا جواب دیتا کہ درمیان میں تھانیدار پریم بول پڑا۔

ہاں اس بات کی تفتیش میں نے اس سے تفصیل گاؤں جاتے ہوئے کر لی ہے۔ ابھی اس سے یہ سوال پوچھنا بے معنی ہوگا۔ (تھانیدار پریم نے اس آفیسر کے کان میں کچھ اور بھی کہا)۔

مجھے حویلی میں جب آئے کافی دیر ہوگئی تو میرے پیچھے ابا پریشانی کے عالم میں وہاں سب کے سامنے آ گئے۔ انہوں نے جب مجھے ٹی آئی سی تھانے کی تفتیشی ٹیم کے سامنے بیٹھے ہوئے دیکھا تو انہوں نے پریشان کن لہجہ میں تھانیدار پونم سے پوچھا۔

"سرکار! خیریت تو ہے، آپ نے میرے بیٹے کو حویلی میں بلوایا ہے؟"

"خیریت ہوتی، کلدیپ کے قتل کا معاملہ الجھا اور شکوک سے بھرا نہ ہوتا تو ہم یہاں اس کیس کی تفتیش کے لئے آتے؟"

"لیکن کلدیپ کا قتل تو غالباً تمس کے ڈاکوؤں یا لٹیروں نے کیا ہے"۔ ابا نے کہا۔ "اس حویلی کے باسیوں یا ہم پڑوسیوں، دوستوں کو اس گھناؤنے عمل سے کیا لینا دینا۔ کیا آپ ہم گھر کے لوگوں، پڑوسیوں پر کلدیپ کے قتل کا شبہ کر رہے ہیں؟"

"بزرگو! پولیس کا کام تو شک ہی کرنا ہے"۔

تھانیدار نے ابا سے کہا۔ ”واردات کی گتھیوں کو سلجھا کر اصل مجرموں تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہم نے ابھی تک آپ لوگوں میں سے کسی پر مقتول کے قتل کا شبہ یا شک ظاہر نہیں کیا۔ ابھی تک تو ہم یہاں صرف اپنا ابتدائی کام بڑی خوش اخلاقی سے کر رہے ہیں۔ ابھی چند روز بعد مقتول کے جسم سے حاصل کردہ مواد، اس کے زخموں کی نوعیت اور وقوع واردات سے ملنے والے کئی شواہد کی رپورٹیں آنا باقی ہیں۔ ہم اس کے بعد ہی فیصلہ کریں گے کہ کلدیپ کے قتل کی واردات میں کون سا پوشیدہ ہاتھ تھا۔۔۔ اچھا ہم چلتے ہیں، پھر آئیں گے۔“

”پھر آئیں گے، پر کیوں؟“ سنتو تائی نے تیکھے سے انداز میں کہا۔

”خبردار، ماتا جی! جو آپ نے آئندہ یہ جملہ کہا“۔ پونم نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔ ”ہم قانون کے مطابق ہزار دفعہ تفتیش کے لئے یہاں آ سکتے ہیں۔ میں ابھی ٹھنڈے ذہن اور ملائم زبان سے تعلق رکھنے والے اہلکاروں کو یہاں لے کر آیا ہوں۔ اگر ہمیں اردگرد کے لوگوں میں سے کلدیپ کے قتل میں کسی کا ہاتھ نظر آ گیا تو تم لوگ پولیس کا اصل روپ بھی دیکھ لو گے“۔

”بھگوان کرے تیری حالت میرے پریوار جیسی ہو جائے“۔ سنتو تائی حسب عادت پونم تھانیدار کو روتے ہوئے کوسنے دینے لگیں۔ ”تجھ پر اور تیرے سارے مسٹنڈوں، حرام خوروں پر دھرتی کا گولہ گرے“۔

ٹی آئی سی کے تمام اہلکاروں نے سنتو تائی کی ان دشنام انگیزیوں خرافات پر اپنا کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

دوسرے پورے دن ٹی آئی سی تھانہ میں مکیش اور شنکر دیال کے بیٹوں کو بلوا کر ان سے کئی گھنٹوں تک پوچھ گچھ کی گئی۔ نکھیال بدمعاش جو تفتیشی ٹیم کے سامنے پیش ہونے سے کترا رہا تھا، اسے شہر سے بہت دور ایک گاؤں سے پولیس پارٹی نے پکڑا اور اسے بھی دو روز ٹی آئی سی تھانہ میں بند کر کے سختی سے کلدیپ کے قتل کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔ تقریباً روزانہ پونم تھانیدار کلدیپ کے قتل کی تفتیش کے لئے حویلی آتا یا کسی بھی مشکوک شخص کو ٹی آئی سی تھانہ بلا لیتا جس میں زیادہ تر اس نے دیپا، دھونند، سنتو تائی، مکیش کو بہت تنگ کیا اور مجھے بھی وہ اپنے تفتیشی عمل کے کچوکے مارتا رہتا تھا۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ جن لوگوں کو بار بار کلدیپ کے قتل کی تفتیش کے سلسلہ میں تنگ کر رہا تھا۔ ان لوگوں نے ایک وکیل سے مشورہ کر کے اس کے خلاف تھانہ ٹی آئی سی کے ہیڈ کوارٹر میں مختلف جھوٹے سچے الزامات کے تحت درخواست دائر کر دی۔ مدعیان میں سرفہرست سنتو تائی، دیپا، مکیش، نکھیال، شنکر دیال ان کے بیٹے اور ابا وغیرہ تھے۔ سنتو تائی، ابا اور شنکر دیال نے اس درخواست میں لکھا تھا کہ ہم بوڑھے گھر کے لوگوں کو خواہ مخواہ مقتول کے قتل میں رگیدا جا رہا ہے۔ جبکہ مکیش، شنکر دیال، نکھیال نے بھی اس قتل میں ملوث انکاری ہونے کے ساتھ لکھا تھا کہ پونم تھانیدار خواہ مخواہ ہمیں پریشان کر کے نہ صرف رشوت بٹورنا چاہتا ہے بلکہ وہ ہم لوگوں کو ذہنی اذیت دینے کے ساتھ ساتھ معاشرہ میں ہماری تذلیل کرنا چاہ رہا ہے۔

پولیس ہیڈ کوارٹر کے مجاز آفیسر نے انکوائری کے لئے تھانیدار پونم اور تمام درخواست گزاروں کو اپنے آفس بلوا لیا۔ مجاز آفیسر نے دونوں فریقین کے دلائل بڑے تحمل اور کافی دیر تک سننے کے بعد تھانیدار پونم کو حکم دیا کہ وہ مذکورہ کیس کی حتمی انکوائری اگلے پندرہ روز میں مکمل کرے اور اگر اس کے پاس مشکوک لوگوں کے بارے میں کوئی ٹھوس ثبوت ہو تو وہ ان افراد کو ٹی آئی سی تھانہ بلائے یا اگر حویلی جانا لازمی مقصود ہو تو وہ اس کی پہلے ہیڈ آفس سے منظوری لے۔

ابا، کملیش، سنتو تائی نے مجاز آفیسر کے سامنے اس مر پر اعتراف کیا کہ موجودہ انکوائری تھانیدار کو تبدیل کر دیا جائے کیونکہ ان کو اس پر بالکل بھی اعتبار نہیں ہے لیکن مجاز آفیسر نے ان کی یہ استدعا مسترد کرتے ہوئے پونم کے ساتھ ایک اور تفتیشی آفیسر انسپکٹر بھیم سنگھ کو متعین کر دیا۔ یعنی اب کلدیپ کے قتل کی تحقیق ایک کے بجائے دو ہاتھوں میں آ گئی تھی۔

انسپکٹر بھیم سنگھ چند روز پہلے ہی بھیرہ سے ترقی کر کے ٹی آئی سی تھانہ میں تعینات ہوا تھا۔ یہ ایک قابل تفتیش آفیسر کے ساتھ شکل وصورت سے انتہائی کرخت اور زبان کا کڑوا، دوسروں کو ذلیل کرنے والا انسان تھا۔ تین روز بعد انسپکٹر بھیم سنگھ اپنے ساتھ دو پولیس والوں کو لے آیا۔ انہیں دیکھ کر سنتو تائی بھڑک گئی۔ انہوں نے پولیس ٹیم کو اپنے روایتی انداز میں کوسنا، چلانا شروع کر دیا۔

''تم لوگ پھر ہمارے زخموں پر نمک چھڑکنے آ گئے۔ اے بھگوان تمہارے پوت بھی اسی طرح کٹیں جس طرح کہ میرے دل کا ٹکڑا کلدیپ نامعلوم ہتھیاروں کے ہاتھوں کٹا ہے''۔

''چپ کر بڑھیا! ہم تیرے پریوار کے فرد نہیں ہیں جو تو یوں ہم سے جاہلوں کی طرح لڑ رہی ہے۔ ہم لوگ سرکار کی ڈیوٹی دینے اور کلدیپ کے اندھے قتل کی تفتیش کے لئے یہاں آئے ہیں''۔ انسپکٹر بھیم سنگھ نے یہ جملہ بڑے غصے اور بلند آواز میں کہا تو سنتو تائی دہل کر بت بن کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

''کہاں ہے تیری بہو د یپا؟''

''جی وہ تو..... اپنے عزیز سے ملنے بھاٹ گئی ہے''۔ سنتو تائی نے بڑے سہمے ہوئے اسے جواب دیا۔

''وہ کب آئے گی؟'' انسپکٹر بھیم نے انتہائی غصہ سے اُن سے پوچھا۔

''جی..... مجھے نہیں پتا کہ وہ کب آئے گی''۔ سنتو تائی نے جواب دیا۔

انسپکٹر نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے سنتو تائی کو چند لمحوں کے لئے گھورا اور پھر اپنی جیب سے ایک نیلے رنگ کا ازار بند نکالنے کے بعد اسے لہراتے ہوئے سنتو تائی سے پوچھا۔

''اسے پہچانتی ہے؟''

ازار بند کو دیکھ کر سنتو تائی نے اپنی آنکھوں کے ڈیلوں کو آخری حد تک کھولا اور وہ کافی دیر تک اسے سکتہ کے عالم میں گھورتی رہی۔

''جی..... یہ..... آپ کے پاس کہاں..... سے آیا؟''

بھیم نے ''ہوں'' کی آواز اس طرح نکالی جیسے کہ اسے کلدیپ کے اندھے قتل کے بارے میں کچھ سجھاؤ مل گیا ہو۔

''بڑھیا! میں نے تجھ سے صرف اتنا پوچھا ہے کہ تو اس ازار بند کو پہچانتی ہے؟''

''جی..... ہاں''۔ سنتو تائی کے منہ سے صرف یہی دو لفظ نکلے۔

''میرے سوال کے جواب کو ادھورا نہ چھوڑ شاباش، اسے پورا کر''۔ بھیم سنگھ نے سنتو کو پچکار کر کہا۔

''جی یہ آپ کو کہاں سے ملا؟''

''تجھے بہت تجسس اور شوق ہے نہ اس ازار بند کے ملنے کے بارے میں تو سن ماتا جی!'' بھیم سنگھ نے کہا۔ ''یہ ازار بند پولیس ٹیم کو جائے واردات سے کلدیپ کی لاش کے ہاتھوں میں بندھا ہوا ملا تھا''۔

انسپکٹر نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنے پیچھے کھڑے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میرا تجربہ اس امر کی گواہی دے رہا ہے کہ کلدیپ کے قتل میں اس حویلی کے کسی کردار کا ہاتھ ہے اور شخص علاقہ سے

تھانیدار کا یہ سوچنا سراسر غلط ہے کہ کلدیپ کو اس علاقے کے لٹیروں، ڈاکوؤں نے قتل کیا ہے۔ اس بے وقوف کو یہ نہیں پتا کہ لٹیرا ڈاکو اپنے شکار کو صرف لوٹتا ہے یا اگر کوئی لٹنے والا اس سے زیادہ ہی مزاحمت کرتا ہے تو وہ اسے پہلے ڈراتے دھمکاتے ہیں یا زدوکوب کرتے ہیں اور اگر زیادہ ہی لٹنے والا ان کے سامنے مزاحمت کرتا ہے تو وہ اسے صرف جان سے مارتے ہیں اور پھر اسے مار کر وہیں پھینک دیتے ہیں..... اب یہ کون سے ایسے ڈاکو تھے جنہوں نے پتے کلدیپ کو پہلے مارا اور پھر اس کی لاش کے ہاتھوں میں ازار بند باندھ کر اتنی دور سیلابی پانی کو پار کر کے شمس گاؤں کی دلدلی جگہ پر ٹھکانے لگایا"۔

"انسپکٹر صاحب! آپ صحیح کہتے ہیں"۔ اے ایس آئی نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

"ماتا جی! مجھے اب سولہ آنے برابر وشواس ہو گیا ہے کہ کلدیپ کے قتل کی گتھی سلجھانے میں یہ ازار بند اور تم دونوں بہت اہم کردار ادا کرو گے"۔ بھیم سنگھ نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔ "شرافت اسی میں ہے کہ تم مجھے اس ازار بند کی اصل بات بتاؤ ورنہ میں اپنے طریقہ سے تیری زبان کھلواؤں۔ دیکھ میں جب اپنی کرنی پر آ گیا تو میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ میرے سامنے کس عمر اور نحیف جسم کا ملزم کھڑا ہے۔ میں تیری بوڑھی ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا"۔

سنتو تائی ہاتھ جوڑتے ہوئے انسپکٹر بھیم سنگھ کے قریب آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر روتے ہوئے بولی۔

"بھگوان کے واسطے میں اس ازار بند کی حقیقت کا راز بتلاتی ہوں لیکن میری یہ بنتی (استدعا) ہے کہ میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنی چاہتی ہوں"۔

حویلی کے سامنے بڑے کمرے میں سنتو تائی انسپکٹر بھیم سنگھ سے کافی دیر تلک کچھ باتیں کرتی رہیں۔ وہ بار بار بھیم سنگھ کے پاؤں پکڑ کر ان سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد دونوں کمرے سے باہر آئے۔ بھیم سنگھ کے چہرے پر تجسس اور سنتو تائی کے چہرے پر انتہائی پریشانی کے اثرات نمایاں تھے۔ بھیم سنگھ کچھ سوچتا ہوا حویلی کے اندر مٹر گشت کرنے لگا۔ وہ بار بار رسوئی، کلدیپ، دیپا کے کمروں کا جائزہ لینے کے لئے آتا جاتا رہا۔ اسی دوران حویلی کے داخلی دروازہ پر دستک کی آوازیں پیدا ہوئیں۔

"کون ہے؟" سنتو تائی نے پوچھا۔

"جی میں ڈھونڈ، لالہ جی پر ستنا کا دم کرنے والا اپنے ساتھ لایا ہوں"۔

"ارے بھگوان کا شکر ہے کہ تم آ گئے۔ لالہ کی طبیعت پھر سے خراب ہو رہی ہے"۔ سنتو تائی نے حویلی کا داخلی دروازہ کھولا۔ ڈھونڈ اپنے ساتھ ایک ستر اسی سالہ بڈھے کو لے کر آیا تھا۔ جس کا حلیہ بالکل فقیروں جیسا تھا۔ بوسیدہ لنگی پہنے اور اس کے گنجے سر پر لٹکی چٹیا بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ ڈھونڈ نے اپنے سامنے پولیس پارٹی کو دیکھا تو اس نے کسی قسم کے تاثر کا اظہار نہ کیا۔ وہ چونکا اور نہ ہی اس نے تھانیدار بھیم سنگھ کی موجودگی کو کوئی اہمیت دی۔ بس نحیف سا نستے کہا۔

اپاہج لالہ جی کو وہیل چیئر میں لایا گیا۔ ڈھونڈ کے ساتھ آئے جوگی قسم کے بڈھے نے کوئلہ اور حرمل کی دھونی سے ستنا کا عمل شروع کیا۔ (ستنا دراصل ہندوانہ عقائد کے مطابق ہر قسم کے جادوئی عمل کا توڑ ہے، جس کا ماہر شخص ویدوں، پرانوں، گیتا کے کچھ مخصوص حصوں کو لے کر پڑھتا ہے۔ اس کا مقصد کسی انسان سے چمٹے بیماری پھیلانے والی شیطانی طاقتوں کو بھگانا ہوتا تھا۔ اس میں کوئلوں پر حرمل کے دانوں کو ڈال کر دھونی دی جاتی تھی اور یہ عمل اپاہجوں، فالج زدہ لوگوں کے لئے جوگی قسم کے لوگ کیا کرتے تھے۔ یہ عمل آج بھی ہندوستان میں شامل

سندھ کے ماہر سنتا جوگی کرتے ہیں۔

ٹی آئی سی تھانے کی ٹیم اس عمل کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی۔ پوری حویلی میں حرمل کی شدید ناقابل برداشت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ دھونند کے سنتا کے عمل کے بعد لالہ جی کی گردن کے اردگرد اپنے تھیلے میں موجود کالے رنگت پر مشتمل چپچپا سا مرہم لگایا۔

''ہاں جی، لالہ جی کچھ سکون مل رہا ہے؟''

لالہ نے لقوہ زدہ زبان سے لڑکھڑا کر اثبات میں مسکرا کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں!''

دھونند آہستہ آہستہ ہتھیلیوں کی مدد سے کافی دیر تک اس کی گردن کے حلقوں میں اپنا لیپ ملتا رہا۔ وہ جیسے ہی اس کی گردن سے اپنا ہاتھ اٹھاتا تو لالہ کیدارناتھ اسے اشارے سے کہتا کہ اور مل۔

منتو تائی بولیں۔ ''ارے جب سنتا کے عمل کے ساتھ تمہاری جانب سے مرہم کا ہاتھ ان پر پھرتا ہے تو یقین کرو لالہ کو بہت شانتی ملتی ہے''۔

دھونند کے ساتھ آیا بڈھا جوگی بولا۔ ''بہن جی! بس آپ دیکھتی رہیں، بھگوان نے چاہا تو لالہ جی چند ہفتوں میں بالکل بھلے چنگے ہو جائیں گے۔ بس آپ مجھ پر وشواس کریں''۔

منتو تائی نے چار روپے ملنگ بابے کی تلی پر رکھے تو وہ کان پکڑ کر بولا۔ ''بہن جی! آپ ایسا کر کے مجھے شرمندہ کر دیتی ہیں''۔

''ارے نہیں میں تمہیں تمہارے اس احسان کا کیا بدلہ دے سکتی ہوں، یہ تو صرف آپ کے آنے جانے کا خرچہ ہی ہوگا۔ یہ تو آپ کو لینا ہی چاہئے''۔

تھانیدار بھیم سنگھ جو ابھی تک خموشی سے بیٹھا ان دونوں کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس نے دونوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس کی ایک لمحے کو بات سنیں۔

دھونند اور وہ ملنگ بابا اس کے پاس آ گئے۔

''آپ دھونند جی جوگی ہیں۔ آپ کے بارے میں میں نے اپنے ساتھی تھانیدار نیم سے سنا ہے کہ آپ بڑے پہنچے ہوئے قابل جوتشی اور جادوئی عملیات کی کاٹ کے ماہر ہیں''۔

''جی ہاں، مجھ ناچیز کا ڈنکا اور دور تک بجتا ہے۔ مجھ پر بھگوان کی کچھ خاص کرپا ہے''۔

''اچھا یہ جو آپ اپنے ساتھ ملنگ بابا جی کو لاتے ہیں یہ واقعی سنتا کے گرو ہیں؟''

''جی ہاں سرکار! یہ سول آنے کھرے بڑے نامی گرامی سنتا عمل کے یکتا گیانی ہیں''۔

''لیکن دھونند جی! کسی سنتا کے ماہر کو تلاش کرنا ایسے ہی ہے جیسے لاکھوں ہرنوں میں سے نافہ والا ہرن تلاش کرنا''۔ پھر بھیم سنگھ نے بابا جی کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بابا جی! میرے سر پر دائمی جکڑاؤ والا درد شقیقہ رہتا ہے۔ میں نے بڑے بڑے نامی گرامی ڈاکٹروں، حکیموں سے اس کا علاج کرایا، ٹوٹکے کروائے مگر کوئی آرام نہ آیا۔ میرا اگر آپ یہ مسئلہ حل کر دیں تو میں آپ کو خوش کر دوں گا۔ میرے پاس بھگوان کا دیا بہت کچھ ہے''۔

''سرکار! میرے ہوتے ہوئے اس کی چنتا کیوں کرتے ہیں؟ میں اپنے میدان کا شہسوار گرو ہوں۔ اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں آپ کے سر پر ایسا ''موتام'' پڑھوں گا کہ بھگوان کی کرپا سے آج کی تاریخ کے بعد آپ کے قریب کبھی بھی درد شقیقہ کی بیماری نہیں پھٹکے گی''۔

موتام دراصل سنتا سے ہلکا دوسرے درجہ کا ہندوانہ انداز کا جادو ٹونہ ہوا کرتا تھا۔

''اچھا یہ بات ہے تو آئیں مجھے بھی اپنی کچھ شکتی دکھلائیں''۔ انسپکٹر بھیم سنگھ نے چیلنج دینے والے انداز میں بابا جی سے کہا۔

(جاری ہے)

تذکرہ

جنہیں ہم بھول گئے
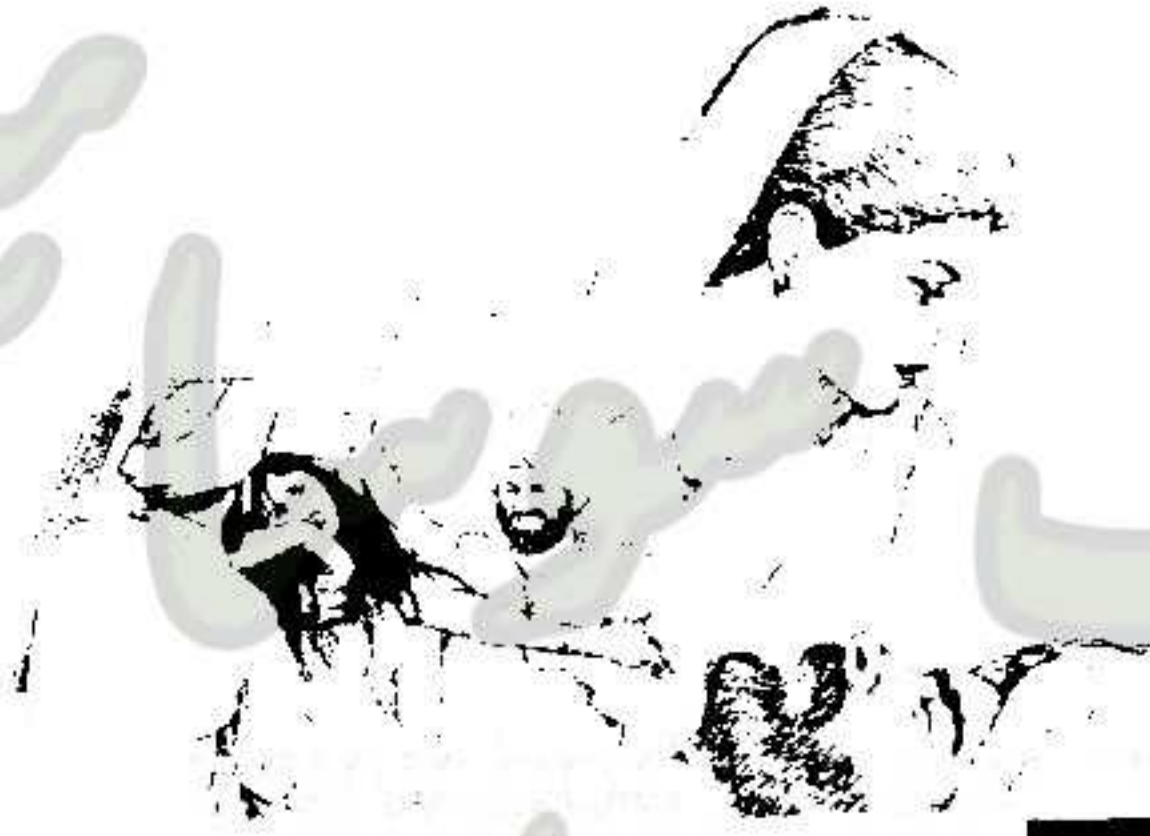
☆ عارف محمود

جب بھی کوئی ایسی کہانی یا واقعہ سننے کو مل جائے جس کے کرداروں کا تعلق 1947ء قیام پاکستان سے ہو تو قلم بے اختیار اس وقت کے مہاجرین اور شہداء کے ذکر کے لئے چل پڑتا ہے۔ وہ پاکستان کی تاریخ ہو ہی نہیں سکتی جس کے اوراق ان کے لہو سے سرخ نہ ہوں۔ خاص طور پر اس وقت متاثر ہونے والی خواتین کے متعلق سوچتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے کو آ جاتا ہے۔ ان لڑکیوں کو کون بھول سکتا ہے جن کے نازک اعضا کاٹ کر ہندوؤں اور سکھوں نے ہمارے پاس بھیجا تھا۔ قوم کی ان ہزاروں بیٹیوں کے متعلق ذرا سوچیں جنہیں ہم بھول گئے ہیں، جن میں عائشہ تھیں، فاطمہ تھیں، زینب اور زہرہ تھیں مگر وہ اغوا ہو کر بلونت کور، مہندر کور اور امیت کور بنیں اور انہوں نے ہرنام سنگھ، کرتار سنگھ، ایشر سنگھ اور درشن سنگھ کو جنم دیا۔ ان میں سے کئی آج بھی وہاں زندہ ہوں گی۔ ایسی ہی ایک بیٹی کی کہانی پیش ہے جو اپنے اندر کئی سوال لئے ہوئے ہے۔

میانی صاحب کے وسیع و عریض قبرستان میں غازی علم الدین شہید کے پچھواڑے ایک خستہ حال قبر ہے۔ قبر کیا ہے، زمین میں دھنسا ہوا ایک گڑھا ہے، مجھے گورکن بتا رہا تھا۔

"یہ قبر بھی عجیب قبر ہے بابو جی۔ کبھی بنتی تھی اور کبھی گرتی تھی۔ چند یہاں والے کہتے تھے اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھ لیا ہے یہاں اس کا عظیم الشان مقبرہ ہونا چاہیے۔ چند لوگوں کا خیال تھا یہ شخص بہروپیا تھا، دھوکے باز تھا، ایک مسلمان خاتون کے پیچھے نفس کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں آیا اور جب غیرت مند مسلمانوں نے اس مسلمان خاتون کو اس کے حوالے نہ کیا تو بے چاروں کی موت مر گیا۔ اپنے آپ کو ریل گاڑی کے سامنے گرا دیا اور ختم ہو گیا۔"

بے شمار قبروں کے بیچوں بیچ یہ گڑھا ایک ایسے شخص کی اپنی کہانی لئے ہوئے ہے جو قیس، فرہاد، مہینوال، پنوں اور وامق کی داستان دہراتا ہوا راہی ملک عدم ہوا۔

لیجئے، میں آپ کو اس قبر کی کوکھ میں سوئے ہوئے اس شخص کی کہانی سناتا ہوں جو بعد میں کلمہ گو بنا۔ یہ کہانی اپنے اندر کئی پیچیدہ سوال لئے ہوئے ہے۔ یوں تو رائے قائم کرنے میں ہر قاری آزاد ہے لیکن کوئی بھی رائے قائم کرتے وقت غیر جانبداری اور انصاف کا دامن نہ چھوڑیں۔

یہ گوپال ہے۔ جالندھر کا ایک گاؤں۔ ہر طرف چیخ و پکار ہے۔ 1947ء کے فسادات کا زمانہ ہے۔ وحشی اور سنگ دل ہجوم سرگرم ہے اور بدحواس دوشیزاؤں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ بھاگتی ہوئی لڑکیاں کبھی اس کونے میں پناہ لیتی ہیں اور کبھی اس کونے میں۔ ان کے اعضاء کٹے ہوئے ہیں، جسم برہنہ ہیں۔ بدن کے انگ انگ سے لہو بہہ رہا ہے۔ یہ زخمی ہیں اور وہ چیختی چلاتی بھاگ رہی ہیں۔ پناہ ڈھونڈ رہی ہیں۔ فضاؤں میں سسکیوں، چیخوں اور کراہوں کے ساتھ ساتھ قہقہوں اور گالیوں کا بے ہنگم سا شور رچا ہوا ہے۔ ہر طرف افراتفری ہے اور آزادی آ رہی ہے۔ صدیوں کی غلامی کے بعد جشنِ آزادی منایا جا رہا ہے۔

کتنا عجیب ہے یہ جشن، کتنی عجیب ہے یہ آزادی۔

اسی عرصۂ محشر میں دس بارہ سال کی ایک لڑکی آہو کی طرح ادھر سے ادھر بھاگ رہی ہے۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ اس کا خوشیوں بھرا گھر جلا دیا گیا ہے۔ چند غنڈے تلواریں لہراتے ہوئے اس کے تعاقب میں ہیں اور وہ چیختی چلاتی دیوانہ وار دوڑ رہی ہے۔ اچانک وہ ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے، وہاں ایک بوڑھا سکھ بیٹھا ہوا ہے۔ وہ اس بدحواس اور گھبرائی ہوئی لڑکی کو دیکھتا ہے۔

"تم کون ہو بیٹی؟"

"میں انسان ہوں بابا! میں ایک مسلمان لڑکی ہوں۔ بابا! یوں سمجھ لو، میں تمہاری لڑکی ہوں۔ غنڈے میرا تعاقب کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے بچاؤ۔"

"گھبراؤ نہیں بیٹی! تم سردار بھگت سنگھ کی پناہ میں ہو۔ کوئی تمہارا بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ حوصلہ رکھو، یوں گھبراؤ اور تڑپو گے تو کچھ نہیں بنے گا۔"

اچانک دو مشتعل منہ سے کف بہاتے ہوئے اور تلواریں لہراتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں۔ "سردار! ابھی ابھی ایک لڑکی اس گھر میں داخل ہوئی ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو۔"

"وہ میری لڑکی ہے۔ بڈھا گرجا۔ کیا تم بھگت سنگھ کی لڑکی پر ہاتھ اٹھانا چاہتے ہو؟ کیا ایک باپ کے روبرو اس کی بیٹی کی عصمت سے کھیلنا چاہتے ہو۔ جاؤ، دفع ہو جاؤ، پاگل پن اور جنون نے تمہیں اندھا بنا دیا ہے۔ تم نے اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کی تعلیمات کو اپنے قدموں تلے روند ڈالا ہے۔ تم انسانیت کے نام پر ایک داغ ہو،

ظلم کا ٹیکا ہو۔"

دونوں "سورماؤں" کے سر ڈھلک جاتے ہیں اور وہ بڑبڑاتے ہوئے سردار کی حویلی سے چلے جاتے ہیں۔

سردار بھگت سنگھ اب عمر کی اس منزل پر تھا کہ یادِ الٰہی ہی اس کا اوڑھنا بچھونا بن کر رہ گئی تھی۔ بیوی، بچے اسے داغِ مفارقت دے کر اس کا ساتھ چھوڑ چلے تھے اور اس سنسان، بھائیں بھائیں کرتی حویلی میں وہ یکا و تنہا تھا۔ فطرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اسے بیٹھے بٹھائے ایک بیٹی مل گئی۔ اگر وہ مسلمان تھی تو کیا ہوا ایک انسان تو تھی۔ بالکل اس کی ہرنام کور کی ہم شکل، اس کی چھوٹی بیٹی ستنام کور کی عمر کے لگ بھگ۔ ہرنام اور ستنام بھی ان ہنگاموں کا شکار ہو گئیں لیکن زینب نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟ ان دو بچیوں کے قتل اور عصمت دری میں اس کا تو کوئی ہاتھ نہ تھا۔ سیاست کے گھناؤنے کھیل سے نابلد یہ سیدھی سادی سی دیہاتی لڑکی اس کے سائے میں پناہ لینے آئی تھی۔ اسے باپ کہہ کر پکارا تھا۔ بھگت سنگھ کے وجود میں شریف انسان کا لہو موجزن تھا۔ بھگت سنگھ کے وجود میں شریف انسان کا لہو موجزن تھا۔ اس نے زینب کو نہ صرف پناہ دی بلکہ اسے اپنی بیٹی بنا لیا۔ زینب بھگت سنگھ کے گھر کی فرد بن گئی۔ اس نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور بوڑھے سردار کی خدمت گزاری کو اپنا شعار بنا لیا۔

کبھی کبھی یہ خیال ایک کوندے کی طرح اس کے ذہن میں ابھرتا کہ اگر سردار کو کچھ ہو گیا تو اس کا کیا بنے گا۔ وہ اس وسیع و عریض دنیا میں کسے اپنا کہہ کر پکارے گی اور کون بھگت سنگھ بن کر اس کے ڈھلکتے ہوئے آنچل کو گرنے سے بچائے گا۔

وقت یونہی دبے پاؤں گزرتا رہا۔ زینب بچپن کی سدود پھلانگ کر جوانی کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ اس کے متناسب خدوخال نے اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیا۔ اس کا وجود ایک ایسی عورت کے سراپا میں ڈھلنے لگا تھا جسے چاہنے اور چاہے جانے کی بے پناہ خواہش ہوتی ہے اور پھر فطرت کا تقاضا بھی تو یہی تھا کہ وہ تخلیقِ کائنات کے مقدس کام میں اپنا کردار ادا کرے۔ بھگت سنگھ نے زمانے کا گرم سرد چکھا تھا۔ وہ اپنی منہ بولی بیٹی کی فکر میں پہروں پریشان رہتا۔ وہ چاہتا تھا کہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے وہ اسے دلہن کے روپ میں دیکھ لے۔

مگر یہ کیونکر ممکن تھا؟ وہ مسلمان تھی اور اس گاؤں کے سارے مسلمان یا تو سرحد پار دھکیل دیے گئے تھے اور یا جنونیوں کے ہاتھوں ابدی نیند سو چکے تھے۔ ایک روز اس نے زینب کو پاس بلایا، پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہنے لگا۔ "بیٹی زینب! تم بڑی ہو رہی ہو میں اب کچھ دنوں کا مہمان ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تمہارے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ مگر یہ کیونکر ممکن ہے بیٹی! سب مسلمان یہاں سے چلے گئے ہیں اگر تم سکھ مذہب اختیار کر لو تو شاید...."

زینب سر جھکا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ واقعی اب اس کا اس سرزمین پر کوئی نہ تھا۔ گوہانہ گاؤں کے مسلمان مکینوں کو موت چاٹ گئی تھی۔ اونچی اونچی بنی ہوئی حویلیاں اب غیروں کے قبضے میں تھیں اور سرحد کے اس پار جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ خاردار تاروں اور کڑے پہرے نے پیار، محبت، نفرت اور حقارت کو تقسیم کر دیا تھا۔

وہ جلد ہی زینب سے مہندر کور بن گئی۔

اس کے مہندر کور بننے کے چند ہی دنوں بعد بھگت سنگھ کا بھتیجا بوٹا سنگھ اپنے ماموں سے ملنے آیا۔ یہ پچیس چھبیس سال کا ایک گھبرو تھا۔ اٹھتی ہوئی جوانی، تنومند جسم، کھلتا ہوا رنگ۔ پنجاب کے پانیوں نے اس کے حسن کو اور نکھار دیا تھا۔ اس نے مہندر کور کو انکھیوں سے کئی بار دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس نے اپنے دل کی غیر متوازن دھڑکنوں سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ مہندر کور کی زلفوں کا اسیر بن چکا ہے۔ دل کے آنے کے ڈھنگ بھی نرالے

ہی۔ جب تک اس نے مہندر کور کو نہ دیکھا تھا، جوانی کے بھڑکتے ہوئے الاؤ کو اپنے من میں چھپائے پھرتا رہا۔ مہندر کور پر ایک اچٹتی سی نگاہ پڑنے کی دیر تھی کہ اس کا وجود جوالہ مکھی بن گیا اور وہ ایک پتنگے کی طرح اس کا طواف کرنے لگا۔

بھگت سنگھ کی بوڑھی آنکھوں نے پتنگے کی یہ وارفتگی اور شوریدہ سری دیکھی تو بھانپ گیا کہ بوٹا سنگھ دل کے ہاتھوں لاچار ہو گیا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ دونوں کو ازدواجی بندھن میں منسلک کر دیا جائے۔

اس نے زینب کو صورت حال سے آگاہ کیا اور اس کی نیم خاموشی کو اس کی رضا سمجھتے ہوئے اسے کچھ ہی دنوں بعد بوٹا سنگھ کے حوالے کر دیا۔ بوٹا سنگھ اپنی پتنی مہندر کور کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں چلا آیا اور یوں ہنسی خوشی ان کے دن گزرنے لگے۔ مہندر کور اگر شمع تھی تو بوٹا سنگھ پروانہ۔ وہ اسے دیکھ دیکھ کر جیتا اور اس کے ادنیٰ سے اشارے پر ہر وہ کام کر گزرتا جو شاید عام حالات میں وہ نہ کر سکتا۔ شادی کے ایک سال بعد مہندر کور کے بطن سے تنویر کور اور پھر دوسرے سال دلیر کور پیدا ہوئیں۔ دونوں بچیاں ماں اور باپ کی طبیعتوں اور شکلوں کا حسین امتزاج تھیں۔ بوٹا سنگھ انہیں دیکھ کر پھولا نہ سماتا۔ اس کی زندگی کے لق و دق صحرا میں بہار دبے پاؤں چلی آئی تھی۔ تنہا اداس گھر میں اب قہقہے گونجنے لگے تھے۔ وہ بے حد خوش تھا۔

برصغیر کے حالات اب کچھ روبہ سکون ہو چلے تھے۔ درندگی اور وحشت کی جگہ اب سنجیدگی اور متانت نے لے لی تھی۔ دونوں حکومتوں نے اس عظیم المیے پر انسانی نقطۂ نظر سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ رفاہی اور اصلاحی تنظیموں نے دونوں مملکتوں کے تعاون سے مغویہ عورتوں کی بازیابی کا کام شروع کر دیا۔ مغویہ عورتوں کی بازیابی کا کیمپ مختلف آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ افسر اور رضاکار فہرستیں مرتب کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک ایک شخص بولا۔

''بھگت سنگھ کے گھر میں بھی تو ایک مغویہ لڑکی ہے جسے سکھ دھرم قبول کرنے پر مجبوراً ایک سکھ سے بیاہ دیا گیا ہے۔'' کیمپ کے انچارج افسر نے اپنی نوٹ بک میں زینب کا نام لکھا اور اپنے رضاکار اور محلے کے چند آدمی بھگت سنگھ کے گاؤں کو روانہ کر دیئے۔ یہ لوگ جب گاؤں پہنچے تو بھگت سنگھ مرض الموت میں مبتلا تھا۔ سانس کی ایک پتلی سی ڈوری رکی ہوئی تھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چراغ سحری ہے اور کسی دم بجھ جائے گا۔

''سردار صاحب! کیا زینب کو آپ نے پالا پوسا اور اپنی لڑکی بنائے رکھا؟''

''ہاں بیٹا! زینب میری بیٹی ہے، منہ بولی بیٹی۔ واہگورو کی کرپا سے میں نے اس کی جوانی کی حفاظت کی اور جب اس کے بیاہنے کا وقت آیا تو اس کا ہاتھ ایک گھبرو بوٹا سنگھ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اب وہ اس کے ساتھ اس کے پنڈ رہتی ہے۔ اب وہ زینب نہیں رہی بلکہ لوگ اسے مہندر کور کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ دو بچیوں کی ماں ہے۔''

''مگر وہ مسلمانوں کی اولاد ہے سردار جی! دونوں حکومتوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مغویہ لڑکیاں برآمد کرائیں اور انہیں متعلقہ حکومتوں کے حوالے کر دیا جائے''۔

''کس نے اغوا کیا ہے زینب کو؟ کس میں جرأت تھی کہ اسے میرے جیتے جی ہاتھ لگاتا۔ وہ فسادات میں بے یار و مددگار بھٹک رہی تھی کہ میں نے اسے سہارا دیا۔ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب وہ زینب سے مہندر کور بن چکی ہے لیکن کسی نے اس پر جبر تو نہیں کیا۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہاں رہنا تھا پس وہ سکھ مت قبول کرنے پر مجبور ہوگئی''۔

مہندر کور اور بوٹا سنگھ کے گاؤں کا نام نوٹ کرنے کے بعد وہ لوگ جانے لگے تو بوڑھے سردار نے زندگی

ہوئی آواز میں کہا۔

"بھائیو! اگر مہندر نے پاکستان جانا ہی ہے تو خدا کے لئے مجھے اس کی ایک جھلک ضرور دکھا دینا۔ میں اپنی بیٹی کو مرنے سے پہلے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں"۔

"یہ ناممکن ہے سردار جی!" اور پھر وہ چلے گئے۔

بھگت سنگھ اس واقعے کے بعد صرف چار دن زندہ رہا اور پھر آنکھیں موند لیں، ہمیشہ کے لئے۔ بوٹا سنگھ بہتیرا چیخا چلایا لیکن اس کی کسی نے نہ سنی۔ مروجہ قوانین کے تحت زینب عرف مہندر کور اپنی بچی تنویر کور کو گلے سے لگائے پاکستانی حدود میں داخل ہوگئی۔ دلیر کور کو بوٹا سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔

"مہندر! تو میرا انتظار کرنا، میں ضرور آؤں گا۔ یہ دنیاوی قوانین ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ ہم دونوں انسان ہیں۔ ہم نے انسانوں کی طرح پاک محبت کی ہے اور اس محبت اور پیار کے بدلے میں رب نے ہمارے چمن میں دو پھول کھلائے ہیں"۔ بوٹا سنگھ نے جاتے وقت مہندر کور سے کہا۔

سرکاری گاڑی نے سرحد پار کی اور بوٹا سنگھ دیر تک گرواڑاتی گاڑی کی دھول دیکھتا رہا۔ آنسو قطرہ قطرہ اس کی ڈاڑھی میں جذب ہوتے رہے اور پھر گاڑی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ مہندر اس سے دور جا چکی تھی۔ مغویہ خواتین کے کیمپ میں عجیب طرح کی افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ بچھڑے ہوئے اپنے پیاروں کو متلاشی نگاہوں سے ڈھونڈ رہے تھے۔ اگر کوئی کسی سے اتفاقاً مل بھی جاتا تو اشکوں کے بند ٹوٹ پڑتے، ہچکیاں بندھ جاتیں، سسکیوں سے فضا بوجھل ہو جاتی۔

مہندر اپنی بچی تنویر کور کو گلے سے لگائے ہر آنے جانے والے کو گھور رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک عورت کافی دیر سے اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہے مگر وہ کون ہے، کیا وہ مجھے جانتی ہے؟ خیالات کا ایک ریلا اس

کے ذہن میں آتا اور وہ بھاگتے، روتے، سہمے ہوئے لوگوں کے چہرے تکنے لگ جاتی۔

وہ عورت تھوڑی ہی دیر بعد اس کے قریب آئی اور پوچھا۔

''بی بی! تو کہاں سے آئی ہے اور تیرا نام کیا ہے؟''

مہندر کو یہ آواز مانوس سی معلوم ہوئی۔ بچپن کی یادیں کسی متحرک تصویر کی طرح اس کی آنکھوں میں گھومنے لگیں۔ کوہالہ کے جنوبی کونے میں ان کا صاف ستھرا مکان، مکان کے سامنے حد نظر تک پھیلا ہوا وسیع سرسبز میدان، اس میدان میں اس کی بڑی بہن انوری سے اس کی لڑائیاں، کھیل کود، آنکھ مچولی۔

''میرا نام زینب ہے کوہالہ میں اپنی بہن اور ماں باپ کے ساتھ رہتی تھی۔ ماں باپ میری آنکھوں کے سامنے شہید کر دیئے گئے، بہن کو فسادیوں نے اغوا کر لیا اور پھر میں ایک نیک دل سردار کے گھر پلی، بڑھی''۔

''میری زینب، میری بہن! میری طرف دیکھ، میں تیری بدنصیب بہن انوری ہوں۔ آ..... میرے سینے سے لگ جا۔ میرے کلیجے کی ٹھنڈک، میری آنکھوں کا نور''۔

دونوں بہنیں یوں ایک دوسرے سے چمٹ گئیں جیسے ازل سے دو بچھڑی ہوئی روحیں ہوں۔ آنسو ایک سیلاب کی طرح بہنے لگے۔ ضبط کے سارے بند ٹوٹ گئے۔ دس سال کے طویل عرصے کے بعد وہ مل رہی تھیں۔

''بہنا! میں ہفتے میں ایک بار ضرور اس کیمپ کا چکر لگانے آ جاتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا تم زندہ ہو اور ایک روز ضرور تم آؤ گی۔ میری زینو! تو کیا جانے میں نے جدائی کی یہ گھڑیاں کس طرح رو رو کر کاٹی ہیں۔ میری بابل جائی! تو اگر نہ ملتی تو میں رو رو کر اندھی ہو جاتی۔ دیواروں سے سر پھوڑ لیتی، ان سے مل، یہ تیرے بہنوئی بشیر ہیں''۔

بشیر نے پیار سے زینب کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی گود میں ننھی تنویر کو گلے سے لگا لیا اور پھر یہ لوگ چتوکی روانہ ہو گئے۔ ادھر بوٹا سنگھ مہندر (زینب) کے فراق میں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہا تھا۔ وہ دن بھر دُمیر کو کاندھوں پر اٹھائے دفتروں کے چکر کاٹتا۔ کبھی ہائی کمیشن کے دفتر، کبھی آبادکاری کے دفتر اور کبھی مغویہ خواتین کے دفتر لیکن ہر جگہ سے اسے ٹکا سا جواب ملتا۔ سب اسے یہی کہتے کہ وہ مہندر کا خیال دل سے نکال دے۔ مہندر اس کے لئے کمان سے نکلا ہوا ایک ایسا تیر بن چکی تھی جس کی تلاش بے سود تھی لیکن عشق ان دنیاوی بندھنوں اور انسانی رکاوٹوں پر خندہ زن تھا۔ انسانی حد بندیوں اور قوانین کا دل کی راجدھانی پر حکم نہ چل سکتا تھا، اس نے کوشش جاری رکھی اور آخر وہ کسی نہ کسی طرح بشیر کا پتہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ نہ جانے کس طرح اس نے سرحد پار کی۔ چھپتا چھپاتا مسلمانوں کے بھیس میں وہ چتوکی پہنچا اور بشیر کے دروازے پر دستک دی۔

''تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟'' بشیر نے پوچھا۔

''میں سرحد پار سے آیا ہوں اور اپنی بیوی مہندر کور سے ملنا چاہتا ہوں''۔

''وہ مہندر کور نہیں ہے، زینب ہے۔ ہم نے اسے دوبارہ مسلمان بنا لیا ہے..... تم سکھ ہو اور تم نے مسلمانوں کی ایک عورت کو خراب کیا ہے۔ اگر عافیت چاہتے ہو تو یہاں سے فوراً چلے جاؤ ورنہ مسلمان تمہاری تکا بوٹی کر دیں گے''۔

''مہندر کور پھر سے مسلمان ہو گئی ہے۔ وہ میرے لئے زینب سے مہندر بنی تھی تو کیا میں اس کے لئے بوٹا سنگھ سے جمیل احمد نہیں بن سکتا''۔

''جمیل احمد!''

''ہاں، ہاں جمیل احمد۔ یہ نام مجھے بے حد پسند ہے۔ میرے بچپن کا ایک یار بھی جمیل احمد تھا۔ غنڈوں اور فسادیوں نے اسے ہلاک کر دیا۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں بشیر صاحب! مجھے مسجد میں لے چلئے۔ میرا اسلامی

رحم نہیں ... کیجئے لیکن خدا اور رسولؐ کے واسطے میری بیوی اور بچوں کو مجھ سے ملوا دیجئے۔ میں ان کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتا"۔

"لیکن زینب تو یہاں نہیں ہے وہ لاہور کے نزدیک موضع نور پور چلی گئی ہے۔ وہاں ہمارے کچھ رشتہ دار ہیں وہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔ آؤ ... اندر آؤ۔ اگر واقعی تمہارا دل نور ایمان سے منور ہے اور تم اسلام کی صداقت پر یقین رکھتے ہو تو سبحان اللہ، آج کے بعد تم ہمارے دینی بھائی ہو"۔

دوسرے روز انوری، اس کا شوہر بشیر اور پاکستان میں نووارد بوٹا سنگھ موضع نور پور جارہے تھے۔ بس پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی اور بوٹا سنگھ تصور ہی تصور میں زینب سے باتیں کررہا تھا۔

نور پور پہنچ کر بوٹا سنگھ کو ایک الگ جگہ ٹھہرایا گیا سارے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی کہ ایک سکھ زینب کا تعاقب کرتے ہوئے اسے لینے آیا ہے۔ مولویوں نے فتوے دیئے کہ مردود قابل گردن زونی ہے۔

بڑے بوڑھوں نے کہا کہ کافر حیلہ بازیوں سے کام لے رہا ہے۔

پڑوسیوں نے کہا یہ خبیث ہماری عزت پر ہاتھ ڈالنے آیا ہے۔

عورتوں نے کہا اس کی تکا بوٹی کرڈالو۔

بوٹا سنگھ نے کہا۔ "مجھے اور زینب کو عدالت میں لے چلو۔ وہاں دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا"۔

پنچایت نے یہ بات مان لی اور فیصلہ ہوا کہ اگلے چاند کی دس تاریخ کو دونوں کو لاہور کے کسی مجسٹریٹ کے روبرو پیش کردیا جائے۔ بوٹا سنگھ اس دوران لاہور چلا آیا اور چاند کی دسویں تاریخ کا انتظار کرنے لگا۔

اس اثناء میں گاؤں والوں کے مشورے سے زینب کا نکاح بستی کے ایک نوجوان منظور احمد سے کردیا گیا اور زینب پر اچھی طرح واضح کردیا گیا کہ مسلمانوں کے ازلی دشمن سکھ سے اس کا نباہ ناممکن ہے۔ اس سیدھی سادی دیہاتی لڑکی نے ان باتوں کا گہرا اثر لیا اور اپنے "سابقہ گناہوں" پر پچھتانے لگی۔ تاریخ مقررہ پر زینب اور بوٹا سنگھ عدالت میں پیش ہوئے لیکن بوٹا سنگھ کی توقعات کے بالکل برعکس زینب نے اس سے مکمل لاتعلقی کا اظہار کیا اور بھری عدالت میں اسے صلواتیں سنانے لگی بوٹا سنگھ نے چیختے ہوئے کہا۔

"میرے بچوں کی ماں زینب! مجھے یوں نہ ٹھکرا۔ میں اپنا وطن، اپنے عزیز اور اپنا قبیلہ چھوڑ کر تیرے در پر آیا ہوں۔ زینب! تجھے پیارے رسولؐ کا واسطہ، میری تذلیل نہ کر۔ میں اب بوٹا سنگھ نہیں ہوں بلکہ میں نے اسلام قبول کرلیا ہے۔ تیرے رسولؐ پر ایمان لے آیا ہوں۔ اپنا قدیم مذہب ترک کردیا ہے۔ تیرے بھائی بندوں میں شامل ہوگیا ہوں۔ زینب! اپنے قول و قرار سے آنکھیں بند نہ کر۔ تجھے تنویر کا واسطہ، دلمیر کا واسطہ۔ مجسٹریٹ صاحب! مجھ پردیسی پر رحم کیجئے۔ ہمارے رسولؐ کا بھی یہی حکم ہے کہ جو شخص زبان سے یہ کہہ دے کہ وہ مسلمان ہے اسے مسلمان ہی سمجھنا چاہیئے۔ میں کیونکر اپنا دل چیر کر آپ کو دکھاؤں۔ خدا کے لئے میرا گھر نہ اجاڑیئے۔ مجھے زینب اور میرے بچے دے دیجئے"۔

وہ نہ جانے کتنی دیر وہاں چلاتا رہا لیکن زینب اپنے رشتہ داروں کے جلو میں وہاں سے چلی گئی وہ چیختا رہا اور پھر اس کی چیخیں گاڑیوں کے شور اور لوگوں کے ہجوم میں جذب ہوکر ڈوب گئیں۔

عدالت نے بوٹا سنگھ کے استدلال کو رد کردیا تھا اور زینب کو اپنے شوہر منظور کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔

جمیل احمد کی دنیا اجاڑ ہوگئی۔ وہ اپنے کاندھے پر دلمیر کو اٹھائے بے مقصد آوارہ گردوں کی طرح گھومتا رہا۔

پھر اسے ایک خیال سوجھا۔ ایک آوارہ سا خیال ایک عاشق کا خیال۔ وہ شاہدرہ ریلوے سٹیشن پر بے مقصد گھومتا رہا۔ اچانک اسے دور سے گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس نے پل بھر لے لئے کچھ سوچا اور پھر اپنی بچی سمیت اپنے آپ کو ریلوے لائن پر گرا دیا۔ دیوہیکل انجن کے کچھے نے بچی کو اٹھا کر پرے پھینک دیا لیکن اس کے آہنی سفاک پہیے بوٹا سنگھ کو کچلتے ہوئے گزر گئے وہ جسم کی قید سے آزاد ہو چکا تھا اس کی جیب سے ایک رقعہ برآمد ہوا جس پر لکھا تھا:

''میری جیب سے ملنے والا اثاثہ چودہ سو روپے کسی نیک کام پر لگایا جائے۔ مجھے زینب کے گاؤں نور پور میں دفن کیا جائے۔ زینب کو کہا جائے کہ اگر اس سے ہو سکے تو کبھی کبھی میری قبر پر آ کر چراغ جلا دیا کرے۔

(جمیل احمد)''

لیکن انتظامیہ نے فرقہ وارانہ فساد کے پیش نظر اسے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ اس کی نماز جنازہ میں ڈیڑھ دو ہزار افراد نے شرکت کی۔

کیا زینب اس کے مزار پر اس کی وصیت کے مطابق چراغ جلاتی ہے؟ کیا اب بھی زینب کے دل میں جمیل جگنو بن کر چمکتا ہے؟

کیا دلمیر جو اب منور کے نام سے مشہور ہے اپنی ماں زینب عرف مہندر کور کو یاد کرتی ہے؟

افسوس، زینب مجھ سے دور ہے پتہ چلا تھا کہ وہ بیرون ملک چلی گئی تھی۔ اس کی شادی بھی وہیں ہوئی۔ نہ جانے وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ میں اس سے نہیں مل سکتا۔

''منور اب پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ ایک برادر اسلامی ملک میں رہتی ہے۔ منور چار سال کی بچی تھی جب لاہور کی ایک خاتون وکیل نے اسے گود لے لیا اس وقت اس مہربان خاتون کے احساسات یہ تھے کہ جب لوگ کتوں، گھوڑوں اور طوطوں کو پالنے اور ان کے ناز نخرے برداشت کرنے میں کسی قسم کی شرم یا حجاب محسوس نہیں کرتے تو وہ ایک معصوم لاوارث اور زمانے کی ٹھکرائی ہوئی بچی کو کیوں اپنے کلیجے سے نہیں لگا سکتی؟

انہوں نے اپنی بساط کے مطابق منور کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اس کی نشست و برخاست کا خیال رکھا۔ اسے سوسائٹی کے معزز اور نامور افراد سے ملایا اور جوان ہونے پر اس کا ہاتھ ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دیا جو ہر طرح سے منور کے اہل تھا۔

اس نیک دل خاتون نے بتایا کہ دراصل تقسیم ملک کے وقت میں نے انسانی ظلم و ستم کے جو واقعات دیکھے تھے اس نے میری روح کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں پہروں سوچتی رہتی کہ آخر انسان اس قدر بوکھلا کیوں گیا ہے؟ کیوں اس پر وحشت اور پاگل پن سوار ہو گیا ہے؟

مغویہ خواتین کی بازیابی کے سلسلے میں میں نے درندگی اور مردم آزاری کے جو ہولناک مناظر دیکھے انہیں دیکھ کر میں انسان کے مستقبل سے تقریباً مایوس سی ہو گئی اور جب منور ایک بے سہارا بچی کے روپ میں میرے سامنے آئی تو میں تڑپ اٹھی اور اسے گلے لگا لیا اور میں سوچ رہا تھا کہ جس روز مشیت نے یہ محسوس کیا کہ خطۂ ارض پر اس کا خلیفہ سرکش بے رہرو اور اس سے بدگمان ہو گیا ہے وہ انسانی وجود کی بقا کا آخری دن ہوگا اور پھر

''بڑے بڑے دیوہیکل پہاڑ اس طرح فضاؤں میں اڑتے پھریں گے جیسے روئی کے گالے ہوں۔ آسمان سے آگ برسنے لگے گی اور سمندر آبادیوں پر چڑھ دوڑیں گے اور کائنات آن واحد میں دم توڑ دے گی''۔

جمیل احمد کے دل میں کیا تھا؟

کیا اس نے اسلام تہہ دل سے قبول کر لیا تھا؟

کیا وہ واقعی شہید محبت تھا؟

خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

***

ایک تاثر ایک کہانی

آگ ابھی بجھی نہیں

بھارت کے ساتھ امن کی آشا اور پیر کی بھاشا کا راگ الاپنے والوں کے لئے تازیانہ

☆ اشتیاق احمد

چند لمحوں تک بغور دیکھنے کے بعد محمود الحسن پہچان گیا کہ اس کا بدترین دشمن آج اس کے سامنے تھا۔ وہ دشمن جو کبھی جگری دوست تھا۔ پندرہ بیس سکھوں کے درمیان کھڑا اجیت سنگھ، آج بھی نیلی قمیص میں تھا۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے ساتھیوں سے باتیں کئے جا رہا تھا۔ اس بات سے لاعلم کہ اس کے دیرینہ دوست نے آج اسے ڈھونڈ لیا ہے اور موت اس کے سر پر کھیل رہی ہے۔

پچیس سال پہلے محمود الحسن اور اجیت سنگھ پانی پت کے ایک ہی محلے میں رہا کرتے تھے۔ وہ لنگوٹیے یار تھے۔ ان کا ایک اور دوست بھی تھا جس کا نام فاروق تھا۔ یوں بھی اسے فاروق اعظم کہا کرتے تھے۔ اجیت سنگھ کو نیلا رنگ بہت پسند تھا۔ وہ ہمیشہ نیلی قمیص میں ملبوس نظر آتا۔ تینوں کی دوستی مثالی تھی۔ ایک بار ان کے محلے پر مسلح ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تو پورے محلے میں ان تینوں کے سوا کوئی نہ تھا جو ڈاکوؤں کے مقابلے پر نکلتا۔ انہوں نے اپنی لاٹھیاں لیں اور ڈاکوؤں پر پل پڑے۔ پھر لوگوں نے ڈاکوؤں کو دُم دبا کر بھاگتے ہی دیکھا۔ اسی قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ان کی ذات سے منسوب تھے۔

اجیت سنگھ کہا کرتا تھا۔ ہم تینوں بھائی ہیں۔ وقت پڑنے پر ہم ایک دوسرے کے لئے جان کی بازی لگا دیں گے۔ جواب میں محمود الحسن اس کا شانہ تھپکتا۔ کوئی وقت آئے تو سہی، تم سے پہلے میں جان دوں گا۔ فاروق بھی پیچھے نہ رہتا۔ تم دونوں سے پہلے میں مروں گا۔

پھر وہ وقت آ ہی گیا۔ جب انہیں ایک دوسرے کے لئے مر جانا چاہئے تھا۔ ملک میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔ ہندو اور سکھ مل کر مسلمان بستیوں پر دھاوے بولنے لگے۔ آگ پھیلتی گئی اور ایک دن اس آگ نے پانی پت کو بھی

اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''اجیت سنگھ! یہ کیا ہو رہا ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے، آخر لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، یہ کیوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے ہیں۔ اجیت سنگھ! تمہارے بھائی بھی تو ہندوؤں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ تم ان کو کیوں نہیں روکتے اجیت سنگھ؟'' یہ کہتے وقت محمود کی آواز بھرا جاتی اور آنکھیں امڈ پڑتیں۔

''میں تو ان کے ساتھ نہیں ملا ہوں محمود! پھر تم کیوں فکر کرتے ہو؟ تم پر اور تمہارے گھر پر آنچ نہیں آئے گی۔ اسی طرح فاروق کا گھر بھی محفوظ رہے گا۔ سب جانتے ہیں، تم دونوں میرے دوست ہو۔''

''مگر اجیت! میں مسلمان ہوں اور مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ ان کے بچوں کو نیزوں پر اچھالا جا رہا ہے۔ ان کی بیٹیوں کی عصمت لوٹی جا رہی ہے۔ کیا یہ آگ ہمارے محلے تک نہیں پہنچے گی؟ تم تنہا کیا کر لو گے۔ تم انہیں کیسے روک سکو گے؟ کیا وہ تمہارا اس وقت تک خیال کریں گے؟''

''تم فکر نہ کرو۔'' اجیت پھر کہتا۔

''میں فکر نہ کروں یہ کیسے ہو سکتا ہے اجیت! میرے گھر میں میری بوڑھی ماں ہے، جوان بہن ہے۔ اسی طرح فاروق کے بھی ماں باپ ہیں اور بہن بھی، اور ہم صرف تین آدمی ہیں۔ کوئی گروہ ہم پر ٹوٹ پڑا تو ہم کیا کر لیں گے؟''

''تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ ہم تینوں نے ڈاکوؤں کے پورے گروہ کو مار بھگایا تھا؟''

''وہ ڈاکو تھے اجیت! ان کا کام صرف دولت لوٹنا تھا۔ یہ ڈاکو انسانیت کے دشمن ہیں۔ ان سے نبٹنا اتنا آسان نہیں۔''

''میں کہتا ہوں تم فکر نہ کرو۔ تم پر کوئی برا وقت نہیں آئے گا۔''

محمود اجیت کی باتوں سے مطمئن نہیں تھا۔ پاکستان کا اعلان ہوتے ہی ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ قتل و غارت کا بازار پہلے کی نسبت زیادہ زور شور سے گرم ہو گیا۔ اس سے محمود اور فاروق تذبذب میں مبتلا ہو گئے۔ وہ اجیت سنگھ کا ساتھ بھی نہیں چھوڑ سکتے تھے اور انہیں یہاں ٹھہرنے میں بھی عافیت نظر نہیں آتی تھی۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ ایک صبح محمود کی والدہ پر دل کا دورہ پڑا۔ اس وقت تینوں وہیں موجود تھے۔ اجیت سنگھ نے محمود کو فوراً ڈاکٹر کو لانے کا مشورہ دیا۔

''ایسے میں ڈاکٹر کہاں ملے گا؟''

''تم کوشش تو کرو، ہم دونوں یہاں چوکس بیٹھے ہیں۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ۔''

''ہاں محمود! تم ضرور کسی ڈاکٹر کو ڈھونڈ لاؤ''۔ فاروق نے بھی موقع کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

وہ ڈاکٹر کی تلاش میں نکلا۔ اسے کسی دکان، کسی شفاخانے میں کوئی ڈاکٹر نہیں ملا۔ دکانیں دواؤں سے جوں کی توں بھری پڑی تھیں مگر کوئی متنفس نہیں تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مارے مارے پھرنے کے بعد لوٹا تو سب کچھ لٹ چکا تھا۔ وہاں اجیت تھا نہ فاروق، ماں تھی نہ بہن۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ایک برچھی ماں کے سینے میں پیوست تھی، دوسری فاروق کے سینے میں لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا کلیجہ تو بہن کی لاش دیکھ کر دہل گیا۔ وہ لرز اٹھا۔ کاش اس کی بہن کی لاش بھی ماں اور فاروق کی لاشوں کی مانند ہوتی۔ اس کے جسم میں بھی کوئی برچھی پیوست ہوتی۔ اسے گلا گھونٹ کر مار دیا ہوتا۔ وہ کیسے مر گئی۔ اس کا تصور بھی محمود کے لئے اس قدر وحشت ناک تھا کہ اس کا جی چاہا، والدہ کے سینے سے برچھی نکال کر اپنے سینے میں بھونک لے یا پھر باہر نکل کر ان وحشی درندوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس نے ایک

چادر سے بہن کے برہنہ جسم کو ڈھانپا اور لاٹھی ہاتھ میں لئے باہر نکل آیا۔

دفعتاً اسے فاروق کے ماں باپ اور بہن کا خیال آیا۔ وہ بجلی کی طرح فاروق کے گھر کی طرف دوڑا۔۔۔ معاً اس کے قدم زمین میں دھنس گئے۔ یہاں کا منظر بھی مختلف نہ تھا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اگر دیوار کا سہارا نہ لے لیتا تو گر ہی گیا ہوتا۔ ابھی وہ گم صم کھڑا تھا کہ کسی نے اسے دھیمے لہجے میں پکارا۔ ''محمود...... محمود...... تم کہاں ہو...... خدا کے لئے یہاں سے نکل چلو، ورنہ تم بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے''۔

یہ محمد حسین کی آواز تھی، اس کے پڑوسی کی۔ وہ باہر نکل آیا۔ محمد حسین دو آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''یہ سب کیسے ہوا؟ اجیت کہاں ہے؟ اور تم اس وقت کہاں تھے؟'' وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

''یہ تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے محمود! مسلمانوں کا ایک قافلہ جلد ہی روانہ ہونے والا ہے، ہمیں فوراً اس تک پہنچ جانا چاہئے ورنہ ہمارا بھی یہی انجام ہو گا''۔

''اب مجھے اپنے انجام کی پروا نہیں، تم یہ بتاؤ یہ سب ہوا کیسے اور کس نے کیا؟ اجیت کہاں گیا؟''

''اس کا نام نہ لو...... یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔ آؤ اب چلیں''۔

''کیا! یہ اجیت کا کام ہے؟'' محمود پر ایک بار پھر بجلی گری۔ اس کے حواس مختل ہو گئے...... وہ بڑبڑایا۔ ''اگر یہ سب اس نے کیا ہے تو میں اس سے انتقام لئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ تم جاؤ میں نہیں جاؤں گا''۔

''تم یوں نہیں مانو گے''۔ اس کے ساتھ ہی محمود کے سر پر ایک ڈنڈا لگا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ ایک بیل گاڑی میں تھا۔ یہ مسلمانوں کا قافلہ تھا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلا نہیں تھا کہ قافلہ ایک سپیشل ٹرین میں سوار ہو گیا۔ محمد حسین نے اسے بھی سوار کرایا۔ اس وقت اس پر غنودگی کی کیفیت طاری تھی۔ پھر محمد حسین نے اسے بتایا کہ تمہارے جاتے ہی اجیت سنگھ گھر سے نکلا اور اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گھر سے پندرہ بیس سکھ نکل کر تمہارے گھر کی طرف بڑھے۔ اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے فاروق پر برچھیاں تان لیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اجیت اس طرح دغا دے گا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ اس وقت چونکا جب اجیت تمہاری بہن کی طرف بڑھ چکا تھا۔ فاروق سے رہا نہ گیا۔ وہ پوری قوت سے چلایا۔ ''اجیت یہ ظلم نہ کرو۔ ہمیں جان سے مار ڈالو مگر ایسا نہ کرو''۔

''اگر تم نے زیادہ بکواس کی تو تمہاری بہن کا بھی یہی حشر ہوگا''۔ یہ کہہ کر اجیت پھر رخسانہ کی طرف بڑھا۔ فاروق کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ اس نے برچھیوں کی پروا کئے بغیر اجیت پر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے ایک برچھی اس کے جسم کے پار ہو گئی''۔

محمود نے تقریباً چلاتے ہوئے پوچھا۔ ''مگر تم کہاں تھے؟''

''مم...... میں...... چھت کے قریب والے روشن دان سے دیکھ رہا تھا''۔

''اور تم دیکھتے رہے!''

''میں مجبور تھا دوست، میں بالکل نہتا تھا اور پھر مجھے اپنے بیوی بچوں کو بھی قافلے تک پہنچانا تھا''۔

''بے غیرت ہو تم''۔ محمود غصے سے کانپ اٹھا۔ اس کے دونوں ہاتھ محمد حسین کے گلے کی طرف بڑھے۔ پھر جیسے وہ ہوش و حواس کی دنیا میں لوٹ آیا۔ اس کے بازو نیچے لٹک گئے۔ نگاہیں زمین میں گڑ گئیں۔

آج وہی اجیت سنگھ اس کے سامنے موجود تھا۔ آج

جب کہ وہ پولیس انسپکٹر تھا۔ چند روز پہلے اسے ہدایات ملی تھیں کہ سکھ یاتری پاکستان آ رہے ہیں۔ ان کے جان و مال کی حفاظت پر تمہیں مامور کیا جاتا ہے۔ کسی ایک سکھ کو بھی گزند نہ پہنچے اور نہ ان کے مال و اسباب کا نقصان ہو کیونکہ یہ ملک کی عزت کا سوال ہے۔

وہ خیالات میں گم ٹکٹکی باندھ کر اجیت کو گھورے جا رہا تھا۔ دفعتہً اس کا ہاتھ پستول کے دستے کی طرف بڑھا۔ چمڑے کی پیٹی کا بٹن کھلا اور پھر پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسی وقت ایک سب انسپکٹر اس کی طرف بڑھا۔ ''کیا بات ہے جناب!''

''اوہ، محمد حسین! ادھر آؤ۔ اس نیلی قمیص والے سکھ کو دیکھ رہے ہو تم...... ذرا پہچانو تو اسے''۔

محمد حسین نے سکھ کی طرف دیکھا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر چونک اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محمود کے ہاتھ سے پستول چھین لیا۔

''یہ کیا حرکت ہے، لاؤ پستول مجھے دو'' محمود غرایا۔

''میں نے اسے پہچان لیا ہے۔ یہ تمہارا مجرم اجیت سنگھ ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارے سینے میں انتقام کی آگ ابھی بجھی نہیں ہے۔ تم نے قسم کھائی ہے کہ زندگی میں اگر کبھی اجیت سامنے آیا تو اسے گولی مارنے سے دریغ نہیں کرو گے۔ یہ ہے بھی اس سے بڑی سزا کا مستحق، تم میرے افسر ہو اور میں تمہارا ماتحت ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارا پڑوسی بھی ہوں لیکن اس وقت مجھے اپنے افسر کا نہیں، پڑوسی کا نہیں، تمہارے جذبات کا نہیں، ملک کی عزت کا پاس زیادہ ہے۔ فرض کا احساس ہے۔ تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ان سکھوں کی حفاظت کا فرض ہمیں سونپا گیا ہے۔ کیا تم فرض کی انجام دہی سے غفلت برتنے کے مرتکب ہونا چاہتے ہو؟ تم اپنے افسروں کو، اپنے ملک کو کیا جواب دو گے جس نے تمہارے کندھوں پر ان کی حفاظت کا بوجھ ڈال دیا ہے۔ نہیں میرے بھائی، میرے دوست، میرے پڑوسی، میرے افسر، یہ وقت انتقام کا نہیں، انتقام کی آگ کو اندر ہی اندر دبا دینے کا ہے۔ یہ لو اپنا پستول، اب تم مختار ہو''۔

محمد حسین خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ محمود کے سینے میں لاوا ابل رہا تھا، مگر وہ مجبور تھا، بے بس تھا۔ یک لخت اس کے قدم اجیت کی طرف اٹھنے لگے۔ محمد حسین بوکھلا گیا...... اس نے چاہا کہ دوڑ کر محمود کو روک لے، مگر پھر اس کے قدم زمین میں گڑ کر رہ گئے۔ نہ جانے کیوں؟

اجیت کا منہ دوسری طرف تھا۔ محمود نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اجیت پلٹا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ محمود کو پہچان لینے کے ساتھ ساتھ اس کی نظر اس کی وردی اور ہاتھ میں تھامے ہوئے پستول پر بھی پڑی۔ وہ تھرا اٹھا۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

''تت...... تت...... تم......'' اس کے منہ سے بس یہی الفاظ نکل سکے۔

''ہاں، میں...... میں تم سے انتقام لوں گا۔ میں نے قسم کھائی ہے مگر اس وقت یہ ممکن نہیں۔ افسوس تم میرے سامنے اس وقت آئے جب فرض کی آہنی بیڑی نے میرے پاؤں جکڑ رکھے ہیں اور میں جنبش بھی نہیں کر سکتا۔ میرے سینے کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی ہے۔ یہ مرتے دم تک بدستور رہے گی، یہاں تک کہ ایک دن تم پھر میرے سامنے ہو گے اور اس وقت میں مجبور نہیں ہوں گا۔ قانون کا پابند نہیں ہوں گا۔ میں ہر طرح آزاد ہوں گا۔ اس دن میرے پستول کی گولی تمہارے سینے میں اتر جائے گی۔ وہ دن آئے گا، ضرور آئے گا...... اور یہ تمہاری دھرتی پر ہو گا''۔

محمود کا گلا رندھ گیا اور وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

◆

ضربِ سکندری

پاکستان کیوں ضروری تھا؟

ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں جو کبھی ایک نہیں ہو سکتیں

☆ سکندر خان بلوچ
balochsk@yahoo.com

آج کل ہمارے حکمران بھارت کو ''پسندیدہ ملک'' قرار دینے کے لئے بہت بے چین ہیں۔ ''امن کی آشا'' کی ڈفلی بھی زور سے بجائی جا رہی ہے۔ بھارت دوستی کا جوش اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ بھارت کا کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اور مشرقی پاکستان کا زخم بھی ہم بھول چکے ہیں۔ بھارت دوستی کے لئے نوجوان نسل کی بھی مختلف انداز میں برین واشنگ کی جا رہی ہے جس وجہ سے نوجوان نسل باشعور اور پڑھے لکھے نوجوان پاکستان و ہندوستان کے تعلقات کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے اکثر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ برصغیر کئی سو سال ایک ملک رہا ہے۔ ہندو مسلم کم از کم ایک ہزار سال اکٹھے رہے ہیں۔ کئی مسلمان بادشاہوں اور امراء نے ہندو گھرانوں میں شادیاں کیں۔ ایک جگہ رہتے ہوئے یقیناً ایک دوسرے کی خوشی غمی اور دکھ سکھ میں شریک ہوتے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں بن سنور کر شرکت کرتے رہے، ایک دوسرے کی مذہبی رسومات کا بھی احترام کرتے تھے۔ پھر آخر وہ کون سی وجوہات تھیں کہ ایک ہزار سال اکٹھا رہنے کے بعد ہم علیحدہ ہو گئے اور صرف علیحدہ ہی نہیں ہوئے بلکہ ایک دوسرے کے ویری ہو گئے۔ ہزار سال کی دوستی چند دنوں میں اتنی شدید نفرت میں بدل گئی کہ 1947 میں مذہب کے نام پر ایک دوسرے کے 10 لاکھ آدمیوں کو بے رحمی اور بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ نفرت کی آگ سے نہ تو معصوم بچے بچ سکے نہ کمزور بے سہارا خواتین اور نہ کمزور بیمار و لاغر عمر رسیدہ اشخاص۔

کیا انسانی رشتے اتنے کمزور و بے مایہ ہیں؟ کیا نفرت کی آگ انسانی اقدار سے بھی زیادہ طاقتور ہے؟

ہماری نئی نسل ماشاء اللہ بہت ذہین، سمجھدار، باعلم اور باشعور ہے۔ ان دلائل میں کافی وزن ہے جنہیں آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا۔ ہم چونکہ پچھلے 68 سال سے علیحدہ رہ رہے ہیں لہٰذا ہماری نئی نسل ہندو راج اور ہندو سامراج کے مزاج سے ناواقف ہے۔ اس لئے ان

میں سے کچھ لوگ انسان دوستی کے نام پر پاک و ہند کی تقسیم کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ہندو سامراج کی میٹھی باتوں کی تہ تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا ان سوالات کا جواب دینا ضروری ہے اور اس کے لئے کچھ سچے واقعات پیش خدمت ہیں۔ نتیجہ خود اخذ کر سکتے ہیں۔

یہ 1946 کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ جناب قائد اعظمؒ غالباً مدراس یونیورسٹی میں مسلمان طلبا سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ خطاب سے پہلے ہندو طلبا کا ایک وفد ان سے ملنے کے لئے آیا۔ اس وفد کے لیڈر نے قائد اعظم سے جذباتی انداز میں ایک لمبی تشریح کے بعد سخت الفاظ میں سوال کیا کہ ''آپ آخر بھارت ماتا کے ٹکڑے کرنے پر کیوں بضد ہیں''؟ قائد اعظم نے بڑے تحمل سے یہ ساری باتیں سنیں۔ جب طالب علم لیڈر جواب کے لئے خاموش ہوا تو قائد اعظمؒ نے بجائے لمبا جواب دینے کے اپنے سامنے رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھایا۔ دو تین گھونٹ پانی پیا اور پھر بقیہ گلاس اس طالب علم کی طرف بڑھا کر کہا لو اسے پی لو۔ لڑکا حقارت سے پیچھے ہٹ گیا کیونکہ ہندو مسلمانوں کو ناپاک سمجھتے ہیں اور ان کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی کوئی چیز کھانا حرام سمجھتے ہیں بلکہ اگر پکتا ہوا کھانا کوئی مسلمان دیکھ لے تو ان کے لئے وہ پکا ہوا کھانا بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طالبعلم نے نفرت سے جواب دیا کہ یہ ناپاک پانی میں کیوں پیوں؟ قائد اعظمؒ نے پھر پوچھا آخر یہ ناپاک کیسے ہو گیا؟ طالبعلم نے جواب دیا آپ نے اس گلاس میں سے پانی پیا ہے اور مسلمان کا جوٹھا پانی پینے کے لئے میرا مقدس مذہب اجازت نہیں دیتا۔ آپ نے وہی گلاس ایک ساتھ کھڑے ہوئے مسلمان طالبعلم کی طرف بڑھا کر اسے پینے کا حکم دیا جو وہ غٹاغٹ پی گیا۔ اب قائد اعظم نے ہندو وفد اور ہندو طالبعلم کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میرے عزیزو یہی وہ وجہ ہے کہ ہم مسلمان ایک علیحدہ وطن چاہتے ہیں۔ یہ عملی مثال بہت گہرے معانی رکھتی ہے۔ اس کے بعد ہندو وفد بغیر کسی مزید بحث کے واپس چلا گیا۔

اب جبکہ نریندر مودی کا ہندوستان اور نواز شریف کا پاکستان تعلقات کے نئے دور سے گزر رہے ہیں اور خدا کرے کہ نفرت کی آگ بجھ جائے لیکن امید کم ہے کیونکہ ہندومت بنیادی طور پر بنیاد پرست مذہب ہے جو دنیا کی باقی اقوام کو تو شاید برداشت کر لے لیکن مسلمانوں کو قطعی برداشت نہیں کرتا۔ حسب ذیل چند مثالیں میرے نقطہ نظر کی وضاحت کریں گی۔

1820ء میں جب گلاب سنگھ ڈوگرہ جموں کا جاگیردار بنا تو اس نے بہت جلد ارد گرد کی چھوٹی چھوٹی مسلمان جاگیروں پر بزور شمشیر قبضہ کر لیا اور 1840ء تک اس کی فتوحات گلگت بلتستان اور تبت تک وسیع ہو چکی تھیں۔ بدقسمتی سے وہ مسلمانوں کے خلاف سخت متعصب تھا اور مسلمانوں کو ختم کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ایک وقت اس نے متھرا میں ہندومت کے بڑے پروہت کو کشمیر آنے کی دعوت دی اور وہ جب آیا تو اس سے مسلمانوں کو زبردستی ہندومت میں تبدیل کرنے کا فتویٰ مانگا جس سے اس نے انکار کر دیا ورنہ آج کے پورے کشمیر میں مسلمان خال خال ہوتے۔ ہندو مذہب اور تعصب کی اس سے زیادہ کیا مثال ہو سکتی ہے کہ مسلمان کئی سو سال ہندوستان کے حکمران رہے لیکن کبھی ہندو کے مذہب میں دخل اندازی نہیں کی لیکن ہندوؤں کو جب بھی موقعہ ملا مسلمانوں کی جان، مال عزت اور مذہب پر کاری ضربیں لگائیں۔ گجرات کے فسادات میں مسلمانوں کا قتل عام ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔

ایک دفعہ مہاراجہ گلاب سنگھ مختلف علاقوں کے دورے پر نکلا۔ ایک جگہ اس نے دیکھا کہ کچھ قیدی ایک چھوٹی سی ندی پر پل بنا رہے تھے۔ ان قیدیوں میں ایک نوجوان شخص بڑی محنت اور تندہی سے کام کر رہا تھا۔

گلاب سنگھ اس کے کام سے بڑا خوش ہوا۔ اسے بلا کر شاباش دی اور پوچھا کہ تم کیا انعام چاہتے ہو؟ قیدی نے جواب دیا کہ جناب مجھے آزاد کر دیں۔ پوچھا تم کس جرم میں قید ہو؟ قیدی نے امید سے جواب دیا۔ مجھ سے ایک چھوٹی لڑکی کا قتل سرزد ہوا تھا۔ مزید پوچھا کہ تم ہندو ہو یا مسلمان؟ جواب ملا حضور مسلمان ہوں۔ قتل ہونے والی لڑکی ہندو تھی یا مسلمان؟ حضور شاید وہ ہندو تھی۔ گلاب سنگھ غصے سے اٹھا اپنے ساتھ کھڑے مصاحبین کو نزدیک بلا کر انگلی سے قیدی کے جسم پر اوپر سے نیچے اور پھر دائیں سے بائیں ایک کراس کا اشارہ کرکے حکم دیا کہ آرا منگوا کر اس طرح سے اس کے جسم کے چار ٹکڑے کیے جائیں۔ ایک ٹکڑا شمال کی طرف روانہ کیا جائے۔ ایک جنوب کی طرف۔ ایک مشرق کی طرف اور ایک مغرب کی طرف تاکہ میری رعایا کو پتہ چل جائے کہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں کسی ہندو لڑکی کا قتل اس طرح معاف نہیں کیا کرتا۔

انیسویں صدی کے وسط میں روس بڑی تیزی سے وسط ایشیا میں بڑھا۔ ایک کے بعد دوسری تمام بڑی ریاستیں فتح ہوتی چلی گئیں لہٰذا ہندی انگریز حکومت کو خطرہ پیدا ہوا کہ گلگت بلتستان اور کشمیر وغیرہ کا علاقہ بھی روسی ہوس کا نشانہ نہ بن جائے اس لیے روس کو روکنا ضروری ہوگا۔ اطلاعات یہ تھیں کہ میر آف ہنزہ روسیوں کے ساتھ ساز باز کر رہا تھا اور کچھ روسی افسران میر صاحب کی دعوت پر خفیہ طور پر ہنزہ اور اردگرد علاقوں کا دورہ بھی کر چکے تھے۔ انگریز حکومت نے روسی اثر اور روسی افواج کے اس تیزی سے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے کی غرض سے گلگت میں اپنا پولیٹیکل ایجنٹ رکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ شمالی علاقہ جات پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ علاقے کشمیر کے زیر اثر تھے لیکن مہاراجہ کشمیر صحیح طور پر کبھی بھی اپنی حکمرانی یہاں قائم نہ کرسکا۔ ہر وقت کہیں نہ کہیں شورش رہا کرتی رہتی تھی۔ 1888ء میں انگریز کرنل الگرنن ڈیورینڈ شمالی علاقہ جات کا پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا بعد میں اس نے اپنے تجربات MAKING OF A FRONTIER کے نام سے قلمبند کیے اور یہ کتاب آجکل نایاب کتب میں شمار ہوتی ہے۔

کرنل ڈیورینڈ لکھتا ہے کہ جب وہ گلگت کے لیے روانہ ہوا تو اس نے ضروری سمجھا کہ جانے سے پہلے سری نگر میں مقرر برٹش پولیٹیکل ایجنٹ اور مہاراجہ کشمیر سے راہنمائی حاصل کی جائے۔ لہٰذا وہ اس مقصد کے لیے سری نگر پہنچا تو مہاراجہ نے اس کی سہولت کے لیے چند سپاہی اور کچھ مزدور ساتھ کر دیے۔ سری نگر سے روانگی کے بعد پہلا پڑاؤ بانڈی پورہ کے نزدیک تھا۔ یہ صاحب خود تو گھوڑے پر وہاں پہنچ گئے لیکن خیمہ وغیرہ اور بقیہ سامان تاحال نہیں پہنچے تھے لہٰذا انتظار کرنا پڑا۔ وہ لکھتا ہے کہ کچھ دیر بعد کچھ مزدور سر پر سامان اٹھائے ہوئے وہاں پہنچے لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ تقریباً ڈیڑھ من سے زیادہ وزن کا خیمہ ایک ہی شخص نے اٹھا رکھا تھا اور ڈوگرہ سپاہی اسے ڈنڈے مارتے ہوئے لا رہے تھے۔ یہ شخص پسینے میں شرابور بوجھ اٹھا اٹھا کر تقریباً نیم بے ہوش ہو چکا تھا۔ اتنا زیادہ وزن ایک آدمی کے سر پر لاد کر کئی میل پیدل چلانا اور وہ بھی ڈنڈے کے زور پر سراسر غیر انسانی فعل اور ظلم تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ تمام مزدور مسلمان ہیں اور تمام سپاہی ڈوگرے اور یہ لوگ مسلمانوں سے اسی طرح جبری مشقت لیتے ہیں۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جب میں ڈوگرہ سپاہیوں کو ان مزدوروں کے لیے مزدوری دینے لگا تو اس شخص نے رو کر کہا کہ حضور یہ مزدوری ہمیں تو نہیں ملے گی لہٰذا اس نے مزدوری خود ان مسلمانوں کو ادا کی۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ رقم تو یہ لوگ ان سے چھین لیں گے لہٰذا اس نے ڈوگرہ سپاہیوں کو سختی سے منع کیا کہ رقم نہ چھینی جائے ورنہ وہ ان کے خلاف

مہاراجہ سے شکایت کرے گا۔ لیکن پھر بھی اسے یقین نہ تھا کہ یہ رقم مزدوروں کے پاس رہنے دیں گے یا نہیں کیونکہ مسلمان مزدوروں کو مزدوری دینے کا ڈوگرہ حکومت کے لئے رواج ہی نہ تھا۔ جبری مشقت بغیر کسی اجرت کے وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں سے عیاشی بھی اپنا فرض۔ انہیں کھیتوں میں کام کرتی یا جانور چراتی کسی بھی مسلمان عورت کو پکڑنے کے لئے کسی قسم کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ اکثر جوان عورتیں ڈوگرہ سپاہیوں کو دیکھ کر چھپ جاتی تھیں۔ بعض اوقات ڈوگرہ سپاہی نوجوان لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر اپنے کیمپ میں لے جاتے تھے۔ اس مثال سے مسلمانوں کی زبوں حالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دوسرا واقعہ جس کا کرنل ڈیورنڈ نے خصوصی ذکر کیا ہے وہ اسے چند میل گلگت سے پہلے پیش آیا۔ وہ گھوڑے پر جا رہا تھا کہ اچانک 70 مزدور روتے ہوئے اور دہائیاں دیتے ہوئے گھوڑے کے سامنے لیٹ گئے۔ جب اٹھا کر ایسا کرنے کا مقصد پوچھا گیا تو پتہ چلا کہ یہ مسلمان مزدور ہیں جنہیں چند ماہ پہلے بلتستان سے ڈوگرہ سپاہیوں نے جبری مشقت کے لئے زبردستی پکڑا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ گلگت میں مقیم ڈوگرہ فوج کے لئے بار برداری کا کام کریں۔ چونکہ اس وقت سڑکیں نہ تھیں اور نہ ہی مال برداری کا کوئی دوسرا ذریعہ لہٰذا سری نگر سے ڈوگرہ سپاہیوں کے لئے جتنا راشن اور ایمونیشن وغیرہ بھیجا جاتا تھا یہ لوگ استور سے اپنی پیٹھ پر لاد کر گلگت لاتے تھے جو کہ 80 میل کا فاصلہ ہے اور سب پہاڑی چڑھائیاں اور دریا کے ساتھ ساتھ سخت دشوار گزار راستہ۔ انہیں کھانے کے لئے ایک وقت گلے سڑے اناج کی روٹی ملتی تھی اور پینے کے لئے دریائے سندھ کا گدلا پانی۔ لہٰذا یہ لوگ ہر وقت بخار، پیچش اور ہیضے کا شکار رہتے تھے لیکن ڈوگرہ سپاہی ان کی پیٹھ پر بوجھ لاد کر ڈنڈوں سے ہانک کر لاتے تھے۔ شروع میں یہ سو لوگ تھے جن میں سے تیس کے قریب پیچش اور ہیضے سے مر گئے۔ اب صرف ستر رہ گئے تھے جن کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ بھوک اور بیماری سے بری حالت تھی۔ ایک مزدور نے پیٹھ پر سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ اس کی پیٹھ پر بوجھ اٹھانے کی وجہ سے ایک بڑا گہرا زخم تھا لیکن ڈوگرہ سپاہیوں کو پھر بھی رحم نہ آیا۔ وہ بوجھ اٹھانے پر مجبور تھا۔ ان لوگوں کے ساتھ بالکل غیر انسانی سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ رو رو کر اور ہاتھ جوڑ کر آزادی کی بھیک مانگ رہے تھے لیکن کرنل ڈیورنڈ افسوس سے لکھتا ہے کہ وہ ان کے لئے کچھ نہ کر سکا۔

یہ دو مثالیں تو وہ ہیں جو اسے پہلے ہی سفر میں پیش آئیں۔ ویسے یہ تو وہاں روزمرہ کا معمول تھا۔ مسلمان جانوروں سے بھی بدتر تھے۔ اسی لئے وہ انگریزوں سے کسی حد تک رحم اور انصاف کے طلبگار تھے اور یہ حقیقت ہے کہ جہاں تک بھی ممکن ہو سکا انگریزوں نے ان لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کیا اور اپنے نظام حکومت کی بنیاد انصاف اور انسان دوستی پر رکھی۔ لوگوں کو ڈوگروں کے ظلم وستم سے نجات ملی۔

کہا جاتا ہے کہ ہندو خدمت گزار نوکر تو ثابت ہو سکتا ہے لیکن بہت ظالم اور خطرناک حکمران ہے۔ تاریخ نے ہندوؤں کو جب بھی حکمرانی کا موقعہ دیا تو مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ دیئے گئے۔ شاید یہی وہ حالات تھے کہ مسلمان علیحدہ وطن کے لئے مجبور ہوئے اور خون کا دریا عبور کر کے یہاں تک پہنچے۔ لہٰذا اس مقدس وطن کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔

یاد رکھیں اجتماعی غلطیاں تاریخ کبھی معاف نہیں کرتی۔

خونِ دل دے کے نکھاریں گے رخِ برگِ گلاب
ہم نے گلشن کے تحفظ کی قسم کھائی ہے

○✱○

اس طرح مال حرام اور خلق خدا کی بددعاؤں نے حاجی خادم حسین کے خاندان کو عبرت کی ایک دردناک مثال بنا دیا۔

عبرت کا مقام

مکافات عمل

☆ ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
0323-4546115

اذیت پسند

مہر سراج میرا دور کا رشتے دار تھا۔ بڑا عجیب و غریب آدمی تھا۔ چٹا ان پڑھ تھا لیکن منفی ذہانت کا خاصا بڑا حصہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ اذیت پسندی اسے محبوب تھی اور دوسرے کو دکھ دے کر، تکلیف میں مبتلا کر کے گویا اسے راحت ملتی تھی۔ میں نے یہ منظر بچشم سر دیکھا کہ نذیر نائی اس کی داڑھی مونڈھنے کی تیاری کر رہا تھا اور جیسا کہ اس زمانے میں دیہات کا کلچر تھا، نائی کسانوں کی شیو بنانے میں صابن یا کریم کا استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ خالی پانی سے چہرے کے بالوں کو گیلا اور نرم کر کے استرے سے شیو بنا دیتے تھے...... چنانچہ نذیر نائی روایت اور عادت کے مطابق بار بار پانی کی پیالی میں انگلیاں ڈبوتا اور مہر سراج کے چہرے کا مساج کرنے لگتا۔

یکا یک نذیر نائی کی چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ بے طرح سے تڑپ رہا تھا اور مدد کے لئے شور مچا رہا تھا۔ سراج نے اس کی انگلیاں دانتوں میں مضبوطی سے دبا لی تھیں اور کسی طرح چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔

پہلے تو لوگ اسے مذاق سمجھے اور قہقہے لگانے لگے لیکن جب کئی منٹ گزر گئے اور سراج نائی کا ہاتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو لوگوں نے آگے بڑھ کر زبردستی بے چارے نذیر کا ہاتھ آزاد کرایا اور ایک شخص نے سراج کے سر پر دو تین دھولیں جمائی تھیں، تب اس نے منہ کھولا تھا اور نذیر کی انگلیاں آزاد ہوئی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے مہر سراج پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔

دوسرے واقعے کا بڑا کردار بھی نذیر نائی ہی تھا۔ ہمارے علاقے میں تین گاؤں بالکل قریب قریب ہیں، تقریباً ایک ایک فرلانگ کے فاصلے پر۔ نذیر کا گاؤں آخری اور تیسرا تھا۔ وہ ایک روز شام سے پہلے اپنے کام

حاجی خادم حسین بہت ذہین اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے علاقے میں گوجر برادری کو منظم کیا، خود ان کا سربراہ بن گیا اور مطالبہ کیا کہ مجھے گوجروں کے سب گھرانے ایک ایک بچھیا فراہم کریں۔ اس طرح وہ دیکھتے ہی دیکھتے گائیوں کے بہت بڑے ریوڑ کا مالک بن گیا۔ یہ ریوڑ بھی اپنے مالک کی طرح منہ زور تھا، اور لوگوں کے کھیتوں میں تباہی پھیرتا رہتا۔ اگر کوئی غریب اعتراض کرتا تو حاجی اور اس کے بیٹے اور ملازم اس کی خوب پٹائی کرتے اور وہ خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ کرسکتا۔

ٹریکٹر ٹرالی کے بعد حاجی نے ٹرکوں کی بار برداری کا کاروبار شروع کیا اور اس میں بھی دھونس اور غنڈہ گردی کے بل پر علاقے میں ٹرکوں کے کاروبار پر چھا گیا اور سب متعلقہ ٹرک مالکان دبک کر الگ ہوگئے۔

حاجی موصوف مزید آگے بڑھا اور اس نے بسوں کا پورا ایک بیڑہ تیار کرلیا۔ یہ بسیں پسرور، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کی طرف چلتی تھیں اور اُن کے سامنے باقی سارے بس مالکان سہمے سکڑے رہتے تھے اور پولیس ان کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی تھی۔

اس زمانے میں حاجی خادم حسین علاقے کا سب سے طاقتور آدمی تھا۔ وہ ایک مضبوط قبضہ گروپ کا سرغنہ بن گیا تھا۔ کمزور لوگوں کی جائیدادیں ناجائز ہتھکنڈوں سے ہتھیانا اس کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔ اس طرح اس نے کروڑوں کی جائیداد بنالی اور قصبے کی میونسپل کمیٹی کا پہلے کونسلر اور پھر وائس چیئرمین بن گیا۔ اب وہ اس قدر منہ زور ہوگیا کہ مخالفوں کو قتل کرانے سے بھی دریغ نہ کرتا، چونکہ پولیس سے اُس کے مراسم خاصے مضبوط تھے، اس لئے وہ بڑے سے بڑا جرم بھی کرتا تو پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔ چنانچہ وہ چرس، ہیروئن، جوئے اور شراب کا کاروبار بھی اعلانیہ کرنے لگا اور کوئی اُسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

ایک غریب آدمی کو اس نے دن دیہاڑے بے رحمی سے قتل کردیا لیکن چونکہ کسی نے حاجی کے خلاف گواہی دینے کی جرأت نہ کی تھی، اس لئے وہ چھ ماہ بعد ہی رہا ہوکر گھر آ گیا اور اس کی چیرہ دستیاں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئیں لیکن جیسا کہ اللہ کا دستور ہے، آخرکار وہ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آ گیا۔ اس کے چھ بیٹے تھے، ایک ٹریفک کے حادثے میں مرگیا...... اور چونکہ اس خاندان میں شراب اور بدکاری کا مکمل دخل عام ہوگیا تھا، اس لئے حاجی کے بیٹوں میں مختلف حوالوں سے شدید اختلافات پیدا ہوگئے جس کے نتیجے میں ایک بھائی نے ایک ہی ہلے میں اپنے تین بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا...... قاتل گرفتار ہوکر جیل چلا گیا۔ اس طرح اس کی نظروں کے عین سامنے چھ میں سے پانچ بیٹے دردناک حشر سے دوچار ہوئے اور اس کا سارا غرور بُری طرح خاک میں مل گیا۔

مخالفوں نے جب دیکھا کہ حاجی حالات کی شدید گرفت میں ہے، تو وہ شیر ہوگئے اور ایک دن انہوں نے اس پر سامنے سے فائر کھول دیا گولی اس کے سر کی کھال کو کاٹتی ہوئی نکل گئی، وہ مہلک وار سے بچ گیا، مگر بیٹوں کی ہلاکت کے بعد وہ اس حملے سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اُسے فالج ہوگیا۔ ہلنے جلنے سے معذور ہوکر بستر پر پڑ گیا اور کئی سال تک شدید اذیت میں مبتلا رہا۔ اسی حالت میں اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اور وہ انتہائی بے چارگی اور ذلت کی موت مرگیا۔ موت سے پہلے مقدمات اور ظلم و ستم کی نحوست نے اس کی ساری جائیداد ختم کردی۔ بسیں بک گئیں، اڈے ختم ہوگئے اور اس کا خاندان قلاش اور کنگال ہوگیا۔

اس طرح مال حرام اور خلق خدا کی بددعاؤں نے حاجی خادم حسین کے خاندان کو عبرت کی ایک دردناک مثال بنادیا۔ (مصنف کی کتاب "مکافاتِ عمل" سے ماخوذ)

◆✻◆

تلخیص

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کی اندرونی کہانی

صحرائی جاسوس اور صحرائی طوفان (2)

موساد کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا آغاز ہو گیا

قسط: 16 ☆ ----------------------- 0300-4154083 ---------------------- میاں محمد ابراہیم طاہر

[illegible] بیٹھے گا یا نہیں یہ سوال موساد [illegible] پاس اب بھی کافی مقدار میں [illegible] جراثیمی ہتھیار اور کیمیاوی گیس جو ہر آدمی، عورت اور بچے کو پورے اسرائیل میں ختم کر سکتی تھی بلکہ دنیا کے ایک بڑے حصے کی آبادی کو بھی نیست و نابود کرنے کی [illegible] موجود تھی۔

اب شیطانی، [illegible] خفیہ جنس ایجنسیوں کے سربراہوں اور سیاستدانوں کے سامنے سوال یہ تھا کہ اس خفیہ اطلاع کو منکشف کیا جائے یا نہیں۔ اس اطلاع کو عام کرنے سے اسرائیلی پبلک میں خوف و ہراس اور سراسیمگی کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا اور اس کے بڑے بھیانک منفی نتائج مرتب ہو سکتے تھے۔ ملک کی سیاحت انڈسٹری کو مکمل طور پر ختم کر کے رکھ دیتا تھا۔ اسرائیلی اکانومی تباہی کے دہانے پر تھی اور ملک میں بیرونی انویسٹمنٹ بہت سست تھی۔ لہٰذا اس چیز کا انکشاف کرنا کہ اسرائیل ابھی بھی مہلک اور ہلاکت خیز ہتھیاروں کی زد میں تھا، کے بعد نہ تو سیاح ملک میں آئیں گے اور نہ پیسہ۔

گلف وار کے خاتمے اور اتحادیوں کے الگ ہو جانے کے بعد وہ عرب ممالک جو مجبوری کے تحت جنگ میں شامل ہوئے تھے لیکن جنگ کے دوران بھی ان کا رویہ سرد مہری کا ہی رہا تھا۔ کیونکہ ان کو پسند نہیں تھا کہ ان کے ایک عرب ہمسائے کے خلاف جنگ چھیڑی جائے۔ عراقیوں کے لئے ان کی ہمدردی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اتحادیوں کی اندھا دھند بمباری نے عراق جو بے تحاشا تباہی مچائی تھی اور معصوم اور بے گناہ شہریوں کے مصائب میں جو اضافہ ہوا تھا، اس سے پورے مڈل ایسٹ کے عوام کے دلوں میں اسرائیل کے خلاف دشمنی اور نفرت کے جذبات اپنی انتہا تک پہنچا دیئے تھے۔ ایسے حالات میں اسرائیل اگر یہ انکشاف کرتا کہ عراق کے پاس جنگ کے بعد میں بھی ہلاکت خیز کیمیکل اور بیولاجیکل ہتھیار بڑی مقدار میں محفوظ پڑے ہیں تو اس سے عربوں سے ہمدردی رکھنے والے غربی ممالک میں یہ پیغام جاتا تھا کہ اس بہانے سے اسرائیل ایک دفعہ پھر امریکہ اور برطانیہ کو عراق پر نیا حملہ کرنے پر اکسا رہا تھا۔

صدام کے اسلحہ خانے کے بارے میں پبلک کو آگاہ کرنے کا سوال اس لئے بھی اہم تھا کہ اس سے ان خفیہ مذاکرات پر اثر پڑ سکتا تھا جو مڈل ایسٹ میں امن قائم کرنے کے بارے میں پی ایل او اور اسرائیل کے مابین چل رہے تھے۔ 1992ء تک یہ مذاکرات ناروے میں ہو رہے تھے اور احسن طریقے سے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان مذاکرات کے نتیجہ خیز ہونے میں تقریباً ایک سال لگا، جب اکتوبر 1993ء میں یاسر عرفات نے اسرائیلی وزیراعظم یزہاک رابن سے وائٹ ہاؤس کے لان میں صدر امریکی کلنٹن کی مسکراہٹوں کے سائے میں ہاتھ ملایا۔ دونوں رہنماؤں کے خیال میں یہ ایک شاندار سیاسی کامیابی تھی۔

تاہم موساد میں ہر شخص کو یہ امید نہ تھی کہ طے کردہ فارمولا امن کے لئے زمین یعنی فلسطینیوں کے وطن اور اسرائیلیوں کے لئے امن، کامیابی سے ہمکنار ہو سکے گا اور مزید تنازعہ نہیں ہوگی۔ اسلامی بنیاد پرستی تیزی سے پھیل رہی تھی اور اسرائیل کے ہمسائے اردن، مصر اور شام، ایرانی انتہا پسند قوتوں کے تھپیڑوں کی زد میں تھے۔ تہران ملاؤں کے نزدیک اسرائیل ایک ناجائز مملکت تھی۔ موساد کے اندر اور بہت ہی اسرائیلی پبلک کے اندر بھی یہ خیال پایا جاتا تھا کہ پی ایل او کے ساتھ دیرپا امن کا فارمولا، کامیابی سے ہمکنار ہونا ممکن نہیں اور یہ ایک غیر حقیقی خواب تھا۔ یہودی اسرائیل کو عربوں کے ساتھ مفاہمت سے رہنے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ عربوں کے مذہب اور کلچر کو وہ اپنے مقابلے میں گھٹیا اور تاریخی طور پر کمتر سمجھتے تھے۔ وہ اوسلو معاہدے کو اپنی ارض موعود کی

کاری نہیں کھیلتے تھے نہ ہی وہ اس بات کے قائل تھے کہ دونوں قومیں اکٹھی رہ سکتی تھیں، خوشی اور ایک دوسرے کی عزت و وقار کے ساتھ۔

شبتائی شاوت نے عراقی ہتھیاروں کے بارے میں کوئی انکشاف کرنے سے قبل ان سب پہلوؤں پر غور کیا تھا۔ آخر میں اس نے فیصلہ کیا کہ اس معاملے کو خفیہ ہی رہنے دیا جائے تاکہ واشنگٹن معاہدے سے اسرائیل کے باہر امن وامان کے بارے میں جو فضا بن رہی تھی، وہ متاثر نہ ہو۔ اگر معاہدے کے مطابق امن وامان کی صورت حال میں بہتری نہ آئی تو عراق کے زہریلے جراثیمی ہتھیاروں کے بارے میں کسی وقت بھی عام پبلک کی آگاہی کے لئے انکشاف کیا جا سکتا تھا۔ بغداد اور ظالم صدام کا کوئی ایجنٹ نیویارک سب وے سٹیشن پر انتھریکس کا کنستر رکھ سکتا تھا، یا کوئی دہشت گرد کسی بوئنگ 747 جہاز کے ایئرکنڈیشننگ سسٹم میں ایبولا وائرس داخل کر سکتا تھا تاکہ جہاز کا ہر مسافر جراثیمی ہتھیاروں کا ٹائم بم بن کر ہزاروں لوگوں کو متاثر کر سکے قبل اس کے سچائی سامنے آئے۔ موساد کے لئے یہ تمام امکانات اس کے نفسیاتی جنگ کے ماہرین کے لئے پروپیگنڈے کے زور پر عراق کے خلاف مخالفانہ فضا پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔

دو دوسرے واقعات جنہیں موساد نے چھپائے رکھا تھا، امریکیوں کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بن سکتے تھے۔

دسمبر 1988 کی ایک سہ پہر کو پان امریکن ایئرویز کی فلائٹ نمبر 103 لندن سے نیویارک جاتے ہوئے سکاٹ لینڈ میں لاکربی (Lockerbie) کے اوپر دھماکے سے پھٹ گئی تھی۔ چند ہی گھنٹوں کے اندر لیپ کے کارندے اپنے رابطہ کار اور اسرائیل کے ہمدرد صحافیوں کو فون کر رہے تھے کہ وہ یہ خبر شائع کریں کہ ناقابل تردید ثبوت موجود ہیں کہ جہاز کی اس تباہی میں لیبیا کا ہاتھ تھا کیونکہ ہماری انٹیلی جنس کی اطلاع کے مطابق جمہوریہ اس جرم کی سزا کا مستحق تھا (مصنف کتاب ہذا کو بھی لیپ کی طرف سے اسی نوعیت کی فون کال اس المناک حادثے کے چند گھنٹے بعد موصول ہوئی تھی)۔ فوراً ہی مغربی ممالک نے قذافی حکومت کے خلاف پابندیاں عائد کر دیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے دو لیبیائی باشندوں پر فرد جرم عائد کر دی اور انہیں پان امریکن جہاز کی تباہی کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ قذافی نے دونوں افراد کو مقدمہ چلائے جانے کے لئے امریکہ کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔

لیپ نے بعد ازاں شام اور ایران کو لاکربی سانحے میں ملوث کرنے کی کوشش کی۔ دمشق حکومت کے خلاف اس الزام کے سوا لیپ کوئی الزام سامنے نہ لا سکی کہ وہ ہمیشہ سے دہشت گردی کی پشت پناہ تھی۔ ایران پر خصوصی طور پر یہ الزام لگایا گیا کہ پان ایم 103 کو ایران نے تباہ کیا تھا اس ایرانی جہاز کے بدلے میں تباہ کیا جسے امریکن بحری جہاز یو ایس ایس ونسینس (USS Vincennes) نے 3 جولائی 1988ء کو مار گرایا تھا جس میں 290 مسافر جاں بحق ہو گئے تھے۔ یہ مسافر بردار طیارہ خلیج فارس میں گرا تھا۔ یہ امریکہ کی ایک فاش غلطی تھی جس پر اسے معافی مانگنی پڑی تھی۔

پھر لیپ نے اس حادثے میں فلسطینی محاذ آزادی کو ملوث کرنے کی کوشش کی۔ اسرائیل کے ہمدرد صحافیوں نے جو لیپ کی پھیلائی ہوئی کہانیوں کو وسیع پیمانے پر چھاپ رہے تھے۔ کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کی کہ صرف لیبیا کو ہی کیوں جہاز کی تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ پھر اس نے شام اور ایران سے مدد لینے کی بجائے ایک غیر معروف فلسطینی گروپ کو کیوں منتخب کیا؟

ایک برطانوی انٹیلی جنس ذریعہ کے مطابق لاکربی سانحے میں لیپ کا اپنا ایک کردار تھا۔ دنیا کو یاد دہانی

کرانے کا ایک اچھا موقع تھا کہ لیبیا دہشت گردوں کا نیٹ ورک موجود تھا جس کی خود لیبیا سرپرستی کر رہی تھی۔ لاکربی کے لئے اتنے زوردار پروپیگنڈے کی ضرورت نہ تھی۔ بہت سے ناموں کو اس میں ملوث قرار دینے کا نتیجہ مثبت نہ تھا۔ ہمیں پتہ تھا کہ صرف لیبیا اس کا ذمہ دار تھا۔ پان ایم 103 حادثہ ایسا نہ تھا جسے آسانی سے بھلا دیا جاتا''۔

جہاز کی تباہی کا واقعہ ایسے وقت میں پیش آیا تھا جبکہ جارج بش امریکہ کا صدر منتخب ہو چکا تھا اور اس کی ٹیم مڈل ایسٹ کے معاملات پر غور و فکر کر رہی اور حالات کا جائزہ لے رہی تھی۔ لہٰذا بش اول آفس میں داخل ہوتے ہی اس معاملے پر سرگرم عمل ہو سکتا تھا۔

بش، امریکن انٹیلی جنس ایجنسی سی آئی اے کا 77-1976ء میں ڈائریکٹر رہ چکا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب امریکہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) ہنری کسنجر نے امریکی پالیسی کو اسرائیل کے حق میں تبدیل کر دیا تھا۔ اگرچہ بش نے صدر ریگن کی اسرائیل سے ہمدردانہ پالیسی کو برقرار رکھا لیکن اپنے سی آئی اے کے دور میں وہ جان چکا تھا کہ ریگن کی پالیسی اسرائیل کے بارے میں ضرورت سے زیادہ نرمی پر مشتمل تھی۔ بش اپنے صدر کا عہدہ سنبھالنے کے انتظار میں تھا اور اسے اس بات کی یاددہانی کی ضرورت نہ تھی کہ کس طرح 1986ء میں اردن کو اسلحے کی فروخت کا معاہدہ جس کی مالیت 109 بلین ڈالر تھی۔ واشنگٹن کی یہودی لابی اور کانگریس کے یہودی ارکان کے دباؤ پر منسوخ کرنا پڑا تھا۔ بش نے اپنی آئندہ بننے والی حکومتی ٹیم کو بتا دیا تھا کہ وہ یہ بات برداشت نہیں کرے گا کہ کسی لابی کے دباؤ پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ خداترس امریکن کس سے تجارت کریں اور کس سے نہ کریں۔ یہی رویہ پان ایم 103 فلائٹ کی تباہی کا باعث بنا تھا۔

دسمبر 1988ء کی اس رات کو لندن سے روانگی کے وقت جہاز پر امریکن انٹیلی جنس ایجنسی کے آٹھ ارکان بھی سوار تھے جو مشرق وسطیٰ میں اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر واپس جا رہے تھے۔ ان میں چار سی آئی اے کے فیلڈ افسر تھے جن کی قیادت میتھیو گینن (Mathew Gannono) کے ہاتھ میں تھی۔ جہاز کے مسافروں میں امریکن فوج کے میجر چارلس میکی اور اس اغوا کنندگان کے خلاف کارروائی کرنے والی مختصر ماہرین کی ٹیم کے ممبران شامل تھے۔ وہ مڈل ایسٹ میں اس لئے مقیم تھے کہ بیروت میں ابھی تک یرغمال بنائے گئے مغربی شہریوں کی رہائی کے امکانات کا جائزہ لے سکیں۔ اگرچہ لاکربی حادثے کی تحقیقات کی ذمہ داری سکاٹ لینڈ کی تھی کیونکہ سانحہ اس کی حدود میں رونما ہوا تھا لیکن سی آئی اے کے ایجنٹ بھی وہاں موجود رہتے تھے۔ اس دوران حیرت انگیز طور پر میکی کا سوٹ کیس بالکل صحیح سالم حالت میں مل گیا۔ یہ سوٹ کیس مختصر وقت کے لئے وہاں سے غائب کر دیا گیا۔ یقینی طور پر یہ ایک سی آئی اے افسر کا کام تھا لیکن اس کی شناخت کبھی بھی سامنے نہیں آ سکی۔ بعدازاں یہ سوٹ کیس سکاٹ کی تفتیشی ٹیم کے حوالے کر دیا گیا۔ جنہوں نے اپنی رپورٹ میں اسے بالکل خالی لکھا۔

کسی نے بھی یہ سوال نہیں اٹھایا کہ میکی کا ساز و سامان کدھر گیا، یا وہ خالی سوٹ کیس کے ساتھ کیوں سفر کر رہا تھا لیکن اس وقت کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ شاید سی آئی اے افسر نے سوٹ کیس سے وہ ڈاٹا نکال لیا ہوگا جس سے یہ پتہ چل سکتا کہ پین ایم 103 کو کیوں تباہ کیا گیا۔ گینن کے سامان کا کہیں ذکر تک نہیں کیا گیا جس سے اس شبہے کو تقویت ملی کہ دراصل بم اس کے سوٹ کیس میں موجود تھا۔ کبھی اس بات کی وضاحت سامنے نہیں آئی کہ کیسے اور کیوں ایک سی آئی اے افسر سوٹ کیس میں بم

کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔

تحقیقاتی ٹی وی چینل بی بی ایس نے بعدازاں اپنے پروگرام فرنٹ لائن میں دعویٰ کیا کہ اس نے اس سانحہ کا معمہ حل کرلیا ہے۔ پین ایم فلائٹ 103 نے اپنے سفر کا آغاز جرمنی کے ائرپورٹ فرینکفرٹ سے کیا تھا، جہاں سے امریکہ جانے والے مسافر جو مڈل ایسٹ سے آئے تھے، اس فلائٹ 103 پر ٹرانسفر کیے گئے تھے۔ ان میں کیپٹن اور اس کی سی آئی اے کی ٹیم شامل تھی۔ یہ لوگ مڈل ایسٹ سے ائر مالٹا کی فلائٹ سے یہاں پہنچے تھے۔ ان کا ساز وسامان بھی اسی طرح کا تھا۔ جیسا فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر کام کرنے والے ورکروں کے ہاتھوں سے ہر روز گزرتا تھا۔ ان ورکروں میں سے ایک دہشت گردوں کی پے لسٹ (Pay List) پر تھا۔ ائرپورٹ پر سامان سٹور کرنے والی کسی جگہ اس دہشت گرد نے ایک سوٹ کیس چھپا رکھا تھا جس میں بم موجود تھا۔ اس کو ہدایات یہ تھیں کہ وہ آنے والی فلائٹ سے بم والے سوٹ کیس سے ملتا جلتا سوٹ کیس تلاش کر کے اسے بم والے سوٹ کیس سے بدل کر پین ایم 103 کے سامان کے ہینگر میں پہنچا دے۔ یہ تصوری سمجھ میں آنے والی تھی لیکن ان بہت سی قیاس آرائیوں اور کہانیوں میں سے ایک، جو پھیلائی جارہی تھیں۔

ائرلائن کی انشورنس کمپنی نے اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ جہاز دہشت گردی سے تباہ ہوا تھا اس لئے وہ کلیم کی ادائیگی کی ذمہ دار نہ تھی، نے ایک پرائیویٹ تفتیشی فرم انٹرفور (Interfor) کی خدمات حاصل کرلیں۔ یہ کمپنی ایک اسرائیلی یووال ایبب نامی شخص نے 1979ء میں اپنی امریکہ ہجرت کے ایک سال بعد قائم کی تھی۔ ایبب کا دعویٰ تھا کہ وہ موساد کا سابقہ ڈیسک آفیسر تھا۔ اس دعوے کو موساد نے تسلیم نہیں کیا تھا۔ تاہم ایبب نے انشورنس کمپنی کو یقین دلایا کہ اس کے پاس ایسے ذرائع ہیں جن کی مدد سے وہ اصلیت سامنے لے آئے گا۔

جب ایبب کی رپورٹ انشورنس کمپنی کے سامنے آئی تو اس کے کارپرداز سر پیٹ کر رہ گئے۔ ایبب نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ''جہاز کو تباہ کرنے کی پلاننگ سی آئی اے کے ایک بدمعاش گروپ نے کی تھی، جو جرمنی میں تعینات تھا اور جو مڈل ایسٹ سے فرینکفرٹ کے راستے منشیات کی امریکہ کو سمگلنگ کو تحفظ فراہم کرتا تھا۔ سی آئی اے اس کی روک تھام کے لئے کچھ نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ سمگلر بھی یرغمالیوں کے بدلے اسلحہ کے مذاکرات میں ایران کو اسلحہ پہنچانے میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ منشیات کی سمگلنگ کا طریق کار بڑا سادہ تھا۔ آنے والی فلائٹ کے سامان میں سے ایک شخص ملتا جلتا سوٹ کیس نکالتا تھا اور اگلی فلائٹ میں سامان چڑھانے پر مامور شخص منشیات سے بھرا ہوا ملتا جلتا سوٹ کیس سامان میں رکھ دیتا تھا۔ آخری رات کو ایک شامی دہشت گرد نے جسے یہ معلوم تھا کہ منشیات کی سمگلنگ کا معمول کیا ہے، منشیات کی جگہ وہ سوٹ کیس سامان میں رکھ دیا جس میں بم موجود تھا۔ اس کا مقصد ان سی آئی اے کے اہلکاروں کو قتل کرنا تھا جن کے بارے میں شام کو معلوم ہوگیا تھا کہ اسی فلائٹ میں سوار ہوں گے''۔

ایبب کا دعویٰ تھا کہ میکی کو سی آئی اے کی اس بدمعاش ٹیم کے بارے میں معلوم ہوگیا تھا جو کوڈ نام کوریا (Corea) کے نام سے کام کرتی تھی اور اس کے ممبروں کے کچھ ایسی پُراسرار شخصیات سے بھی رابطے تھے جنہیں معلوم تھا کہ میکی کے بھی دنیائے جاسوسی سے رابطے تھے۔ منظر القصار، یورپ میں اسلحہ کے بیوپاری کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وہ کرنل اولیور نارتھ (Col: OliverNorth) کو بھی ہتھیار سپلائی کرتا رہا تھا جو وہ آگے نکاراگوا کے کونٹراز کو 86-1985ء میں پہنچایا کرتا

تھا۔ القصار کے ابوندال کی تنظیم سے بھی رابطے تھے اور اسی طرح اس کے خاندان کے بھی مشکوک لوگوں سے تعلقات تھے۔ شام کی انٹیلی جنس تنظیم کا سربراہ علی عیسیٰ دوبا اس کا سالا تھا اور القصار کو کوریا میں ڈرگ سمگلنگ کے آپریشن کے لئے ایک اچھا حصہ دار مل گیا تھا۔ سمگلنگ کا یہ سلسلہ پین ایم 103 کی تباہی سے قبل کئی ماہ کے جاری تھا۔ رپورٹ میں مزید دعویٰ کیا گیا تھا اس ''بدمعاش ٹیم'' کا پتہ میکی کو اس وقت چلا تھا جب وہ خود انڈر ورلڈ کے کسی گروپ کی تلاش میں مڈل ایسٹ میں سرگرداں تھا تاکہ کسی نہ کسی طرح بیروت میں یرغمال بنائے گئے مغربی ممالک کے باشندوں کو رہا کرا سکے۔ ایب نے اپنی رپورٹ میں مزید لکھا: ''میکی نے فیصلہ کیا تھا کہ بدمعاش انٹیلی جنس ٹیم کے خلاف مکمل ثبوت اور القصار سے رابطے بارے معلومات لے کر امریکہ لوٹے گا''۔

1994ء میں جوئیل بینرمین (Joel Bainerman) جس نے اسرائیل انٹیلی جنس ... شائع کی تھی اور جس کے تجزیے بعدازاں مشہور اخبارات ''وال سٹریٹ جرنل'' ''کرسچین سائنس مونیٹر'' اور برطانوی اخبار ''فنانشل ٹائمز'' میں شائع ہو جائے، لکھا تھا: ''فلائٹ 103 کی روانگی سے 24 گھنٹے قبل موساد نے جرمنی کی خفیہ ایجنسی بی کے اے کو اشارتاً بتایا تھا کہ اس فلائٹ پر بم لگایا جا سکتا تھا۔ بی کے اے نے یہ اطلاع کوریا سی آئی اے ٹیم کو جو فرینکفرٹ کے باہر کام کر رہی تھی، پہنچا دی۔ انہوں نے کہا وہ اس کا بندوبست کر لیں گے''۔

پین ایم کے وکیل جارج ہلر نے ایف بی آئی، سی آئی اے، ایف اے اے، ڈی ای اے، این ایس سی، این ایس اے کو ورگیدا کہ سب ایجنسیاں جو کچھ جانتی ہیں وہ حقائق سامنے لائیں لیکن بعدازاں اس نے دعویٰ کیا کہ حکومت نے قومی سلامتی کے نام پر حقائق منظر عام پر لانے سے روک دیا۔

نہ تو فرنٹ لائن کا پروگرام ... اپنے ... چوالی ایب اور نہ جوئیل بینرمین تکلیف دہ سوالوں کے جواب دینے میں تسلی بخش طور پر کامیاب ہوا۔ اگر کوریا کی سرگرمیوں کی پردہ پوشی مقصود تھی تو یہ سرگرمیاں سی آئی اے کی اعلیٰ سطح تک جاتی تھیں؟ کس نے اس کا اختیار دیا تھا؟ کیا اسی شخص یا اشخاص نے میکی کے سوٹ کیس سے ڈیٹا غائب کرنے کا حکم دیا تھا؟ جرمنی کی خفیہ ایجنسی بی کے اے نے کوریا یونٹ کو ہی اطلاع دینا ضروری کیوں سمجھا؟ کیا یہ صرف حادثاتی طور پر ہوا تھا؟ یا اس کا محرک وہ فیصلہ تھا جس میں کوریا کی سرگرمیوں کو سی آئی اے کے باقی افراد کے لئے ناقابل قبول اور خطرناک قرار دیا گیا تھا؟ پھر قومی سلامتی کی حدود و قیود کیا تھیں جن کے انکشاف سے پین ایم کے اٹارنی کو صاف جواب دے دیا گیا تھا۔

یہ معاملہ کئی سال تک مختلف خفیہ ایجنسیوں کے اندر مرا اٹھتا رہا اور زیر بحث آتا رہا لیکن نتائج ہمیشہ پردہ راز میں ہی رہے اور سچائی سامنے نہ آ سکی اور نہ راز کا بھید کھل سکا۔

موساد نے لندن سے اپنا ایک ایجنٹ پین ایم 103 کے سانحے کے چند گھنٹے کے اندر شمال میں لاکربی کیوں بھیج دیا تھا؟ اب تک اس خفیہ ادارے نے اپنی معلومات کو اپنے تک چھپائے رکھا ہے اور جہاز کی تباہی بارے کچھ نہیں بیان کیا۔ کچھ ایسے ذرائع موجود ہیں جو اپنی زندگیوں کے خوف سے اپنا آپ ظاہر کرنا نہیں چاہتے، کا کہنا ہے کہ موساد اپنی معلومات کو اس لئے چھپائے ہوئے ہے کہ اس وقت ٹرمپ کارڈ (Trump Card) کے طور پر استعمال کر سکے جب امریکہ اس پر دباؤ ڈالے کہ موساد امریکہ کے اندر اپنی سرگرمیوں کو بند کرے۔

ایک اور سانحہ بھی امریکہ کی انٹیلی جنس کمیونٹی کے لئے بڑی پریشانی اور دردسری کا باعث بن سکتا تھا۔ اس کا

تعلق امیرام نیر (Amiram Nir) کی موت سے تھا۔ یہ شخص ''جیمز بانڈ'' ٹائپ کی فلموں کا بڑا رسیا تھا اور جس نے ''ایران گیٹ'' میں اسرائیل کے ڈیوڈ کمشے کی جگہ ذرائع سنبھالے تھے۔

امیرام نیر بجا طور پر اسرائیلی وزیراعظم شیمن پیریز کا انسداد دہشت گردی کا مشیر تھا۔ یہ شخص انتہائی دغاباز، فریبی، ہوشیار، مکار، استحصال پسند، ظالم، بے رحم، حقیقت اور افسانے کو ملا کر اپنی ذہنی اختراع کے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ ثابت کرنے کا ماہر تھا۔ بنیادی طور پر یہ ایک صحافی تھا۔

جہاں تک اس کی خفیہ معلومات تک رسائی اور انٹیلی جنس مہارت کا تعلق تھا وہ بطور رپورٹر اسرائیلی ٹیلیوژن اور بعدازاں ملک کے سب سے بڑے اخبار ''یادیت ابارنات'' (Yediat Abronot) میں کام کرتا رہا تھا۔ جس کا مالک موسز (Moses) خاندان تھا اور اسی خاندان میں اس کی شادی ہوئی تھی۔ اپنی مطلب براری اور مفاد کے لئے قواعد وضوابط کی دھجیاں بکھیرنا اور قانون کی مٹی پلید کرنا اس کا معمول تھا۔ اس خاندان کا اشاعتی ادارہ اتنا بڑا تھا کہ رابرٹ میکسویل جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مالی طور پر انتہائی مضبوط اور روزنامے کی اشاعت کے لحاظ سے انتہائی بلند معیار کا حامل تھا۔ یہ اپنے ملازمین کو بہترین اجرت دیتا تھا۔ اس خاندان میں نیر (Nir) کی شادی نے نہ صرف اسرائیل کی ایک نہایت دولت مند خاتون کا خاوند بنادیا بلکہ حکومتی حلقوں میں اعلیٰ سطح تک اس کی رسائی کے راستے بھی وا کردیئے۔

لیکن سب سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز بات اس وقت سامنے آئی جب اسرائیلی وزیراعظم شیمن پیٹرز نے اسے اسرائیل کی انٹیلی جنس کمیونٹی کا نہایت اہم رکن بنادیا اور 1984ء میں اسے دہشت گردی کے خلاف اپنا مشیر بنالیا۔

نیر کی عمر اس وقت 34 سال تھی اور انٹیلی جنس کے شعبے میں اس کا تجربہ آئی ڈی ایف میں ایک مختصر کورس تک محدود تھا حتیٰ کہ اس کے دوستوں کے خیال میں بھی اسے نئی جاب کے لئے مزید تجربے کی ضرورت تھی۔

موساد کا سربراہ ناہوم ایڈمونی پہلا شخص تھا جس نے نیر کی نئے عہدہ پر تعیناتی بارے ردعمل کا اظہار کیا۔ اس نے انٹیلی جنس اداروں کے سربراہوں کی میٹنگوں میں نیر کی شمولیت کو روک دیا۔ مایوسی کے عالم میں نیر نے اپنے جاب کے پہلے ہفتے کے دوران وہ تمام چیزیں سیکھنے کی تیزی سے کوشش کی جن کی اس کے عہدے کے مطابق سمجھنے کی ضرورت تھی۔ ایران کو ہتھیاروں کی سپلائی کے آپریشن نے جلدی اس کی توجہ حاصل کرلی، جو اب تک جاری تھی۔ اس نے پیٹرز کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اسے اس آپریشن میں وہ کردار دے دیا جائے جو اس وقت تک ڈیوڈ کمشے ادا کرتا رہا تھا۔ اس کردار میں اس کے اپنے خیال میں وہ بہترین کارکردگی دکھا سکتا تھا۔ انتہائی انتھک، محنتی اور تجربہ کار اری بن مناشے کی نگرانی کے ساتھ ساتھ اسے اولیور نارتھ کے ساتھ بھی کام کرنا پڑا۔

جلد ہی دونوں آدمیوں میں گہری دوستی ہوگئی۔ دونوں ہی دنیا بھر میں سفر اور ہتھیاروں کی سودابازی کرتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے یرغمالیوں کے بدلے ہتھیار کے آپریشن کو انتہائی کامیاب بنانے کے لئے ایک انوکھا منصوبہ تیار کیا۔ وہ تہران آتے جاتے اور ایرانی رہنماؤں سے ملاقاتیں کرتے اور یرغمالیوں کی رہائی بارے مذاکرات کیا کرتے تھے۔

دونوں 25 مئی 1986ء کو اپنے آپ کو ایرلنگوس (Aer Lingus) کے تکنیکی ماہرین کے روپ میں ایک اسرائیلی جہاز میں، جسے آئرش قومی ائرلائن کا رنگ کیا گیا اور ائرلنگوس کا مخصوص نشان پینٹ کیا گیا تھا۔ تل ابیب سے اڑان بھر کے تہران پہنچے۔ نیر اور نارتھ کے ساتھ

جہاز میں 97 ٹی او ڈبلیو (TOW) گائیڈڈ میزائل لدے ہوئے تھے اور ہاکس میزائلوں کے سپیئر پارٹس کا ایک بکس بھی تھا۔ نیر امریکہ کے جعلی پاسپورٹ پر سفر کر رہا تھا اور یہ اسے نارتھ نے مہیا کیا تھا۔

نارتھ جو عیسائیوں کے فرقے ایونجلو سے تعلق رکھتا تھا، نے صدر ریگن کو قائل کر لیا تھا کہ بائبل کا ایک نسخہ اپنے دستخطوں کے ساتھ روانہ کرے تا کہ ایرانی مسلمان رہنما آیت اللہ رفسنجانی کو بطور خیر سگالی پیش کیا جا سکے۔ وہ اپنے ساتھ چاکلیٹ کیک اور کولٹ (Colt) پستولوں کا ایک سیٹ بھی اپنے میزبانوں کے لئے لے کر آئے تھے۔ یہ اس دور کی یاد دلانے کے لئے تھا جب نیویارک کے مین ہٹن کے علاقے میں گورے ریڈ انڈین سے اشیاء کے بدلے میں ان کی زمین ہتھیا لیا کرتے تھے۔

موساد کو اس مشن کے بارے میں پہلی خبر اس وقت ملی جب جہاز ایرانی فضائی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ موساد کے سربراہ ناہوم ایڈمونی کے ردعمل کے بارے میں کہا گیا تھا۔ "وہ غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا"۔

ایرانیوں نے جہاز کو زمین پر اتار کر صرف سواروں کو باہر نکال لیا اور اس مشن کو امریکہ کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے خوب استعمال کیا۔ صدر ریگن غصے سے پھنکار رہا تھا۔ تل ابیب میں ایڈمونی نیر پر لعن طعن کر رہا تھا اور اسے کاؤبوائے کے لقب سے یاد کر رہا تھا۔ تاہم اس واقعے کے دس ماہ بعد تک حکومت کی نوکری کرتا رہا حتیٰ کہ انٹیلی جنس کمیونٹی کے اندر اس کے خلاف مہم چل پڑی۔ انہی دنوں اس کے ڈسک کے اوپر سے ہنداوی، وانونو اور سوان کے کیس اس کی نظروں سے گزرے۔ اس نے ان کیسوں کے بارے میں جو بھی ریمارکس پاس کئے، سب موساد کی طرف سے رد کر دیئے گئے۔

اب نہ تو واشنگٹن میں کوئی اسے خوش آمدید کہنے کو تیار تھا اور نہ ہی تل ابیب میں کوئی منہ لگا رہا تھا اور تنہائی کا شکار ہو رہا تھا، لہٰذا امیرام نیر نے وزیراعظم کے مشیر کے عہدہ سے مارچ 1987ء میں استعفیٰ دے دیا۔ اب اس کی شادی بھی مشکلات کا شکار تھی اور اس کے دوست بھی اس سے منہ موڑ گئے تھے۔ صرف اری بن مناشے، ماضی کے تعلقات کی وجہ سے اس سے قدرے رابطے میں رہتا تھا۔ 1988ء کے شروع میں نیر اسرائیل کو خیر باد کہہ کر مستقل رہائش کے لئے لندن چلا گیا۔

لندن میں اس نے ایک خوبصورت سیاہ بالوں والی پچیس سالہ دوشیزہ ایڈوریانہ سٹانٹن کے ساتھ رہنا شروع کر دیا جس کا دعویٰ تھا کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں سیکرٹری کا کام کرتی تھی اور جس سے نیر کی ملاقات اپنے سفروں کے دوران ہوئی تھی۔ بہت سے موساد کے افسروں کا خیال تھا کہ اس کا تعلق سی آئی اے سے تھا، ایک ایسی عورت جسے ایجنسی اپنے شکار کو پھانسنے کے لئے استعمال کرتی تھی۔ لندن میں نیر نے میکسیکو کی کمپنی کا یورپ میں پرچیز نگ نمائندہ ظاہر کیا۔ کمپنی کا نام نوکال ڈی میکسیکو اور جس کا ہیڈ آفس یورآپان (Ijruapan) شہر میں تھا۔ کمپنی ایکسپورٹ مارکیٹ کے ایک تہائی حصے کو کنٹرول کرتی تھی۔

یہ کوئی امپورٹ ایکسپورٹ سے متعلقہ معاملہ نہ تھا جو اری بن مناشے کو نومبر 1988ء کی رات کو نیر کے دروازے پر لے آیا، حالانکہ اس وقت بارش ہو رہی تھی اور موسم بھی ناموافق تھا۔ وہ دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ آئندہ دنوں میں اولیور نارتھ کے خلاف ایرانی کونٹرا سکینڈل میں اس کے کردار کے بارے میں جو مقدمہ شروع ہونے والا تھا، اس میں اپنی گواہی میں نیر حقیقتاً کن کن چیزوں کا انکشاف کرنے والا تھا۔ نیر نے صاف صاف بتا دیا کہ اس کا بیان حلفی نہ صرف امریکن صدر ریگن کی انتظامیہ کے لئے بہت زیادہ پریشان کن، بلکہ اسرائیلی حکومت کے لئے بھی سراسیمگی اور شرمندگی کا باعث ہوگا۔ وہ یہ ثابت کرے گا کہ بعض اوقات حکومتوں

نے لئے اپنے غیر قانونی اور ناجائز اقدامات کے لئے قانونی ضابطے، جانچ پڑتال کا نظام اور معمول کے قواعد و ضوابط کس دیدہ دلیری سے پامال کئے جاتے رہے تھے۔ ان غیر قانونی آپریشنز میں کئی دوسرے ملکوں مثلاً جنوبی افریقہ اور چلی جیسے دور افتادہ ممالک کو بھی استعمال کیا گیا تھا۔ اس نے مزید کہا کہ ایک کتاب لکھنے کی منصوبہ بندی کر رہا ہے اور اسے یقین ہے یہ کتاب اسے اسرائیلی تاریخ کا سب سے بڑا انکشاف کنندہ بنا۔۔۔ گی۔ بن مناشے نے یہ انتظام کیا کہ نیر کے ساتھ، اس کی اپنی کمپنی نوکال، میکسیکو کے دورے سے واپسی پر دوبارہ ملاقات ہونی چاہئے۔ اس دوران اس کے مہمان نے نیر کو انتباہ کیا کہ وہ اس عورت سے ہوشیار رہے"۔ جبکہ ایڈریانا انہیں بات چیت کرتے ہوئے تنہا چھوڑ کر کمرے سے باہر چلی گئی تھی بن مناشے نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ اس انتباہ کی وجہ کیا تھی؟ اس نے صرف اتنا اشارہ کیا اس کی پُراسرار سرگرمیاں میں اسے پہلے سے جانتا ہوں، حالانکہ نیر نہیں جانتا تھا کہ ایڈریانا سٹافن اس کا اصلی نام نہیں تھا"۔

27 نومبر 1988ء کو نیر اور سٹافن نے جعلی ناموں سے میڈرڈ (سپین) کا اکٹھے سفر کیا۔ وہ اپنے آپ کو پیٹرک ویبر کہلاتا تھا۔ یہ وہ نام تھا جو اس نے اپنے آخری تہران کے ناکام سفر میں اختیار کیا تھا۔ آئی بیریا ائر لائن (Iberia Air) کے مسافروں کی فہرست میں سٹافن کا نام ایستھر (Easther Arriya) آریا تھا۔ انہوں نے جعلی ناموں سے سفر کیوں کیا جب کہ ان کے پاس اپنے اصلی پاسپورٹ، اسرائیلی اور کینیڈین موجود تھے۔ اس بات کی بھی وضاحت نہیں کی گئی۔ ان کے سفر کی دوسری پُراسراریت یہ تھی میکسیکو جانے کے لئے پہلے میڈرڈ جانا ضروری کیوں سمجھا جبکہ لندن سے میکسیکو سٹی کے لئے براہ راست کئی فلائٹس موجود تھیں۔ کیا نیر اپنی محبوبہ کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ کتنی آسانی سے بہت سے

فرمانِ قائداعظمؒ

پشاور کے ہوائی اڈے پر 15 پنجاب رجمنٹ کی مشین گن بٹالین کو پرچم Colour عطا کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: "جن اوصاف سے کوئی رجمنٹ ایک اچھی رجمنٹ بنتی ہے ان کا معیار بہت بلند ہے۔ وہ اوصاف ہیں، ڈسپلن، وفاداری، فرض کی لگن اور جسمانی مشقت۔ یہ تمام اوصاف صرف اس ایک وصف --- رجمنٹ سے وفاداری --- میں سمٹ آتے ہیں۔ الفاظ کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو اعمال کو ہے۔ آپ کی رجمنٹ نے جنگ عظیم میں جو معرکے لڑے ہیں میں ان سے بے خبر نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ملک کے دفاع اور قوم کی سلامتی کے لئے میدان میں اتریں گے تو اپنی روایات کو برقرار رکھیں گے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اپنی رجمنٹ کے پرچم اور اپنے وطن کے جھنڈے کو بلند اور ایک عظیم قوم کی طرح اس کی آبرو کو محفوظ رکھیں گے۔"

لوگوں کو ہر وقت بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔ یا اس کے دماغ کے کسی گوشے میں اری بن مناشے سے ملنے کے بعد، خوف کی کوئی کیفیت موجود تھی۔ بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح، ان بھی کوئی جواب نہ مل سکا۔

وہ 28 نومبر 1988ء کو میکسیکو سٹی پہنچے۔ ائرپورٹ پر ان کے انتظار میں ایک ایسا شخص موجود تھا جس کی شناخت کبھی سامنے نہیں آ سکی۔ تینوں کمپنی کے ہیڈکوارٹر یوروآپان شہر کی طرف ہو کر بعد دوپہر وہاں پہنچے۔ نیر نے وہاں کی مقامی کمپنی ایروٹیکسیز ڈی یوروآپان سے چھوٹا سیسنا جہاز T-210 چارٹر کیا۔

اب پھر نیر نے عجیب و غریب رویے کا مظاہرہ کیا۔ اس نے جہاز پٹرک ویبر کے نام پر کرائے پر حاصل

کیا اور اسی نام کے کریڈٹ کارڈ سے کرائے کی ادائیگی کی۔ اس نے جہاز کے پائلٹ کو حکم دیا کہ دو روز تک انہیں کمپنی نوکال کے پروسسنگ پلانٹ اور گردونواح کی سیر کرائے۔ جس ہوٹل میں انہوں مشترکہ رہائش کے لئے کمرہ لیا، وہاں نیر نے اپنا اصلی نام درج کرایا۔

وہ شخص جو میکسیکو سٹی سے ان کا ہم سفر بنا تھا، وہ جس پُراسرار طریقے سے ائرپورٹ پر سامنے آیا تھا، یہاں پہنچتے ہی اسی طریقے سے غائب ہوگیا۔

30 نومبر کو نیر اور سائمن یوروآپان کے چھوٹے سے ائرپورٹ پر آئے تو اب ان کے ہمراہ ایک دوسرا شخص تھا۔ مسافروں کی فہرست میں اس کا نام پیڈرو ایسپونوزا (Pedro Espionoza) ہٹاڈو (Huntado) درج تھا۔ وہ کس کے لئے کام کرتا تھا؟ یہ راز بھی رازی ہی رہا۔ یہ بھی ایک معمہ ہی تھا کہ مسافروں کی فہرست میں انہوں نے اپنے اصلی نام درج کرائے، حالانکہ جہاز کسی اور نام سے چارٹر کیا گیا تھا لیکن پائلٹ نے اس تضاد کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔

جہاز نے بہترین موسم میں اڑان بھری۔ جہاز میں پائلٹ، معاون پائلٹ کے ساتھ ان کے تین مسافر سوار تھے۔ ایک سو میل کے سفر کے بعد سیسنا کے انجن میں خرابی پیدا ہوگئی اور لمحوں میں کریش ہوگیا جس میں نیر اور پائلٹ ہلاک ہوگئے۔ سائمن بری طرح زخمی ہوئی تھی لیکن معاون پائلٹ اور پیڈرو بھی زخمی لیکن قدرے بہتر حالت میں تھے۔ جب امداد کے لئے پہلا شخص حادثے کی جگہ پر پہنچا جس کا نام پیڈرو کروحیت تھا، تو ہٹاڈو وہاں سے غائب ہو چکا تھا، جو پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ کروحیت سب سے پہلے کس طرح حادثے کی جگہ پر پہنچا۔ یہ بھی ایک راز ہی رہا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ نوکال کا ملازم تھا لیکن نوکال پلانٹ تو وہاں سے بہت دوری پر واقع تھا۔ وہ اس بات کی کوئی وضاحت نہ کرسکا کہ وہ کریش کی جگہ کے قریب کیا کررہا تھا؟ جب پولیس نے اس سے کہا کہ وہ شناختی کارڈ پیش کرے تو اس نے کہا کہ بل فائٹ کے دوران اپنا شناختی کارڈ گم کرچکا تھا۔ بعدازاں ثابت ہوا کہ کروحیت اصل میں ارجنٹائن کا باشندہ تھا جو غیرقانونی طور پر میکسیکو میں رہ رہا تھا۔ جب تک اس کے خلاف ثبوت سامنے آتا، وہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ حادثے کی جگہ پر کروحیت نے نیر کی لاش دریافت کی تھی اور سائمن کے ساتھ ہسپتال بھی گیا تھا۔ وہ وہیں تھا جب ایک مقامی اخبار کے رپورٹر نے مزید معلومات کے لئے اس سے رابطہ قائم کیا تھا۔

جوئل بینرمین جو اسرائیل کا پولیٹیکل انٹیلی جنس ڈائجسٹ شائع کرتا تھا کا دعویٰ تھا۔ ''ایک نوجوان عورت نے بتایا تھا کہ جب وہ اسے گھر سے بلانے گئی تو وہ وہاں موجود تھا لیکن ایک دوسری عورت نے دروازے پر آکر صحافی سے کہا کہ وہ وہاں نہیں رہتا اور اس نے کبھی اس کا نام ہی نہیں سنا۔ ایک دوسری عورت نے دہرایا کہ جہاز سیسنا پر سائمن کی موجودگی محض حسن اتفاق تھا، ورنہ اس کا اسرائیل سے کوئی تعلق واسطہ نہ تھا۔ اس عورت نے اپنی شناخت اس سے زیادہ کرانے سے انکار کردیا کہ وہ ارجنٹائنا سے میکسیکو کی سیاحت کے لئے آئی ہوئی تھی''۔

سائمن نے اس پُراسراریت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اس نے حادثے کی انکوائری کرنے والوں کو بتایا، جیسا کہ اسرائیلی صحافی ران ایڈیلسٹ نے 1997ء میں لکھا۔ ''زخمی ہونے کے باوجود اس کی آواز معمول کے مطابق تھی۔ اس نے ایبرام نیر کو چند میٹر دور ہاتھ ہلاتے اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''ہر چیز ٹھیک ہو جائے گی امداد پہنچنے ہی والی ہے''۔ بعد کے دنوں میں اسے دو دفعہ یقین دلایا گیا کہ نیر زندہ تھا''۔

تدفین کے لئے نیر کی میت واپس اسرائیل لائی گئی۔ ایک ہزار سے زائد افراد نے اس کے جنازے میں

موقع پر ان کے لئے پریشانی اور پشیمانی کی کوئی بات سامنے نہیں آسکتی تھی''۔

اس تھیوری کو امریکن نیوی کے اس کمانڈر نے بھی تقویت پہنچائی جو نیر کے ساتھ یرغمالیوں کی رہائی کے لئے تہران گیا تھا۔ اس کی کہانی اس کے اس دعوے کے گرد گھومتی تھی کہ نیر نے جارج بش سے، جو اس وقت وائس پریذیڈنٹ تھے، سے 20 جولائی 1986ء کو یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل میں ملاقات کی تھی اور انہیں امریکن اسلحے کی اسرائیل کے ذریعے ایران کو فروخت بارے تفصیلات سے آگاہ کیا تھا۔ صحافی جوئل بینر مین کے مطابق ''نیر خفیہ طور پر تمام بات چیت کو ٹیپ کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ بش کے ''اسلحہ برائے رہائی یرغمالی'' میں ملوث ہونے کا پکا ثبوت آ گیا۔ اس میٹنگ میں میکی بھی شامل تھا اور گیٹس بھی، جو بعدازاں لاکربی کے پین ایم جہاز کی تباہی میں ہلاک ہو گیا تھا''۔

بینر مین کی تحریر کے مطابق اس کمانڈر نے اولیور نارتھ کا ٹرائل شروع ہونے سے چند ماہ قبل سی آئی اے ہیڈ کوارٹرز واقع لینگلے کا وزٹ کیا تھا اور نارتھ سے ملاقات کی تھی۔ صحافی کے الفاظ میں کمانڈر نے نارتھ سے سوال کیا تھا کہ نیر کو کیا ہوا تھا؟ نارتھ نے کمانڈر کو بتایا کہ اسے قتل کر دیا گیا تھا کیونکہ اس نے یروشلم میٹنگ کی ٹیپ کو منظرِ عام پر لانے کی دھمکی دی تھی''۔

جن صحافیوں نے نارتھ سے سوال کرنے کی کوشش کی تھی، انہیں دھتکار دیا گیا تھا۔ بش کے مددگاروں نے کئی سال سے یہی رویہ اختیار کر رکھا تھا کہ امریکہ کے سابق صدر نے ایران گیٹ کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا، پہلے ہی بیان کیا جا چکا تھا''۔

جولائی 1991ء کے آخر میں نیر کی بیوہ جودی کے گھر میں نقب زنی کی واردات ہوئی۔ گھر سے جو کچھ چرایا گیا وہ صرف نیر کی ٹیپس اور دوسری دستاویزات و کاغذات تھے۔ پولیس نے بیان دیا۔ ''نقب زنی کا کام انتہائی ماہر ہاتھوں کا لگتا تھا۔ جودی نیر نے کہا۔'' چوری شدہ کاغذات و دستاویزات سے لگتا تھا کہ ان سے کسی کی ذات کو خطرہ تھا''۔ اس نے اس سے آگے کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ مال مسروقہ بھی برآمد نہ ہو سکا۔ یہ سوال کہ چوری کس نے کی؟ اس کا بھی جواب نہ مل سکا۔

اگلے چار سال تک شبتائی شاوت موساد کی سربراہی کرتا رہا۔ اس کی کوشش رہی کہ ادارے کو اخبارات کی شہ سرخیوں سے دور کہانیاں گھڑنے والوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھ کر اپنا جاسوسی کا کام کرتا رہے۔

پبلک کی نظروں سے پوشیدہ رہ کر کام کرنے سے انٹیلی جنس کمیونٹی کے اندر طاقت حاصل کرنے کی کشمکش کم ہوئی بلکہ کام کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ اگرچہ سیاستدان اب بھی انٹیلی جنس اور سائٹ سب کمیٹیوں میں بیٹھتے تھے لیکن انہیں خوب یاد تھا کہ شاوت نے گلف وار کے بعد ان کے منہ کس طرح بند کیے تھے۔ اس کی کارکردگی کی یادیں تازہ تھیں، اسرائیل کے اندر اور باہر بھی اور اس کے خلاف کانا پھوسی کی مہم بھی جاری تھی کہ وہ تنگ نظر خود پسند اور مغرور ہے۔ سی آئی اے سے خفیہ رابطوں کا سلسلہ تقریباً بند ہو چکا تھا۔ اس کا حوصلہ بھی ٹوٹ رہا تھا۔

اس کے اردگرد کیا ہو رہا تھا، شبتائی شاوت کو کچھ ہوش نہ تھا۔ اچانک موسم بہار 1996ء کی خوشگوار صبح کو وزیراعظم نیتن یاہو نے اسے اپنے دفتر میں طلب کیا اور اسے بتایا گیا کہ اسے تبدیل کیا جا رہا تھا۔ شاوت نے بحث کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ وہ نیتن یاہو کے مزاج کو سمجھتا تھا کہ بحث کرنا فضول تھا۔ اس نے صرف ایک سوال پوچھا۔ ''میری جگہ کس کو لایا جا رہا ہے؟''

نیتن یاہو کا جواب تھا۔ ''ڈینی یاطوم''۔

اسی دن سے موساد کی ناکامیوں کا آغاز ہو گیا۔

***